زاد المعاد

المعروف بہ

سیرتِ خیر العباد

حصّہ دوم

از

علّامہ ابن قیّم جوزیہ

ترجمہ و حواشی

مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

جسے وسعتیں بھی نہ پا سکیں
وہ نبیؐ کا پاک مقام ہے

نام کتاب — زاد المعاد
ترجمہ وحواشی — مفتی عزیز الرحمن صاحب
صفحات — ۴۰۰
قیمت غیر مجلد — سترہ روپے

ملنے کا پتہ — مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
ملنے کا دوسرا پتہ — مدنی دار التالیف بجنور

رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۶ء

مطبوعہ
(جمال پرنٹنگ پریس دالجمعۃ پریس، دہلی)

فہرست مضامین زاد المعاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اپنی بات"

حامداً ومصلیاً۔ امّا بعد۔

زادالمعاد کا ترجمہ اور حواشی، سیرت خیر العباد کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دو سال کے بعد ۱۹۶۷ء میں اس کی دوسری قسط شائع ہوئی تھی۔ اہل علم اور ہندوستان کے مسلمانوں نے، جس نے بھی اُس کو پڑھا بہت پسند کیا اور بہت مفید پایا۔ اس کے بارے میں سینکڑوں خطوط مجھے موصول ہوئے اور برابر تکمیل کا تقاضہ ہوتا رہا۔ لیکن میں اس عظیم کتاب کے ترجمہ سے نہیں بلکہ طباعت سے عاجز رہا کیونکہ اتنی بڑی کتاب کی طباعت میرے قابو سے باہر تھی۔ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کر پایا وہ میرا صرف ذوق اور جذبہ ہی تھا، ورنہ ہندوستانی مصنفین کی ملک میں جو پوزیشن ہے، میں اُن سے الگ نہیں ہوں۔

میں اس کتاب کے حصہ اول میں عرض کر چکا ہوں کہ "زاد المعاد" کا ترجمہ پاکستان میں رئیس احمد جعفری نے کیا تھا، اور وہ وہیں شائع ہوا تھا، میں اب اس پر کوئی تنقید کرنا نہیں چاہتا لیکن رسل و رسائل کی رکاوٹوں کی وجہ سے ہندوستان میں اس سے کسی طرح استفادہ ممکن نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا اجر

عظیم عطا فرمائے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہ کو جو ہندوستان میں علم اور اہل علم کے قدردان ہیں اور ہندوستان میں اعلیٰ اسلامی لیٹریچر کو بہترین معیار پر مسلمانوں اور اہل علم کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ تاریخ ان کی اس زریں اور دیرپا خدمت کو ہرگز فراموش نہ کرسکے گی۔ ممدوح نے اپنے اسی ذوق سلیم کی بنا پر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ میں ' زاد المعاد ' کے ترجمہ کی تکمیل کردوں، میں نے اس کو تائید غیبی تصوّر کیا اور ان کے حکم کو بسر و چشم قبول کرلیا۔ اللہ تعالیٰ ممدوح کو دونوں جہان میں کامیابی اور فلاح نصیب فرمائے۔

چارسو (۴۰۰) صفحات پر مشتمل یہ دوسرا حصّہ ہے جو ۲۹ ویں باب قرأت قرآن پاک سے شروع ہوکر ۳۶ ویں باب سلام اور استیذان پر ختم ہورہا ہے۔ گویا اس حصّہ میں آٹھ ابواب آگئے ہیں جیسا کہ فہرست سے ظاہر ہے۔ ترجمہ اور حواشی ضرورت کے مطابق ہر جگہ موجود ہیں۔ اور متعدد جگہ قوسین میں تصریح اور اشارے بھی کئے ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ اہل نظر اس سے اتفاق فرمائیں گے۔ تاہم کوتاہیوں اور خامیوں کا اعتراف کرتا ہوں، اس سے صرف کلام الٰہی ہی پاک ہے، تیسرا حصّہ ۳۸ واں باب غزوات اور جہاد سے شروع ہے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے تکمیل فرمائے۔ آمین

والسّلام

عزیز الرحمٰن غفرلہ

مدنی دارالافتاء

مدرسہ عربیہ مدینۃ العلوم بجنور (یوپی)

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ

انتیسواں (۲۹) باب

قرأت قرآن پاک

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ قرآن پاک پڑھا کرتے تھے جس میں تخلف نہیں ہوتا تھا۔ آپ ترتیل کے ساتھ قرآن پاک پڑھا کرتے تھے، جلدی جلدی نہیں۔ حرف حرف صاف ظاہر ہوتا تھا۔ آیۃ آیۃ علیحدہ معلوم ہوتی تھی، حروف مدّ میں آواز کو کھینچتے۔ جیسے رحمٰن، رحیم۔ ابتدا قرأت میں استعاذہ فرماتے اور اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھتے، اور بعض دفعہ "اللّٰھم انّی اعوذ بک من الشیطان الرجیم من ھمزہ ونفخہ ونفثہ"[1] بھی پڑھتے۔

آپ ہمیشہ قبل قرأت تعوذ (اعوذ باللہ پڑھنا) فرماتے۔ اور آپ کو دوسرے سے قرآن پاک سننا زیادہ پسند تھا۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابن مسعودؓ کو قرآن پاک پڑھنے کا حکم فرمایا جب انھوں نے پڑھنا شروع کر دیا تو آپ کی چشم ہائے مبارک سے آنسو جاری ہو گئے۔

آپ قرآن پاک بیٹھ کر، کھڑے ہو کر، لیٹ کر، وضو سے، بلا وضو، غرضکہ جنابت کی حالت کے علاوہ ہر طرح پڑھتے تھے۔ آپ قرآن پاک کو لہجہ کے ساتھ بھی پڑھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فتح مکہ کے دن انا فتحنا کو لہجہ کے ساتھ پڑھا تھا۔

---

[1] یہ روایت نوافل کے متعلق ہے مشہور اور صحیح ترین روایت وہی ہے جو آجکل معمول ہے

قراءت قرآن اور لہجہ

حضرت عبداللہ بن مغفل نے آپؐ کی قراءت کے لہجہ کو تین مرتبہ ذکر کیا ہے، اس کو بخاری نے روایت کیا ہے[1] اور میں نے ان احادیث کو جمع کیا ہے۔

(۱) زینوا القرآن باصواتکم — قرآن پاک کو اپنی آواز سے زینت دو

(۲) لیس منا من لم یتغن بالقرآن — جس نے قرآن کو لہجہ سے نہیں پڑھا وہ ہم میں سے نہیں ہے

(۳) ما اذن اللہ لشیٔ کا ذنہ لنبی حسن الصوت یتغنی بالقرآن — اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اچھی آواز سے قرآن پاک کے پڑھنے کا حکم جیسا دیا ہے اور کسی چیز کے لئے نہیں دیا۔

ان احادیث سے ہم اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ لہجہ اختیاری ہوتا تھا نہ کہ اضطراری۔ اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابن مغفل اس کی حکایت نہ کرتے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

کان یرجع فی قراءتہ — آپ قراءت میں ترجیع فرمایا کرتے تھے۔

یہاں ترجیع کو آپ کا فعل قرار دیا ہے۔ اگر یہ ترجیع محض سواری کے ہانکنے اور چلانے کی غرض سے تھی تو اس کو ترجیع نہ کہا جاتا۔ ایک رات آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا قرآن سُنا اور صبح کو ان سے ذکر کیا تو حضرت ابو موسیٰ اشعری نے عرض کیا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ آپؐ سُن رہے ہیں تو میں خوب آواز کو سنوار کر پڑھتا۔ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں بروایت عبدالجبار بن الورد ذکر کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے ابو ملیکہ سے سنا ہے، انھوں نے فرمایا کہ عبداللہ بن ابی یزید نے بیان کیا کہ ایک دن ابو لبابہ کے پاس سے گذرنا ہوا جب انھوں نے گھر میں داخل ہونا چاہا تو ایک آدمی نہایت بوسیدہ حالت میں آیا، میں نے اُن سے سُنا اور انھوں نے فرمایا کہ:۔

---

[1] مراد لہجہ سے پڑھنا ہے لہجہ میں چونکہ آواز کو گھمایا جاتا ہے اس وجہ سے اسکو ترجیع کہتے ہیں۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیس منا من لم یتغن بالقرآن — میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے کہ جو قرآن کو اچھی آواز سے نہ پڑھے۔

میں نے ابوملیکہ سے دریافت کیا، اے ابو محمد آپ یہ تو فرمایئے! اگر کسی کی آواز ہی اچھی نہ ہو تو کیا کرے۔ فرمایا، جہاں تک ممکن ہو آواز کو سنوار کر پڑھے۔ میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنی مناسب ہے۔ اور مسئلہ کے مالہ وما علیہ اور لوگوں کے اقوال کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

قرآن پاک پڑھنے میں مذاہب

ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ قرآن پاک گا کر پڑھنا مکروہ ہے۔ یہی مسلک امام احمد اور امام مالکؒ کا ہے، چنانچہ امام احمد نے بروایت علی بن سعید ذکر کیا ہے کہ "یہ بدعت ہے" اور مروزی کی روایت میں اتنا اضافہ اور ہے۔

بدعۃ لا تسمع — یہ بدعت ہے ایسی قراۃ نہ سُنی جائے۔

عبدالرحمن بن المطیب کی روایت میں بھی یہی ہے۔ اور عبداللہ بن عبدالرحمن بن المطیب اور یوسف بن موسیٰ اور یعقوب بن جبان اور اثرم، ابراہیم ابن الحارث وغیرہ کی روایت میں لا یعجبنی" یعنی غیر پسندیدہ" کے الفاظ ہیں۔ یعنی یہ قراۃ پسندیدہ نہیں ہے۔ روایت صالح میں موجود ہے۔

زینوا القرآن باصواتکم — قرآن کو اپنی آواز سے زینت دو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کو اچھا کر کے پڑھو، اور روایت مروزی میں ہے

ما اذن اللہ لشی کاذنہ لنبی حسن الصوت ان یتغنی بالقرآن — اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قرآن پاک اچھی آواز سے اچھی طرح پڑھنے کیلئے جیسا حکم دیا ہے ایسا دوسرا امر نہیں فرمایا۔[1]

---

[1] وجہ غالباً اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن پاک، کلام الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم صفت ہے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۲ پر)

امام شافعی صاحبؒ فرماتے ہیں، بلند آواز سے پڑھنا چاہئے۔ جب ان کے سامنے حدیث معاویہ بن قرۃ کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ امام مالکؒ سے ابن قاسم نے دریافت کیا کہ نماز میں گا کر پڑھنا کیسا ہے؟ فرمایا غیر پسندیدہ ہے۔ اور فرمایا

انما هو غناء يتغنون به ليأخذوا عليه الدراهم یہ گانا ہے۔ لوگ دراہم لینے کے لئے گاتے ہیں۔

جن جن حضرات سے گا کر پڑھنے کی کراہت نقل کی گئی ہے ان میں انس بن مالک، سعید بن مسیّب، سعید بن جبیر، قاسم بن محمد، امام حسن، ابن سیرین، ابراہیم نخعی ہیں۔ عبداللہ بن یزید عکبری کہتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو امام احمدؒ سے سوال کرتے ہوئے سنا۔ اس نے گا کر قرآن پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا، فرمایا "تیرا نام کیا ہے۔ اُس نے کہا محمد۔ فرمایا کیا تجھے یہ پسند ہے کہ تجھے " یا موحمد (آواز کھینچ کر) کہہ کر پکارا جائے۔ قاضی ابو یعلی نے اس کو مبالغہ قرار دیا ہے۔

حسن بن عبدالعزیز الحرولی نے کہا ہے کہ ایک شخص نے مجھے وصیت کی۔ اس کے ترکہ میں زیادہ سے زیادہ ایک باندی تھی جو گا کر قرآن پاک پڑھتی تھی۔ میں نے اس کے متعلق احمد بن حنبل اور حارث بن مسکین اور ابا عبید سے دریافت کیا

(صفحہ ۱۱ کا باقی حاشیہ) اس کو اچھی طرح پڑھنے کی حالت میں بندہ اس سے متصف ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس صفت کے اثرات قاری اور سامع دونوں کے قلوب پر پڑتے ہیں اور ایمان کی تخم ریزی ہوتی ہے اور اس کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے مومنین کے صفات میں سے یہ بھی بیان فرمایا ہے اذا تليت عليهم آياته زادتهم ايمانا، جب ان پر قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے۔ عزیز الرحمٰن۔

کہ میں اُس کو کس طرح فروخت کروں؟ ان سب نے فرمایا اس کی سادہ بیع[1] کردو۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ اس کے بیچنے میں نقصان ہے تو انھوں نے پھر وہی فرمایا جو فرما چکے تھے۔ قاضی صاحب نے فرمایا یہ حکم ان تینوں حضرات نے اس وجہ سے دیا کہ اس باندی سے قرآن پاک سننا مکروہ تھا۔ لہذا اس پر اجرت لینا بھی جائز نہیں تھا جیسا کہ گانے پر اجرت لینا جائز نہیں ہے[2]

قرآن پاک ترنم سے پڑھنا

ابن بطال نے فرمایا ہے کہ ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ تغنی بالقرآن سے مراد آواز کو اچھا کرکے اور اس کو لوٹا کر پڑھنا ہے اور گانا ایسا ہوتا نہیں ہے بلکہ اس میں صرف آواز کا گھماؤ اور گلے بازی ہوتی ہے (حروف کے کم و زیادہ ہونے کا اس میں لحاظ نہیں ہوتا اور قرآن پاک میں اس کا بھی لحاظ ہوتا ہے) اور یہی قول ابن مبارک اور نضر بن شمیل کا ہے

طبری نے بیان کیا ہے کہ قرآن پاک کے پڑھنے میں تحسین صوت کو اچھا سمجھا گیا ہے چنانچہ حضرت عمر رض نے ایک دن حضرت ابو موسیٰ رض سے فرمایا۔ ہمیں قرآن پاک سنایئے تو انھوں نے خوب اچھی آواز کرکے قرآن پاک سنایا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا

من استطاع ان یتغنی	جو بھی حضرت ابی موسیٰ رض کی طرح خوب
بالقرآن غناء ابی موسیٰ	اچھی آواز کرکے قرآن پڑھ سکتا ہو اس کو
فلیفعل	ضرور ایسا ہی پڑھنا چاہئے۔

حضرت عقبہ بن عامر کی آواز بہت ہی اچھی تھی۔ حضرت عمر رض نے ان سے فرمایا، مجھے فلاں سورت پڑھ کر سناؤ۔ جب انھوں نے سنائی تو فرمایا:۔

---

[1] بیع مطلق سے مراد ہے۔ مقصود اس سے بیع موقت یا بیع منافع یعنی اجارہ کی نفی ہے

[2] فقہاء نے گانے پر اجرت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ درمختار ص۳۲ ج ۴

ما کنت اظن انہا نزلت مجھے خیال ہی نہ تھا کہ یہ نازل ہوئی ہے۔

ابن بطال نے کہا کہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ نے غنا بالقرآن کو جائز قرار دیا ہے عطا بن رباح نے فرمایا، حضرت عبدالرحمن بن اسود اور ابی یزید۔ رمضان المبارک میں قرآن پاک سننے کے لئے مساجد میں اچھی آواز کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ یعنی اس تلاش میں رہتے کہ کس مسجد میں کون صاحب سنا رہے ہیں تاکہ اچھی آواز والے کے پیچھے قرآن پاک سنیں۔

امام طحاوی نے امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ اچھی آواز والے سے قرآن پاک سنا کرتے تھے۔ محمد عبدالحکم نے کہا کہ میں نے اپنے والد اور امام شافعیؒ اور یوسف بن عمر کو دیکھا ہے کہ وہ بھی اچھی آواز والے سے قرآن پاک سنا کرتے تھے یہی ابن جریر طبری کا مسلک ہے۔

جائز قرار دینے والوں نے کہا ہے کہ ابن جریر کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ حدیث کے معنی تحسین صوت کے ہیں اور غنا معقول یہ ہے کہ قاری سننے والے کو غمزدہ کرنے کے لئے قرأت کرے جیسا کہ شعر میں ہوتا ہے۔ سفیان نے زہری سے اور انھوں نے ابوسلمہ سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ما اذن اللہ لشیئٍ ما اذن لنبی حسن الترنم بالقرآن اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کے لئے اپنے نبی کو ایسا امر نہیں فرمایا جیسا قرآن کو ترنم سے پڑھنے کے لئے فرمایا۔

غنا معقول (صراحتہً گانا) ذوی الحجی کے نزدیک یہ ہے کہ اچھی آواز سے طرب حاصل ہو مذکورہ حدیث میں بالقرآن کے ساتھ "یجہر بہ" (یعنی جہر کے ساتھ) کا اضافہ اور ہے۔ طبری نے کہا ہے یہ حدیث بہت واضح ہے۔ اگر وہ بات ہوئی ہوتی جو ابن عیینہ نے کہی ہے تو حدیث میں حسن الصوت اور و الجہر بہ کے الفاظ نہ ہوتے۔ کلام عرب میں غنا یہ ہے کہ اچھی آواز کے ساتھ گھما کر پڑھا جائے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:۔

تغنی بالشعران ماکنت قائلہ　　　ان الغنا لھذا الشعر مضمار

ابن عینیہ کی غلطی

بعض لوگوں کا یہ دعوی کہ تغنیت بمعنی استغنیت ہے تو کلام میں فاش غلطی ہے، میں کسی آدمی کو نہیں جانتا جس نے یہ بات کہی ہو، لیکن قول اعشیٰ کو صحیح قرار دینے کے لئے تاویل کرنا کہ شعر

کنت امرأ زمنا بالعراق　　　عفیف المناخ طویل التغنی

میں طویل التغنی سے مراد طویل الاستغنا ہے غلط ہے، کیونکہ غنا اعشیٰ سے مراد اس جگہ تغنی ہے۔ عرب کا مقولہ ہے "غنی فلاں بمکان کذا" اس کے معنیٰ ہیں اذا اقام بہ، یعنی فلاں آدمی فلاں جگہ مقیم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

کان لم یغنوا فیھا　　　گویا وہاں آباد ہی نہ ہوئے تھے

اس کے علاوہ دوسرے شعر کو دلیل میں پیش کرنا کہ

کلانا غنی عن اخیہ حیاتہ　　　ونحن اذا متنا اشد تغانیا

اس شعر میں بھی غلطی ہوئی ہے۔ اس لئے تغانی تفاعل کے وزن پر ہے اور یہ اسی وقت بولتے ہیں جب ایک دوسرے سے بے نیاز ہو جیسا کہ کہا جاتا ہے تضارب الرجل، ایک نے دوسرے کو مارا، ایسے ہی تشاتما (ایک نے دوسرے کو گالی دی) تقاتلا، ایک نے دوسرے سے جنگ کی" ہے۔

ابن عینیہ کی بات یوں بھی غلط معلوم ہوتی ہے کہ حدیث بالا میں اَذِنَ کے معنیٰ اطلاق اور اباحت کے قرار دئے جائیں تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ الاذن مصدر ہے اور اذن فلاں بکلام فلاں فھو باذن سے ماخوذ ہے جس کے معنی، سننے سنانے کے آتے ہیں چنانچہ قرآن پاک کی آیت ہے

اذنت لربھا وحقت　　　اس نے اپنے رب کے حکم کو سنا اور اسکو بھی حق تھا کہ سنے۔ یہاں اذنت کے معنی سننے کے ہیں۔

یہی عدی بن زید نے کہا ہے۔ بہرحال ما اذن اللہ لشیٔ کا ترجمہ سننے سنانے کا ہوگا (یہاں تک طبری کے مسلک کو مختصراً بیان کر دیا گیا ہے)

ابوالحسن ابن بطال نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں ابن ابی شیبہ کی روایت سے ایک اشکال اور وارد ہو گیا ہے، انھوں نے بہ سند متصل روایت کیا ہے کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلموا القرآن وغنوا به واكتبوه فوالذي نفسي بيده لهو اشد تفصيا من المخاض من العقل	آپ نے ارشاد فرمایا قرآن سیکھو اور اس کو اچھی آواز سے پڑھو اور اس کو لکھو خدا کی قسم قرآن حافظہ سے اونٹنی کے رسی سے نکل بھاگنے سے بھی زیادہ تیز محو ہو جاتا ہے۔

ابن شیبہ کہتے ہیں کہ جب ابی عاصم نبیل سے عینیہ کی تاویل کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ عینیہ نے ایسی بات کیوں کہی۔ ہم سے ابن جریج نے اور ان سے عطا بن عبید بن عمیر نے کہا کہ "اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام کو زبور پڑھنے کا ایک ڈھنگ آتا تھا جس کی وجہ سے وہ خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے" ابن عباسؓ فرماتے ہیں وہ ستر آوازوں میں زبور پڑھا کرتے تھے۔ اور اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ سب مست اور اور بے خود ہو جاتے تھے۔

امام شافعیؒ صاحب سے ابن عینیہ کی تاویل کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا ہم اس سے خوب واقف ہیں۔ اگر ان کی مراد "استغنا" ہے تو "من لم یستغن بالقرآن" کہتے۔ لیکن جب انھوں نے فرمایا ہے "یتغنی بالقرآن" تو معلوم ہوا کہ اُن کی مراد تغنی ہے۔ اس لئے کہ قرآن پاک کو اچھی آواز سے خوب سنوار کر پڑھنے سے بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اور سننے کی رغبت پیدا ہوتی ہے اور قرآن کے الفاظ اور معنی نفوس میں خوب اثر کرتے ہیں۔ گویا اچھی آواز مقصود کے حاصل ہونے میں معین ہوتی ہے۔ اُس کی مثال ایسی

ہی ہے جیسی کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلا دی جائے۔ یا کھانے میں کوئی خوشبو ملا دی جائے جس سے رغبت طعام زیادہ پیدا ہو۔ یا عورت کے بناؤ سنگھار کی طرح ہے کہ اس سے نکاح کرنے کی رغبت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں اور چونکہ آدمی کے لئے "گانے کا اشتیاق" ایک امر لازمی ہے، اس لئے طرب غنائی بجائے طرب قرآن متعین کیا گیا ہو جیسا کہ ہر حرام اور مکروہ کے عوض میں بہتر چیز مقرر ہوئی۔ اور تیروں کے ذریعہ تقسیم کرنے کی جگہ استخارہ مقرر ہوا جس میں توحید خالص بھی ہے اور توکل بھی ہے۔ اور بدکاری کی جگہ نکاح، جوئے کی جگہ نیزوں کے ذریعہ سبقت لے جانا، اور سماع شیطانی کی جگہ سماع رحمانی[لہ]

سماع کا بیان

لہ آج کل مسلمانوں میں سے ایک طبقہ جس کو پیران طریقت بھی کہا جاتا ہے وہ سماع کا بہت دلدادہ ہے اور اپنے اس فعل حرام کو حلال ثابت کرنے کے لئے مشائخ عظام اور بعض احادیث کا حوالہ دیتا ہے، اس مسئلہ میں قدرے تفصیل سے کلام لیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی آیت ہے۔ واستفزز من استطعت منهم بصوتك الآیہ ۔ اس میں بصوتک سے مراد۔ یہی غنا اور مزامیر ہیں۔ صاحب درمختار نے بیان فرمایا ہے:۔

ومنهم من اباح مطلقاً ومنهم من كرهه مطلقاً وفي البحر والمذهب فانقطع الاختلاف بل ظاهر الرواية انه كبيرة ولو لنفسه

بعض نے اس کو مباح قرار دیا ہے اور بعض نے مکروہ کہا ہے۔ اور بحر میں کہا ہے کہ۔ مذہب یہ ہے کہ وہ مطلقاً حرام ہے لہذا اختلاف ختم ہو گیا۔ ظاہر روایت یہ ہے کہ وہ گناہ کبیرہ ہے اگرچہ اپنے نفس کے لئے ہو

حضرت شاہ نظام الدین اولیاءؒ کا ایک ملفوظ ہے جو انھوں نے یکم ذی قعدہ ۷۱۹ھ کو ارشاد فرمایا تھا (باقی حاشیہ ص۱۸ پر ملاحظہ فرمائیے)

قرآن متعین ہوا، اس کے نظائر کثرت سے ملتے ہیں اور حرام چیز اکثر مفسدہ پر مشتمل ہوتی ہے اور آواز سے قرآن پاک پڑھنے میں کوئی ایسا مفسدہ نہیں ہے۔ کیونکہ کلام اپنی وضع سے خارج نہیں ہوتا۔

لحن ممنوع اور اگر اس طرح پڑھا جائے کہ اُس سے حروف زیادہ ہو جائیں یا کم ہو جائیں اور کلام کے معنی سمجھنے میں نہ آئیں اور کلام اپنی اصلی وضع سے ہٹ جائے تو پھر اس طرح پڑھنا منع ہے (اور فرماتے ہیں) یہ تطریب اور تلحین ایک ایسا امر ہے جو کبھی تو کیفیت ادا کی طرف منسوب ہوتا ہے اور کبھی سلیقہ اور طبیعت کی طرف منسوب ہوتا ہے اور کبھی تکلف کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ جہاں تک کیفیات ادا کا تعلق ہے اس سے کلام اپنے مفردات کی وضع سے خارج نہیں ہوتا بلکہ یہ تو آواز کی صفات ہیں کہ کبھی موٹی ہو جاتی ہے اور کبھی باریک، کبھی اس میں مد آجاتا ہے اور کبھی امالہ۔ کبھی قرارت طویل ہو جاتی ہے اور کبھی متوسط بہرحال ان کیفیات کا تعلق حروف سے ہے اور لحن اور تطریب کا تعلق آواز سے ہے اور اُس کے نظائر بیان کرنا ممکن ہیں۔ بخلاف حروف کی ادائیگی کے اس جگہ سب کی مثالیں تو پیش نہ کی جا سکیں گی نمونۃً چند کو ذکر کیا جاتا ہے

حضور صلعم نے ایک مرتبہ سورۂ فتح کی تلاوت کرتے ہوئے۔ آآآ کیا بیان کیاہے کہ تطریب اور تلحین میں دو چیزیں ہوتی ہیں "مد اور ترجیع" حضور صلی اللہ علیہ وسلم

صفحہ ۱۷ کا باقی حاشیہ :-

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، سماع را مباح میدارد با دف برخلاف علمائے ما

امام شافعی صاحبؒ سماع کو دف کے ساتھ بھی مباح قرار دیتے ہیں۔ بخلاف ہمارے علماء کے (کہ وہ ناجائز قرار دیتے ہیں) (باقی صـ۱۹ پر)

سے ثابت ہے کہ آپ قرأت فرماتے ہوئے آواز کو کھینچا کرتے تھے۔ چنانچہ "الرحمٰن الرحیم" میں مد فرمایا کرتے تھے۔

جو حضرات اس سے منع کرتے ہیں ان کا فرمانا ہے کہ ہمارے پاس بھی اس کے چند دلائل ہیں۔ ایک حدیث تو وہ ہے کہ جس کو حضرت حذیفہ بن یمان رضی نے روایت کیا ہے کہ حضور صلعم نے ارشاد فرمایا:۔

اقرؤا القرآن بلحون العرب واصواتھا وایاکم ولحون اھل الکتاب والفسق فانہ سیجئ من بعدی اقوام یرجعون بالقرآن ترجیع الغناء والنوح لایجاوز حناجرھم	قرآن کو عربی لحن اور عربوں کی آواز میں پڑھو، اور اہل کتاب وفساق کی آواز سے بچو!۔ اس لئے کہ میرے بعد اقوام پیدا ہوں گی جو قرآن کو گانے اور رونے کی طرح پڑھینگی اُنکے حلقوم سے قرآن نیچے نہ اُترے گا۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۸) حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی جو نظام الدین اولیاؒ کے مسند نشین ہیں ان کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن بعض مرید حضرت خواجہ کے سرود سن رہے تھے۔ حضرت چراغ دہلوی رح مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب مریدوں نے اعتراض کیا یہ تو اپنے پیر کے مشرب سے پھر گئے۔ تب حضرت چراغ نے فرمایا، یہ کوئی دلیل نہیں ہے، کتاب وسنت سے کوئی دلیل بیان کرنی چاہیے۔ یہ شکایت مریدوں نے حضرت خواجہ کے حضور میں بیان کی، تو فرمایا راست او میگوید وحق آنست کہ او میگوید۔ وہ صحیح فرماتے ہیں اور حق وہی ہے جو وہ کہتے ہیں یاد رہے حضرت خواجہ بلا مزامیر کے سُنا کرتے تھے الخ لمعان محمدی ص ۱۰۔ اس مسئلہ پر حضرت تھانوی رح نے اپنے رسالہ حق السماع میں تفصیلی کلام کیا ہے۔

اس حدیث کو نوادر الاصول میں اور قاضی ابو یعلی نے جامع میں ذکر کیا ہے اسی کے ساتھ ایک دوسری حدیث اور بھی بیان کی گئی ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علامات قیامت میں سے یہ بھی بیان فرمایا ہے:۔

ان یتخذ القرآن مزامیر یقدمون احدھم لیس باقرئھم ولا افضلھم الا لیغنیھم غناءً

قرآن پاک کو مزامیر بنا لیں گے، یعنی گانے کی طرح پڑھیں گے اور امامت کیلئے اسکو امام بنائیں گے جو نہ قاری ہوگا اور نہ اس میں کوئی فضیلت ہوگی بلکہ وہ ان کو گانا سنائیگا یعنی گانے کے طرز پر قرآن پڑھے گا۔

ان حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ زیاد ہندی چند قاریوں کے ساتھ حضرت انس رض کے پاس آیا، اس سے قرآن پڑھنے کو کہا گیا تو اس نے آواز کو بلند کیا اور گانے کے طرز پر پڑھنا شروع کیا۔ یہ شخص رفیع الصوت تھا۔ جب حضرت انس رض نے یہ دیکھا تو چہرے پر سے کپڑا ہٹا کر اس سے کہا، ایسے صاحب وہ ایسا نہ کرتے تھے۔ حضرت انس رض کو جب کوئی چیز بری محسوس ہوتی تو چہرے سے کپڑا ہٹا کر منع فرماتے (غالباً نقاب ڈالے رہتے ہونگے)

ان حضرات کا یہ بھی فرمانا ہے کہ حضور صلعم نے موذن کو منع فرمایا ہے کہ وہ اذان گا کر دے۔ جیسا کہ ابن جریج نے حضرت عطا سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس رض سے نقل کیا ہے کہ حضور صلعم کا ایک موذن طرب انگیز تھا۔ آپ نے فرمایا اذان آسان اور سہل ہے۔ اگر تیری اذان ایسی ہو تو کہہ ورنہ نہیں۔ اس روایت کو دار قطنی نے روایت کیا ہے

اور عبد الغنی بن سعید حافظ نے حدیث قتادہ بروایت عبد الرحمن بن ابی بکر صدیق نقل کی ہے کہ حضرت ابو بکر رض نے ارشاد فرمایا

کانت قرأۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المد لیس فیھا ترجیع

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت مد کے ساتھ ہوتی تھی اس میں ترجیع نہیں تھی۔

منقول ہے کہ ترجیع اور تطریب میں غیر مہموز میں ہمزہ اور غیر مد میں مد ہوتا ہے ایک الف کی ترجیع میں چند الف اور ایک واو کی جگہ ترجیع میں چند واو اور ایک یا کی جگہ ترجیع میں چند یا پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن پاک کے حروف میں زیادتی ہے جو جائز نہیں ہے۔ اور اس کی بھی کوئی حد معین نہیں ہے کہ کس قدر جائز ہے اور کس قدر نا جائز ہے اگر حد معین کی جائے تو ایک قسم کی زبردستی ہوگی اور اگر نہ کی جائے تو قاری کو چھوٹ مل جائیگی کہ وہ آواز کو خوب گھمائیگا، جیسا کہ گویا اشعار پڑھتے وقت اور بعض قاری فاتحہ خوانی میں کرتے ہیں، اس سے کتاب اللہ میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ اور اس کو علمائے اسلام میں سے کسی نے بھی جائز قرار نہیں دیا۔

بہر حال تطریب اور تلحین تغیر کثیر کے لئے ذریعہ ہیں اس لئے اس کی ممانعت ذرائع حرام کی ممانعت کے مثل ہے۔ یہاں تک ہم نے دونوں فریقوں کے دلائل کو ذکر کر دیا۔ رہی فیصلہ کی بات وہ میرے نزدیک دو طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ طبعی اقتضار کے مطابق بلا تکلف لہجہ پیدا ہو جائے۔ یہ جائز ہے اس صورت میں اقتضار طبیعت کی اعانت کر دینا مستحسن ہے یعنی آواز کو اور سدھار لینا۔ جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ رضؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا، کہ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اور زیادہ سنوار کر پڑھتا۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کو سلف نے اختیار کیا ہے۔ یہی تغنی محمود اور ممدوح ہے

دوسری وجہ وہ ہے جس کا تعلق فن سے ہے جو تمرین اور مشق کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ گانے کی آوازوں کو سیکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ وہ ہے کہ جسکو اسلاف نے مکروہ قرار دیا ہے۔ اس طرح پر مذکورہ بالا اشتباہ اور نزاع ختم ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں کو اسلاف کے حالات کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ گانے کی سی آواز سے قرآن پڑھنے سے روکتے تھے اور بچتے تھے۔ ہاں یہ قطعی بات ہے کہ وہ تطریب و تحزین کے لئے پڑھتے بھی تھے اور یہ طبعی تقاضہ کے مطابق ہے اس سے شارع

علیہ السلام نے بھی منع نہیں کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے

لیس منا من لم یتغن بالقرآن[1]۔ واللہ اعلم

---

[1] اس حدیث کی شرح میں حضرت گنگوہی رح نے ارشاد فرمایا ہے۔ "اس حدیث میں مراد حسن صوت او رخوش الحانی سے پڑھنا ہے اور ایسی طرح تغنی کرنا کہ حروف میں زیادتی وکمی نہ ہو جائز بلکہ مستحسن ہے اور ایسی طرح پڑھنا کہ حروف میں کمی زیادتی پیدا ہو جاوے جائز نہیں ہے۔

(فتاوی رشیدیہ، مطبوعہ قرآن محل، کراچی)

باب تیسواں ۳۰

مریضوں کی عیادت

آپ کی سیرتِ مبارکہ عیادت میں

آپ اپنے صحابہ کی جب وہ بیمار ہو جاتے تو عیادت فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے اس اہل کتاب (یہودی) لڑکے کی بھی عیادت فرمائی جو آپ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ آپ نے اپنے مشرک چچا (غالباً ابوطالب) کی عیادت بھی کی۔ آپ نے ان دونوں پر اسلام پیش کیا۔ وہ یہودی لڑکا مسلمان ہو گیا (اور حالت اسلام میں اس کا انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہ)

آپ مریض سے قریب ہو کر اس کے سر کے پاس بیٹھتے، اور اس سے اسکی حالت دریافت فرماتے، اور یہ بھی دریافت فرماتے "تمھارا کس چیز کو جی چاہتا ہے"۔ اگر وہ کسی ایسی چیز کی خواہش ظاہر کرتا کہ جس میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے تو آپ اس کے لئے امر فرماتے، اور اپنا دست مبارک اس پر پھیرتے اور یہ دعا پڑھتے۔

اللھم رب الناس اذھب	اے اللہ لوگوں کے رب تکلیف کو دور
الباس واشفِ وانت الشافی	فرما اور شفا دے، تو ہی شفا دینے والا ہے
لاشفاء الا شفاءک	اور بجز تیری شفا کے کوئی شفا نہیں ہے

اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے:۔

امسح الباس رب الناس	اے لوگوں کے رب تکلیف کو مٹا دے
بیدك الشفاء لا کاشف له	تیرے ہاتھ میں شفا ہے۔ اور

الا انت   اس کو بجز تیرے اور کوئی کھولنے والا نہیں

اور آپ مریض کے لئے تین مرتبہ دعا کیا کرتے تھے جیسا کہ آپ نے حضرت سعد کے لئے تین مرتبہ فرمایا "اللّٰھم اشف سعدا" اے اللہ سعد کو شفا دے۔ جب آپ مریض کے پاس جاتے تو فرماتے۔ کوئی مضائقہ نہیں "پاکی ہے"۔ اور بعض دفعہ فرماتے "کفارہ ہے اور پاکی ہے" [1]

جھاڑ پھونک کرنا

جب کسی مریض کے کوئی پھوڑا، زخم، اور کوئی تکلیف ہوتی تو آپ دم بھی فرمایا کرتے تھے۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ آپ انگشت شہادت کو زمین پر رکھتے پھر اس کو اٹھا کر فرماتے:۔

بسم اللہ تربۃ ارضنا بریقۃ بعضنا یشفی سقیمنا باذن ربنا [2]

---

[1] جو کچھ اس عالم آب وگل میں پیش آرہا ہے وہ سب امر خداوندی اور اس کی مشیت سے ہے بلایا اور مصائب اور امراض کے نزول سے کبھی ان کا منشا تنبیہ اور روک ہوتا ہے۔ اگر لوگ باز آگئے تو بہتر، یہی چیز ان کے حق میں کفارہ سیئات بن جاتی ہے کبھی مقصود خداوندی آزمائش اور ابتلاء ہوتا ہے تو یہی چیز ترقی مراتب کا سبب بن جاتی ہے اور کبھی غضب کی صورت میں ان چیزوں کا نزول ہوتا ہے۔ اہل کشف اور اصحاب بصیرت اس فرق کو خوب جانتے ہیں اور بتلا دیتے ہیں کہ کس کے ساتھ، کیسا برتاؤ کیوں ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم

[2] جھاڑ پھونک:۔ آج کل جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا رواج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ یہ کام خدمت اور نفع رسانی کے درجہ سے نکل کر پیشہ اور تجارت کی حد میں داخل ہو گیا ہے اس کے لئے جواز کی لاکھ صورتیں پیدا کر لی جائیں لیکن دین اور شریعت کی روح اس سے مضمحل ہوتی ہے۔ اس میں ملت کا بہت بڑا نقصان ہے اور یہ کیا کم نقصان ہے کہ جہلاء کا عقیدہ خراب ہوتا ہے اور ان کی قوت عمل کمزور پڑ جاتی ہے۔ اہل حق کو چاہئے (باقی حاشیہ ۱۵ پر)

یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے۔ اسی حدیث سے وہ الفاظ باطل ثابت ہوتے ہیں جو اس حدیث میں ہیں۔

سبعین الفاً الذین یدخلون الجنۃ بغیر حساب وانھم لا یرقون۔	ستر ہزار افراد وہ ہیں جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے جنھوں نے جھاڑ پھونک نہیں کی۔

اس حدیث میں لایرقون راوی کے غلطی سے اضافہ ہوا ہے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے "لایسترقون" ہے یعنی وہ جھاڑ پھونک نہیں کراتے میں یہ کہتا ہوں، یہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ اس میں کمال درجہ کی توحید پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ اسی وجہ سے ان سے استرقاء کی نفی کی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ وہ لوگوں سے رقیہ کا سوال نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے

(صفحہ ۲۴ کا باقی حاشیہ) کہ وہ خود بھی اس سے مجتنب رہیں اور سختی کے ساتھ لوگوں کو اس فعل مذموم سے روکیں۔

ملا علی قاریؒ نے بیان فرمایا ہے، مذاہب اربعہ کے علماء کی ایک بڑی جماعت نے کہا ہے کہ ایسے کلمات کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جو عربی میں نہ ہوں، یا اگر ہوں تو اُن کے معنی سمجھ میں نہ آئیں اور طریق صحیح سے مروی نہ ہوں، جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔

مرقاۃ ص۳۵۳ ج ۳۔ مطبوعہ پاک

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی شرح میں تحریر فرمایا کہ وطن کی مٹی کو حفاظت مزاج میں بہت بڑا دخل ہے۔ اس لئے حالت سفر میں اگر وطن کا پانی ساتھ رکھنا دشوار ہو تو تھوڑی سی مٹی ساتھ رکھنا چاہئے اور جہاں کہیں مزاج کے موافق پانی نہ ملے اس میں تھوڑی سی وہ مٹی ملا کر پینا چاہئے تو انشاء اللہ تغیر مزاج سے حفاظت رہے گی۔ مرقاۃ ص۳۵۲ ج ۳

اسی حدیث میں ہے وعلی ربھم یتوکلون ، یعنی وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں کیونکہ یہ حضرات اپنے رب کے ساتھ کمال توکل اور اعتماد اور اس کی رضا جوئی کے لئے لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کرتے۔ حدیہ ہے کہ وہ نہ ان سے فال لیتے ہیں اور نہ تعویذ، اور نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، کیونکہ ان چیزوں سے عقیدۂ توحید میں فرق آتا ہے، اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ ان حضرات کا استدلال ہے کہ راقی (جھاڑ پھونک کرنے والا) مثل صدقہ کرنے والے کے ہے، اور مسترقی، مثل سائل کے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رقیہ کیا ہے، کرایا نہیں ہے، اور ارشاد فرمایا ہے۔

ان استطاع منکم ان ینفع اخاہ فلینفعہ (الحدیث)

اگر تم میں سے کسی کو اپنے بھائی کو فائدہ پہنچانے کی قدرت ہو تو ضرور پہونچائے۔

اس حدیث پر اگر یہ اشکال وارد کیا جائے جو بخاری وسلم میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر تشریف لاتے تو دونوں ہاتھوں کو جمع کرکے ان پر قل ھو اللہ، اور قل اعوذ برب الناس اور قل اعوذ برب الفلق پڑھ کر دم فرماتے اور پورے جسم مقدس پر آگے اور پیچھے جہاں تک ہاتھ جاتا مسح کرتے تھے۔ جب آپ بیمار ہوئے تو مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث تین الفاظ کے ساتھ مروی ہے ۱ جو مذکور ہوا ۲ یہ کہ آپ بذات خود ایسا کرتے تھے ۳ یہ کہ حضرت عائشہ رض اپنے آپ ایسا کرتی تھیں، چوتھی روایت یہ ہے کہ آپ صرف معوذات پڑھ کر خود ہی دم فرماتے تھے۔ یہ الفاظ بعض بعض کی تفسیر کرتے ہیں، اور چونکہ ضعف اور درد کی وجہ سے آپ اپنا دست مبارک نہیں پھیر سکتے تھے اس وجہ سے آپ حضرت عائشہ رض کو امر فرماتے تھے۔ اور یہ استرقا نہیں ہے (کیونکہ دم آپ فرماتے اور ہاتھ وہ پھیر دیتیں)۔ چنانچہ حضرت عائشہ رض نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے مجھ کو دم کرنے کو فرمایا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ مجھے ایسا کرنے کو فرمایا یعنی صرف ہاتھ پھیرنے کو فرمایا

عیادت مریض عیادت کے لئے آپ نے کوئی دن خاص نہیں کیا تھا، بلکہ امت کے لئے مریضوں کی عیادت کے لئے دن، رات، صبح، شام ہر وقت کو جائز رکھا (کیونکہ یہ ایسی ضرورت ہے جس کا وقت متعین نہیں ہے) مسند میں روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔

اذا عاد الرجل اخاہ المسلم مشی فی خرفۃ الجنۃ حتی یجلس فاذا جلس غمرتہ الرحمۃ فان کان غدوۃ صلی علیہ سبعون الف ملک حتی یمسی وان کان مساء صلی علیہ سبعون ملک حتی یصبح	جب کوئی اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جنت کے جھروکے میں جاتا ہے اور جب عیادت کے لئے بیٹھ جاتا ہے تو رحمت اُس کو ڈھانپ لیتی ہے، اگر صبح ہوتی ہے تو شام تک اور شام ہوتی ہے تو صبح تک اس کے لئے ستر ہزار فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

دوسری روایت میں "ساعت" کا لفظ ہے۔ آپ آنکھ دکھنے اور دیگر امراض میں عیادت فرمایا کرتے۔ اور عیادت کرتے وقت مریض کی پیشانی پر دست مبارک رکھتے تھے۔ اور اس کے سینہ اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور چہرے پر بھی اور اس کے لئے شفاء کی دعا کرتے۔ جب آپ کسی مریض سے مایوس ہو جاتے تو یہ پڑھا کرتے تھے۔ انّا للّٰہِ وانّا الیہ راجعون ط

جنازہ میں سنت نبی صلعم جنازہ کے معاملہ میں آپ کا اسوہ تمام اُمتوں سے زیادہ کامل تھا۔ آپ میت پر ایسا احسان فرماتے جو اُس کو قبر میں بھی نفع دے اور قیامت کو بھی نفع دے، اور آپ میت کے رشتہ دار دل کے ساتھ بھی احسان کا معاملہ فرماتے تھے۔

جنازہ کے معاملہ میں بھی آپ اسی کے ساتھ عبودیت رب کا لحاظ رکھتے تھے[۱]۔ چنانچہ

---

[۱] میت اور اس کے لئے تجہیز وتکفین۔ یہ حق مسلم ہے، اور ملتوں میں تم (باقی حاشیہ صہ ۲۸ پر)

آپ اور آپ کے صحابہ صف بنا کر کھڑے ہوتے، خدا کی حمد وثنا کرتے اور میت کے لئے استغفار اور اس کے لئے منغفرت اور رحمت کی دعا کرتے آپ اور آپ کے صحابہ جنازہ کے آگے چلا کرتے تھے[۱] تا آنکہ کہ اُس کو دفن کیا جائے۔ پھر قبر کے پاس کھڑے ہو کر میت کے لئے ثبات قدمی کی دُعا مانگتے[۲]۔ پھر زیارت قبور کی تاکید فرماتے اور سلام کرتے[۳]، اور میت کے لئے دُعا کرنے کی اسی طرح تاکید فرماتے تھے، جس طرح زندوں کو آپس میں ملاقات کرنے اور سلام دعا کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔

(آپ کا اسوۂ حسنہ تھا) کہ حالت مرض میں آخرت کے متعلق فرماتے اور وصیت کے لئے امر فرماتے اور توبہ کی طرف متوجہ کرتے اور حاضرین کو امر فرماتے کہ وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی تلقین کریں، تا کہ مرنے والے کا آخری کلام یہی ہو، اور ان امور کے ارتکاب سے منع فرماتے جو ان ملتوں کا طریقہ ہے جن کا ایمان آخرت پر نہیں ہے، مثلاً رخسار پیٹنا، کپڑے پھاڑنا،

(صفحہ ۲۷ کا باقی حاشیہ) تو جس طرح بھی ہو اس حق کی ادائیگی اس طرح کی جاتی ہے کہ عبادت کا پہلو نہیں ہوتا مگر اسلام میں صلوٰۃِ جنازہ کو لازم کر کے عبادت کا پہلو نمایاں کر دیا۔ گویا مہد سے لیکر لحد تک عبادتِ حق تعالیٰ شانہ کا رُخ زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ پیدائش کے بعد بچے کے کان میں اذان اور اقامت، یہ قیام عبادت اور بندگی کی دعوت ہے اور صلوٰۃ جنازہ اسکی آخری کڑی ہے اور انسانی عبدیت ——— کا آخری مقام ہے۔ یہ مثال دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ یاد رکھو! جن لوگوں کی دعوت میں قیام عبادت پر زور نہیں ہے یقیناً انھوں نے غلط راہ اختیار کی ہے۔

صفحہ ہٰذا [۱] جنازہ سے آگے چلنا، امام شافعی صاحبؒ کا مسلک ہے۔ اور یہی مسلک امام احمدؒ کا ہے امام ابو حنیفہ رح فرماتے ہیں جنازہ کے پیچھے چلنا مستحب ہے۔ ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے۔ الجنازۃ جنازہ کے پیچھے چلنا (باقی صـ۲۹ پر)

بال مونڈوادینا، بلند آواز سے رونا، نوحہ کرنا وغیرہ۔ البتہ بلا آواز کے رونا، قلب کا غمگین ہونا، اس کی اجازت ہے۔ اور آپ کی عادت شریفہ بھی یہی تھی۔ آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

تدمع العین ویحزن القلب۔ آنکھ روتی ہے، دل غمگین ہے اور

ولا نقول الا ما یرضی الرب۔ ہم وہی کہتے ہیں جو خدا کو پسند ہے

آپ نے اسی حالت میں اُمت کے لئے خدا کی تعریف کرنا، استرجاع کرنا، اور رضا بالقضاء کا امر فرمایا ہے۔ رونا اور رنجیدہ خاطر ہونا اس کے منافی نہیں ہے (کیونکہ یہ انسانی فطرت کے تقاضے ہیں) اسی وجہ سے آپ اللہ تعالیٰ کی پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ راضی رہنے والے اور اس کی سب سے زیادہ حمد کرنے والے تھے۔ اس کے باوجود جس دن صاجزادے محترم حضرت ابراہیم رضہ کی وفات ہوئی تو آپ رو دیئے۔ لیکن آپ کا قلب رضاء الٰہی سے بھرآیا اور بعض عارفین کے بارے میں مروی ہے کہ وہ جب ان دونوں

(صفحہ ۲۸ کا باقی) چاہیے۔ حضرات شوافع نے جو احادیث پیش کی ہیں، وہ مرسل ہیں اور صرف بیان جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن یہ حدیث قولی ہے جس کو فوقیت حاصل ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کے آخری راوی پر جرح کی ہے اور اس کو مجہول قرار دیا ہے۔ لیکن امام صاحب کے لئے وہ مضر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ان کے بہت بعد کا راوی ہے۔ مرقاۃ ص۵۷ ج ۴ بذل ص۲۰۰ ج ۴

۲ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ مسند امام اعظم میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

۳ مشکوٰۃ شریف میں ایسی احادیث موجود ہیں۔

زیارتِ قبور علامہ کی تحریر کے مطابق زیارتِ قبور کی اہمیت ظاہر ہے حدیث پاک میں اس کو موت کے لئے مذکر قرار دیا ہے۔ امام احمد نے زیارتِ قبور کے لئے بھی سفر کو ناجائز قرار دیا ہے۔ لیکن علامہ نے اس جگہ اس کے متعلق کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک جائز ہے اور اس کے متعلق وہ متعدد احادیث بیان کرتے ہیں۔ زیارت قبور کے لئے مسنون طریقہ

چیزوں کو جمع ذکر سکے اور اپنے بچے کی دفات پر ہنستے تھے۔ دریافت کیا گیا، تو کہا کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے تو میں بھی اس کے فیصلہ پر راضی ہوں۔

بعض اہلِ علم کو جب اس پر اشکال ہوا کہ رونے اور ہنسنے کو کس طرح رضاء الٰہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اس بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے سنا ہے۔ فرماتے تھے کہ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ سب سے زیادہ کامل تر ہے۔ کیونکہ عبودیت کے تقاضہ کی بنا پر رو دیئے۔ عارف صاحب یہ دونوں چیزیں جمع کرنے پر قادر نہ ہو سکے اسی وجہ سے انھوں نے قضاء الٰہی اور فیصلہ خداوندی پر اظہار مسرت کیا۔

تجہیز میت تجہیز میت یعنی غسل اور کفن وغیرہ میں آپ بہت جلدی کیا کرتے تھے شروع میں آپ نزع کے وقت ہی تشریف لے جاتے لیکن جب صحابہؓ نے دیکھا کہ اس میں آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو جب جنازہ تیار ہو جاتا تب بلا لیتے، اور اس کے بعد یہ طریقہ ہو گیا تھا کہ جنازہ تیار کرکے آپ کی خدمت میں لے جاتے۔ آپ نے ہمیشہ جنازہ پر خارج مسجد[1] نماز جنازہ پڑھی ہے۔ آپ کی عادت شریفہ فرض نماز مسجد میں ادا کرنے کی تھی یہاں

(باقی صفحہ ۲۹) وہی ہے جو علامہ نے ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ قبر کا طواف کرنا، اسکو سجدہ کرنا، اُس کو بوسہ دینا، اُس کو چھونا یہ سب امور ناجائز ہیں۔ اسی طرح قبر پر چراغاں کرنا ناجائز ہے اور فال نیک بھی نہیں ہے۔ عورتوں کا قبروں پر جانا، عرس کرنا، میلے لگانا، یہ سب خرافات اور شیطانی دھندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے آمین۔ عینی شرح ہدایہ ص۱۱۳۲

[1] صحیح مسلک یہی ہے جو علامہ نے ذکر کیا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ امام شافعی صاحب اسکو جائز قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک سنت شریفہ کا تعلق ہے، علامہ نے نہایت واضح الفاظ میں ذکر کر دیا ہے۔ اگر عادت شریفہ مسجد میں جنازہ کی نماز کی ادائیگی کی ہوتی تو یہ اختلاف نہ ہوتا۔ اسی بارے میں سب سے زیادہ قوی استدلال سہیل بن بیضا (باقی ص۳۱ پر)

سہیل بن بیضار کے جنازہ کی نماز آپ نے مسجد میں ادا کی۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رض کی حدیث روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

من صلی علی جنازۃ فی المسجد فلا شئی لہ (الحدیث) — جس نے جنازہ کی نماز مسجد میں ادا کی اس کے لئے کچھ نہیں۔

مسجد میں جنازہ کی نماز

الفاظ حدیث میں اختلاف ہے خطیب نے نقل کیا۔ فلا شئی علیہ (اس کے لئے کچھ نہیں) اور دوسروں نے فلا شئی لہٗ روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے لیس لہ شیئٌ (اس کے لئے کچھ نہیں) روایت کیا ہے۔ امام احمدؒ اور دوسروں نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اور فرمایا، اس روایت میں صالح منفرد ہیں بیہقی نے کہا ہے۔ یہ حدیث معتبر ہے لیکن حدیث عائشہ زیادہ صحیح ہے اور صالح کی عدالت میں اختلاف ہے۔ اور امام مالک نے بھی ان پر جرح کی ہے۔ اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ سہیل بن بیضار اور ان کے بھائی کے جنازہ کی نماز مسجد میں پڑھی گئی۔ میں کہتا ہوں کہ صالح فی نفسہٖ ثقہ ہیں۔ ابن معین نے بھی اُن کو ثقہ کہا ہے۔ اور

(صفحہ ۳۰ کا باقی حاشیہ) والی حدیث اور حضرات شیخین کے جنازہ کی نماز مسجد میں ادا ہونے کے بارے میں ہے۔ پہلی حدیث پر علاّمہ نے خود جرح کی ہے اور یہی جرح دیگر محدثین نے بھی کی ہے اور چند تاویلیں اور احتمال پیدا کئے ہیں مثلاً ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معتکف ہوں، یا بارش وغیرہ کا عذر ہو۔ اگر جائز ہوتی تو نجاشی کے جنازہ کی نماز اور بہت سے صحابہ کے جنازہ کی نماز مسجد سے باہر نہ ادا کی ہوتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسجد کے باہر شرقی گوشہ میں ایک جگہ نماز کے لئے مقرر تھی۔ جہاں تک حضرات شیخین کے جنازہ کی نماز کا معاملہ ہے اس کے بارے میں بھی یہی ہے کہ یا تو کسی عذر کی بنا پر ہو یا ان دونوں صاحب کی خصوصیت تھی۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں۔ لامع الدراری ص ۱۲۶ ج ۲ مرقاۃ ص ۵۱ ج ۴۔ عینی ص ۱۱۲۵، فتح القدیر ص ۲۲۴ ج ۱

ابن ابی مریم اور یحیٰی نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ امام مالک نے کیوں ان کی حدیث ترک کی؟ فرمایا، امام مالک نے ان کو بہت بوڑھا ہونے کے بعد پایا تھا لیکن ابی ذویب نے بوڑھا ہونے سے قبل ملاقات کی تھی۔ علی بن مدینی نے کہا ہے وہ ثقہ ہیں لیکن بوڑھے ہو گئے تھے۔ امام ثوری نے بوڑھا ہونے کے بعد ان سے ملاقات کی، اور ابن ذویب نے بوڑھاپے سے قبل ملاقات کی تھی، ابن حبان نے کہا ہے کہ ۲۵ سال کی عمر میں وہ بہت تغیر کر دیتے تھے۔ چنانچہ بہت سے ثقہ راویوں کی روایت اس طرح بیان کر دیتے تھے جو موضوعات سے مشابہ ہو جاتی تھی، لہٰذا ان کی حدیث قدیم اور اخیر میں اختلاط ہو گیا۔ اس لئے ان کی روایات مستحق ترک ہیں۔

لیکن یہ حدیث حسن ہے کیونکہ اس کے راوی ابن ابی ذویب ہیں اور انھوں نے حواس مختل ہونے سے قبل سُنا ہے، لہٰذا اُن کا حواس مختل ہونا اس حدیث کے رد کا موجب نہیں ہو سکتا۔ امام طحاویؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث اور حضرت عائشہؓ کی حدیث کے معاملہ میں ایک دوسرا مسلک اختیار کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں، سہیل بن بیضاء کے جنازہ کی نماز مسجد میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی وہ منسوخ ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے عمل سے منسوخ ہے۔ آپ نے تمام صحابہؓ کو مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے سے انکار فرما دیا تھا۔ امام بیہقی وغیرہ نے امام طحاویؒ کا رد کیا ہے، اور کہا ہے جو روایت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے وہ اگر منسوخ ہوتی تو حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر رضؓ کے جنازہ کی نماز مسجد میں ادا کی گئی کو روایت نہ کرتیں؟

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ان لوگوں نے روایت کی ہے جن کو جواز کی خبر نہیں ہے۔ خطابی نے کہا ہے کہ یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت عمر رضؓ کے جنازہ کی نماز مسجد میں ہوئی اور اس وقت تمام مہاجرین اور انصار موجود تھے لیکن اس کے باوجود کسی سے انکار منقول نہیں ہے۔ لہٰذا جواز ثابت ہوا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کی تاویل، اجر کے نقصان"

سے کی جلئے۔ کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ جو نماز جنازہ مسجد میں ہوتی ہے بیشتر لوگ پڑھ کر گھروں کو واپس آجاتے ہیں اور جو مساجد سے باہر (مقابر کے قرب) پڑھی جاتی ہے تو بیشتر لوگ دفن میں شریک ہوجاتے ہیں، ان کو بقدر دو قیراط ثواب ملتا ہے۔ ونیز کثرت قدوم کا ثواب بھی رہا پہلی صورت میں یہ بات نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے فلاشی لہ اور فلاشی علیہ دونوں کے معنی ایک ہی بیان کئے ہیں جیساکہ قرآن پاک میں ہے "واسأتم فلھا ای فعلیھا" اور بہتر بات وہ ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے۔ کہ سنت شریفہ مسجد سے باہر نماز جنازہ پڑھنا ہے۔ الا بعذر۔ ویسے دونوں جائز ہیں۔ ہاں افضل خارج المسجد ہے۔

میّت کا منھ ڈھانک دینا

آپ کی سنت شریفہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد مردے کا مُنہ ڈھانک دیا جائے اور آنکھوں کو بند کردیا جائے اور قبلہ رُخ کردیا جائے جیساکہ آپ نے حضرت عثمان بن منظعون کی میت کو کیا تھا۔

آپ نے غسل میت کا حکم فرمایا ہے اور نہلانے میں کافور وغیرہ استعمال کو فرمایا ہے اور جو شہید میدان جنگ میں ہوا ہے آپ اس کو غسل نہیں دلاتے تھے۔ امام احمد نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے غسل دینے سے منع فرمایا ہے۔ آپ شہید کے جسم سے لوہا وغیرہ اتار دیتے تھے اور اُنھیں کپڑوں میں دفن فرماتے تھے۔ اور شہید پر آپ نے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔

محرِم کو آپ نے غسل دلایا ہے اور احرام ہی کے کپڑوں کا کفن دیا ہے اور خوشبو وغیرہ سے منع فرمایا ہے اور اُس کا سر ڈھکنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اولیا میت کو آپ حکم دیتے کہ اچھا سفید کپڑا دیا جائے۔ ہاں زیادہ بڑھیا نہ ہو۔ اگر کفن کم ہوتا تو اس کا سر ڈھک دیتے اور پیروں پر گھاس وغیرہ رکھ دیتے تھے (جیساکہ مصعب بن عمیر رومی کے ساتھ کیا)

میت پر قرضہ

جب کوئی جنازہ آپ کی خدمت میں لایا جاتا تو آپ دریافت کرتے کہ اس پر قرضہ تو نہیں ہے۔ اگر نہ ہوتا تو آپ نماز پڑھا دیتے اور اگر ہوتا تو اپنے اصحاب کو امر فرما دیتے کہ ان میں سے کوئی پڑھا دے۔ کیونکہ آپ کی نماز اس کے

حق میں شفاعت ہے۔ اور عبد مرتہن اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک قرضہ نہ ادا کردے۔

جب آپ پر فتوحات شروع ہوئیں تو آپ خود میت کا قرضہ ادا کر دیتے اور نماز پڑھا دیتے اور اس کا مال اس کے وارثوں کے لئے چھوڑ دیتے۔

صلوٰۃ جنازہ جب آپ نماز جنازہ شروع فرماتے تو پہلے تکبیر کہتے اور پھر حمد و ثنا کرتے[۲] حضرت ابن عباسؓ نے ایک مرتبہ جنازہ کی نماز پڑھائی تو تکبیر اولی کے بعد سورہ فاتحہ جہراً پڑھی، اور فرمایا:-

لتعلموا انها سنة — تاکہ آپ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے

یہی ابو امامہ ابن سہیل نے کہا ہے۔ جنازہ کی نماز میں قرارت مسنون ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملہ میں دو چیزیں منقول ہیں:-

یقرء علی الجنازہ بفاتحۃ الکتاب — آپ جنازہ کی نماز میں قراۃ فاتحہ فرماتے

اس کے اسناد صحیح نہیں ہیں۔ ہمارے شیخ نے کہا ہے قراۃ سورہ فاتحہ واجب نہیں ہے سنت ہے اور ابو امامہ بن سہیل نے حضرات صحابہؓ کی ایک جماعت سے صلوٰۃ جنازہ میں درود شریف پڑھنا[۳] بھی روایت کیا ہے۔ یحیٰ بن سعید انصاری، عن سعید المقبری عن ابی ہریرہؓ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبادہ بن صامتؓ نے صلوٰۃ جنازہ کے بارے میں ان سے دریافت کیا تو فرمایا

۱؎ یہ رحمت عالم ہونیکا ایک نمونہ ہے یعنی اگر جنازہ کی نماز پڑھا دیتے تو اسکی مغفرت یقینی تھی لیکن صاحب حق محروم رہتا۔ البتہ آپ شریک ضرور رہتے۔ مردہ بھی شرکت کی برکت سے فیضیاب اور صاحب حق کا بھی حق وصول، دونوں کے حق میں رحمت ہی رحمت ہے۔

۲؎ مسنون یہی ہے کہ ثنا پڑھی جائے۔ لیکن یہ روایت کہ آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی ہے اور یہ پڑھنا مسنون ہے یعنی بدعت نہیں ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اگر سورہ فاتحہ بغرض ثنا پڑھی جائے تو سنت ادا ہو جائیگی بہرحال یہ قول صحابی ہے اس کے مقابلہ میں دوسری روایت حضرت ابن عمر کی ہے کہ وہ ثنا پڑھا کرتے تھے سورہ فاتحہ نہیں پڑھتے تھے اسی کو امام ابو حنیفہ نے اختیار کیا ہے۔ مرقاۃ ص۳۴۹ مطبوعہ پاک ۳؎ یعنی ثنا کے بعد

قسم خدا کی ہیں تمہیں بتلاتا ہوں۔

تکبیر کہہ کر شروع کرو اور پھر درود شریف پڑھو، پھر کہو!

اللّٰھم عبدك فلانا كان لا شريك لك وانت اعلم به، ان كان محسنًا فزد فى احسانه وان كان مسيئًا فتجاوز عنه اللّٰهم لا تحرمنا اجره ولا تضلنا بعده

اے اللہ تیرا فلاں بندہ شریک نہیں کرتا تھا اور تو اس کو جانتا ہے۔ اگر وہ نیک ہے تو اس کی نیکی میں زیادتی کر، اور اگر بد ہے تو اس کے گناہ معاف کر دے۔ اے اللہ اس کے اجر سے ہمیں محروم مت کر اور اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کر

صلوٰۃ جنازہ سے مقصود حقیقت حال یہ ہے کہ میت کے لئے دعا ہے اس بارے میں بہت روایات ہیں کہ آپ فاتحۃ الکتاب کے بارے میں نہیں ہیں۔ آپ کی دعا کے الفاظ یہ ہیں

اللّٰھمّ اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس وابدله دارًا خيرًا من داره واهله وزوجًا خيرًا من زوجه وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار (الحدیث)

اے اللہ اس کی مغفرت فرما اور اس پر رحم کر اور اس کو شرافت کی جگہ دے۔ اور اس کی جگہ کو کشادگی دے اور اس کو ٹھنڈے پانی سے غسل دے اور اس کو گناہوں سے ایسا پاک کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے ہو جاتا ہے اور اس کو اس کے گھر سے بہتر گھر اور اس کے اہل سے بہتر اہل اور زوج سے بہتر زوج عطا کر اور اس کو جنت میں داخل فرما اور اس کو عذاب قبر سے اور عذاب نار سے محفوظ رکھ

آپ کی دعا کے یہ الفاظ بھی محفوظ ہیں:-

اللّٰھمّ اغفر لحيّنا وميتنا وصغيرنا وكبيرنا وذكرنا وانثانا وشاهدنا وغائبنا اللّٰھمّ من احييته

اے اللہ ہمارے زندوں، مردوں، بچوں، بوڑھوں، مردوں، عورتوں، موجود اور غائب کی مغفرت فرما، اے اللہ جس کو تو ہم میں سے زندہ

مَنّا فاحیہ علی الاسلام والسنۃ و — رکھے اس کو اسلام اور سنت پر زندہ رکھا اور
من توفیتہ منّا فتوفہ علی الایمان؎ — جس کو وفات دے اُس کو ایمان پر وفات دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میت کے لئے اخلاص سے دعا کرنے کے لئے فرمایا کرتے تھے۔ اور آپ جنازے کی نماز میں چار تکبیرات فرمایا کرتے تھے اور پانچ کی روایت بھی موجود ہے۔ حضرات صحابہ رضؓ آپ کے بعد۔ چار، پانچ، چھ تکبیرات کہہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ زید بن ارقمؓ نے جنازہ کی نماز پڑھاتے ہوئے پانچ تکبیریں کہیں۔ اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ تکبیریں کہی ہیں۔ اُس کو مسلم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضؓ نے سہیل بن حنیف کے جنازے پر چھ تکبیریں کہیں۔ اہل بدر کے جنازہ پر بھی چھ تکبیریں کہی گئیں، اور دوسرے صحابہ کے جنازے پر پانچ، اور بقیہ تمام انسانوں کے جنازہ پر چار، اُس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔

سعید بن منصور نے بروایت ابن عیینہ ذکر کیا ہے کہ اہل بدر پر ۵، ۶، ۷، تکبیرات کہی گئیں (ابن قیم فرماتے ہیں)، یہ سب آثار صحیح ہیں جن کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادتی تکبیرات سے منع بھی نہیں کیا۔ بلکہ آپ نے اور آپ کے صحابہ رضؓ کا عمل موجود ہے جو حضرات چار سے زیادہ تکبیرات سے منع کرتے ہیں، ان کی دلیل حضرت ابن عباس رضؓ کی حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر چار تکبیرات فرمائیں۔ علماء نے فرمایا ہے یہ آخری عمل تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے آخری عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ امام احمد سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا۔ یہ جھوٹ ہے، اس کو ابن زیادہ نے روایت کیا ہے جو حدیث وضع کیا کرتا تھا۔

اس مسلک کے حضرات نے میمون بن مہران کی ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ :-

---

؎ ۔ اس جگہ دو، دعائیں اور منقول ہیں خوف طوالت ان کو نقل نہیں کیا گیا۔

ان الملائکۃ لما صلت علیٰ آدم علیہ السلام کبرت علیہ اربعاً۔ وقالوتلک سنتکم یا بنی آدم

جب فرشتوں نے حضرت آدمؑ کے جنازہ کی نماز پڑھی تو چار تکبیریں کہیں اور کہا کہ اے بنی آدم یہ تمہارے لئے سنت ہے۔

اس حدیث کے بارے میں اثرم نے ذکر کیا ہے کہ محمد بن معاویہ جب مکہ میں رہتے تھے تو میں نے ان کے بارے میں ابو عبداللہ سے سنا ہے کہ انھوں نے فرمایا، میرے نزدیک ان کی احادیث موضوع ہیں۔ اس کے بعد ان کے سامنے عن ابی الملیح عن میمون بن مہران عن ابن عباس یہی حدیث ذکر کی گئی تو متعجب ہوئے اور فرمایا کہ ابو الملیح تو روایت حدیث میں بہت صحیح اور متقی ہیں پھر انھوں نے معلوم نہیں کہ کس طرح اس حدیث کو روایت کر دیا [۱]

امام بیہقی نے اسی روایت کو عن یحییٰ علی ابی روایت کیا ہے اور آخر میں کہا ہے ھذا لا یصح یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ حدیث مرفوع اور موقوف دونوں طرح مروی ہے۔ حضرت معاذ کے شاگرد (اس روایت کو نقل کرنے کے باوجود) پانچ تکبیر کہا کرتے تھے۔ علقمہ نے کہا کہ جب اس کا ذکر ابو عبداللہ سے ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ تکبیر زیادہ کہنے کی وجہ سے میت پر کچھ نہیں۔ جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہہ دیا کرو، اور جب وہ سلام پھیر دے تم بھی پھیر دیا کرو۔[۲]

---

[۱] اس روایت کو حاکم نے مستدرک اور ابو نعیم نے حلیہ میں اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں بھی ذکر کیا ہے۔

[۲] ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ چار تکبیرات پر ہی اجماع ہے۔ ھذا۔ میں عرض کرتا ہوں امام ابو حنیفہؒ نے بروایت حماد نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کو جمع کیا، اور ان سب سے تکبیرات جنازہ کے بارے میں دریافت کیا، سب نے آخر الامر چار تکبیرات پر اتفاق کیا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی کا حکم صادر فرما دیا۔ مسند امام اعظم ص۱۰۲۔ اسی روایت یعنی اجماع کو امام بیہقی طبرانی نے بھی نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے حاشیہ مسند امام ص۲

صلوٰۃ جنازہ میں سلام

روایت کیا گیا کہ آپ ایک سلام پھیرتے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ دونوں طرف سلام پھیرتے تھے۔ امام بیہقی وغیرہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کی نماز میں

کبر اربعاً و سلّم تسلیماً	چار تکبیر کہی ہیں اور ایک سلام
واحدہ	پھیرا ہے۔

لیکن اثرم کی روایت میں امام احمد نے فرمایا ہے یہ حدیث موضوع ہے اُس کو خلال نے علل میں ذکر کیا ہے۔ ابراہیم ہجری نے عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت ذکر کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کی نماز میں چار تکبیر کہیں اور توقف فرمایا۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید آپ پانچویں تکبیر کہیں گے پھر آپ نے دائیں طرف اور بائیں طرف سلام پھیرا۔ راوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن اوفی نے فرمایا کہ میں اس سے زیادہ نہیں کرونگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تین عادات شریفہ ایسی ہیں کہ لوگوں نے ان کو ترک کر دیا ہے، اُن میں ایک

التسلیم علی الجنازۃ مثل	جنازہ کی نماز میں سلام مثل نماز
التسلیم فی الصلوٰۃ	کی سلام کے ہے۔

لیکن ابراہیم بن مسلم کو ابن معین، نسائی، ابوحاتم نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور امام شافعی نے اس حدیث کو اپنی کتاب "حرملہ" میں روایت کیا ہے۔ اس میں ہے:۔

کبّر علیھا اربعًا ثم قام ساعۃً	آپ نے چار تکبیر کہیں پھر کچھ توقف کیا
فسبّح بہ القوم فسلّم	تو لوگوں نے سبحان اللہ کہا، پھر آپ نے
	سلام پھیر دیا۔

اس حدیث میں عن یمینہ، عن شمالہ (یعنی دائیں اور بائیں) یہ الفاظ نہیں

ہیں۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے محاربی کی سند سے روایت کیا ہے۔ اس میں بھی عن یمینہ وعن شمالہ نہیں ہے۔ اور حالانکہ ترجمۃ الباب کا عنوان یہی ہے۔ میں کہتا ہوں ابن ابی اوفی سے اس کے خلاف مشہور ہے کہ آپ صرف ایک سلام پھیرا کرتے تھے۔ اس کو امام احمد اور احمد بن قاسم نے روایت کیا ہے۔ ابو عبداللہ سے دریافت کیا گیا کیا آپ کو صحابہؓ میں سے کسی کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ جنازہ کی نماز میں دو سلام پھیرا کرتے تھے، لیکن چھ حضرات صحابہ کے بارے میں ہے کہ وہ ہلکی آواز سے صرف ایک سلام دائیں طرف کو پھیرا کرتے تھے۔ وہ چھ حضرات یہ ہیں۔ ابن عمر، ابن عباس، ابو ہریرہ، واثلہ بن الاسقع، ابن ابی اوفیٰ، زید بن ثابت، امام بیہقی نے علی بن طالب، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک، ابی امامہ بن سہل کا اضافہ اور کیا ہے۔ یہ کل دس ہیں[1]۔

حضرت ابوامامہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا زمانہ پایا ہے۔ چنانچہ وہ صحابہ اور کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ جہاں تک رفع یدین کا معاملہ ہے امام شافعی صاحب اس کے قائل ہیں اور اُس کو نماز پر قیاس کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھایا کرتے تھے[2]۔

میں کہتا ہوں، امام شافعی صاحب نے جس اثر کا حوالہ دیا ہے جس کو انہوں نے ابن عمر اور انس مالک رضہ سے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے ذکر کیا ہے کہ صرف تکبیر افتتاح کے وقت

---

[1] - امام شافعیؒ سے بھی مشہور دو ہی سلام ہیں۔ صرف امام مالک صاحبؒ ایک سلام کو کہتے ہیں۔ علامہ نے ان ہی کے مسلک کو اختیار کیا ہے۔ غالباً وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ پوری جہر کے ساتھ دوسرا سلام نہیں پھیرا جاتا تھا یہی امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے۔ البنایہ ص۱۱۰ ج۲ چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھے رکھنے چاہئیں یا نہیں؟ ـــــ ائمہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے فتاویٰ دارالعلوم میں اسی کو اختیار کیا ہے

ہاتھ اُٹھاتے تھے۔ اور امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کی نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھا، یہ حدیث زید بن سنان کی وجہ سے ضعیف ہے۔

قبر پر صلوٰۃ جنازہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جنازہ کی نماز قبر پر ایک رات گذرنے کے بعد، اور ایک مرتبہ تین رات گذرنے کے بعد، اور ایک مرتبہ ایک مہینہ گذرنے کے بعد پڑھی ہے اور اس بارے میں کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا[1]۔ امام احمد نے فرمایا ہے۔ قبر پر جنازہ کی نماز پڑھنے پر شک نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس مسئلہ میں چھ طرح پر حدیث مروی ہے۔ اور کل حسن ہیں۔ چنانچہ امام احمدؒ نے قبر پر جنازہ کی نماز کی ایک ماہ مدت مقرر کی ہے اور اکثر مدت یہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ اور امام شافعی نے اُس وقت تک کے لئے اجازت دی ہے جب تک میت پُرانی نہ ہو جائے۔ اور امام مالک صاحبؒ نے اس سے بالکل منع فرمایا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے صرف ولی غائب کو اجازت دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ کی نماز میں مرد کے جنازے کے سر کے سامنے اور عورت کے جنازے کے بیچ میں کھڑے ہوتے تھے[2]۔

---

[1] قبر پر جنازہ کی نماز کے بارے میں اختلاف ہے حنفیہ کے نزدیک اسکو حالات پر موقوف رکھا گیا ہے یعنی اگر مردہ کو بلا نماز کے دفن کر دیا گیا ہے جب تک اس کا جسم صحیح و سالم ہے اُس وقت تک اس پر جنازہ کی نماز پڑھنی جائز ہے۔ چنانچہ اندازہ موسم اور زمین کی حالت سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ سرد ملکوں اور پتھریلی زمین میں لاش زیادہ دنوں تک محفوظ رہ سکتی ہے۔ بخلاف گرم ملک اور ریتلی زمین میں جلد ہی لاش بگڑ جاتی ہے۔ عام حالات کے بارے میں امام ابویوسفؒ نے تین دن تک اجازت دی ہے اور اُس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ مقدس پر قیاس کیا ہے۔ النبایہ ص۱۹۰

[2] حنفیہ کے نزدیک اس بارے میں مرد اور عورت دونوں کے جنازہ کا ایک ہی حکم ہے یعنی سینہ کے سامنے کھڑا ہونا چاہئے، کیونکہ وہ محل ایمان ہے۔

بچہ کی نماز جنازہ

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

صلوا علی اطفالکم فانہم افراطکم — اپنے بچوں پر نماز جنازہ پڑھا کرو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے افراط ہیں [۱]

احمد بن ابی عبیدہ کہتے ہیں، میں نے امام احمد سے دریافت کیا، سقط[۲] پر کب تک نماز پڑھنی چاہیے؟ فرمایا، جب چار مہینہ کا ہو جائے، اس وقت اس میں روح پڑجاتی ہے میں کہتا ہوں کہ حدیث ابن ماجہ اگرچہ صحیح ہے اور مرفوع ہے لیکن اس میں مدت مذکور نہیں ہے، یہی سعید بن مسیب نے فرمایا ہے -

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی نماز جنازہ پڑھی تھی؟ اس میں اختلاف ہے - ابو داود نے حضرت عائشہ رض کی حدیث ذکر کی ہے کہ صاحبزادہ محترم حضرت ابراہیم رض کی وفات اٹھارہ ماہ کی عمر میں ہوئی - اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی[۳] - امام احمد نے اس حدیث کی سند ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے - یہ حدیث منکر ہے اور خلال نے حضرت براء بن عازب رض کی روایت ذکر کی ہے -

---

[۱] افراط، فرط، ذخیرہ آخرت کو کہتے ہیں [۲] جو بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے حنفیہ کے نزدیک اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے - ترمذی اور نسائی میں روایت ہے الطفل لا یصلی علیہ ولا یرث ولا یورث حتی استہل یعنی جو بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے اس پر جنازہ کی نماز نہیں پڑھی جائیگی - امام ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے - استہلال یہ ہے کہ بچہ میں ایسی علامتیں ہوں جو اس کی حیات پر دلالت کریں - مثلاً آواز ہونا، کسی عضو کا حرکت کرنا وغیرہ - نسائی کی دوسری روایت ہے - اذا استھل الصبی صلی علیہ مرقاۃ ص۵۶ ج ۴ - فتح القدیر ص۴۵۸ ج ۱ [۳] اس حدیث سے بعض حضرات نے استدلال کیا ہے کہ بچہ کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھنا چاہیے، کیونکہ اسکو ضرورت نہیں ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ بچہ کی بھی نماز جنازہ پڑھی (باقی ص۴۲)

صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ابنہ ابراھیم وھو ابن ستۃ عشر شھراً	آپ نے اپنے صاحبزادے ابراہیمؑ کی نماز جنازہ پڑھی۔ ان کی عمر سولہ ماہ کی ہوئی تھی کہ وفات ہوگئی۔

اور ابوداؤد نے جہنی کی روایت ذکر کی ہے کہ آپ نے نماز جنازہ پڑھی لیکن یہ حدیث مرسل ہے اور جہنی کا نام عبداللہ بن یسار کوفی ہے اور عطا بن ابی رباح نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم رض کی عمر صرف ستر رات کی تھی، لیکن یہ حدیث مرسل ہے حضرت عطا کو وہم ہوگیا ہے بہر حال اس میں اختلاف ہے بعض نے روایت کیا ہے کہ نماز پڑھی ہے اور حضرت عائشہ رض کی حدیث کی صحت سے انکار کیا ہے جیسا کہ امام احمد اور دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ مرسل ہے باوجودیکہ حضرت براء بن عازب رض کی حدیث تائید میں موجود ہے۔ اور بعض نے براء بن عازب رض کی حدیث کو جابر جہنی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور ان مراسیل کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ حدیث ابن اسحٰق زیادہ صحیح ہے۔

دوسرا اختلاف اس بارے میں ہے کہ کس وجہ سے نماز جنازہ نہیں پڑھی بعض نے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی وجہ سے وہ نماز جنازہ سے مستغنی تھے۔ دوسری جماعت نے کہا ہے کہ اس دن سورج گرہن ہوا تھا۔ اور اس دن اس قدر طویل صلوٰۃ ہوئی تھی کہ جس کی وجہ سے ضرورت نہ تھی۔ تیسری جماعت نے کہا ہے کہ بظاہر ان آثار میں تعارض نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے آپ نے دوسروں کو امر کردیا ہو اور خود نہ پڑھی ہو۔ علاوہ ازیں روایت مثبت کو فوقیت حاصل ہے۔

خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ	جو لوگ حداً قتل ہوئے ہیں جیسے زانی جس کو رجم کیا گیا ہو

(صفحہ ام کا باقی) جائیگی۔ جہاں تک اس استدلال کا تعلق ہے علامہ قدس سرہ نے خود اسکے جوابات دیے ہیں

اس پر جنازہ کی نماز میں اختلاف ہے[1]۔ چنانچہ جھنیہ پر جب آپ نے نماز پڑھی تو حضرت عمر رضؓ نے عرض کیا۔

تصلی علیھا یا رسول اللہ — آپ اس پر جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں

وقد زنت — اس نے تو زنا کیا ہے۔

تب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

لقد تابت توبۃ لو قسمت بین سبعین من اھل المدینۃ لوسعتھم وھل وجدت توبۃ افضل من انھا جاءت بنفسھا للہ

اُس نے ایسی توبہ کی ہے اگر اس کو مدینہ کے ستر لوگوں پر تقسیم کر دیا جائے تو اس کی توبہ بڑھ جائے گی۔ اور کیا تو نے ایسی توبہ کوئی دیکھی ہے جو اس کی توبہ سے افضل ہو؟ حدیہ ہے کہ اس نے اپنی جان کو خدا کے سپرد کر دیا۔

صحیح بخاری میں حضرت ماعزبن مالک کا قصہ ذکر ہے، ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمات خیر فرمائے۔ اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھی۔ زھری نے اس بارے میں اختلاف ذکر کیا ہے، چنانچہ محمود بن غیلان نے صلوٰۃ جنازہ کو ثابت کیا ہے۔ اور عبدالرزاق کے آٹھ شاگردوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ وہ آٹھ یہ ہیں۔ اسحٰق بن راھویہ، محمد بن یحییٰ الذھلی نوح بن حبیب، حسن بن علی، محمد بن متوکل، حمید بن زنجویہ، احمد بن منصور رمادی امام بیہقی نے کہا ہے کہ محمود بن غیلان کا قول کہ آپ نے جنازہ کی نماز پڑھی" خطا ہے کیونکہ

---

[1] حنفیہ کا اس بارے میں مسلک یہ ہے۔ صلوا علی من قال لا الہ الا اللہ* کہہ دیا یعنی مسلمان ہو گیا اس پر جنازہ کی نماز پڑھی جائیگی یہی امام شافعی صاحبؒ کا مسلک ہے۔ حنفیہ کے نزدیک اسقدر احتیاط ہے کہ زجراً خواص نماز نہ پڑھیں۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایت سے یہی ثابت ہے۔ آپنے فرمایا، اما انا فلا اصلی علیہ لیکن میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا یہی حکم ان لوگوں کے بارے میں ہے جنھوں نے خودکشی کی ہے۔ بذل صفحہ ۲۰۲ ج ۳

* جس نے لا الہ الا اللہ

اصحاب عبدالرزاق کا اس کے خلاف اجماع ہے، اور اصحاب زہری بھی اس کے مخالف ہیں علاوہ ازیں حضرت ماعزرضؓ کے قصہ میں بھی اختلاف ہے چنانچہ ابو سعید خدری نے فرمایا ہے

ما استغفر لہ ولا سبہ۔ آپ نے اس کے لئے نہ استغفار کیا اور نہ اُس کو بُرا کہا۔

بریدۃ بن حصیب نے کہا ہے کہ حضورؐ نے ماعز کے لئے استغفار کو فرمایا اور صحابہ رضؓ نے ان کے لئے استغفار کیا، اور حضرت جابر رضؓ نے فرمایا ہے کہ آپ نے ماعز کے جنازہ کی نماز پڑھی۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ اور یہی عبدالرزاق معلل کی روایت ہے۔ اور ابو بردۃ اسلمی نے کہا ہے کہ آپ نے ماعز کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔ اور نہ اس سے منع فرمایا۔ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ غامدیہ کے بارے میں حدیث میں اختلاف نہیں ہے اور حدیث ماعز کے بارے میں بھی تعرض نہیں ہے۔ اس لئے کہ نماز جنازہ اس کے لئے دعا مغفرت ہے۔ اور اگر ترک صلوٰۃ کو تسلیم کرلیا جائے تو اس میں تادیب مقصود تھی لہ

جنازہ کے ساتھ پیدل چلنا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ کے بعد قبرستان تک میت کے ساتھ آگے آگے پیدل جایا کرتے تھے۔ یہی آپ کے بعد خلفاء راشدین کی سیرت تھی۔ لہٰذا جنازہ کے ساتھ جانے والوں کے لئے جو سوار ہو اُس کو پیچھے چلنا چاہیئے۔ اور جو پیدل ہوں ان کو جنازے کے قریب

لہ حضرت ماعز رضؓ کے قصہ میں اس بارے میں کافی اختلاف موجود ہے کہ انکے جنازہ کی نماز پڑھی گئی یا نہیں گذشتہ حاشیہ میں ہم اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک ذکر کرچکے ہیں۔ علامہ نے اس جگہ اور اپنی پوری کتاب میں ابوداؤد کی احادیث سے استدلال کیا ہے لیکن دوسری کتابوں میں روایات موجود ہیں کہ آپ نے نہیں پڑھی بلکہ دوسروں کو امر فرمادیا کہ وہ اپنے بھائی کی نماز جنازہ پڑھیں۔ بذل ص ۱۵۲ ج ۵

یا تو آگے یا پیچھے یا دائیں یا بائیں چلنا مسنون ہے[1] ۔ اور آپ تیز چلنے کا حکم فرمایا کرتے تھے ۔ لیکن لوگ آج کل جس طرح قدم قدم چلتے ہیں یہ بدعت ہے مکروہ ہے اور خلافِ سنت ہے اور یہودیوں کے مشابہ ہے ۔ جو لوگ اس طرح آہستہ آہستہ چلا کرتے تھے حضرت ابو بکر رض ان پر کوڑے برساتے تھے ۔ اور فرماتے کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھپٹ کر چلا کرتے تھے ۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ کے ساتھ چلنے کے بارے میں دریافت کیا ، فرمایا

مادون الخبب — دوڑ سے کم ہونا چاہئے

اس کو اہل سنن نے روایت کیا ہے ۔ آپ جنازہ کے ساتھ پیدل چلتے اور فرماتے میں سوار نہیں ہوں گا فرشتے پیدل چل رہے ہیں ۔ جب واپس تشریف لاتے تو کبھی پیدل اور کبھی سوار ہو کر تشریف لاتے ۔ اور جب تک جنازہ نہیں رکھ دیا جاتا تو اس وقت تک آپ نہیں بیٹھتے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا اس سے مراد زمین پر جنازہ کا رکھنا ہے میں کہتا ہوں اس حدیث کو ابو داؤد نے سہیل عن ابیہ عن ابی ھریرہ سے روایت کیا ہے ، اس میں ہے

حتی توضع علی الارض — یہاں تک کہ جنازہ زمین پر رکھ دیا جاتا

اس کو ابو معاویہ نے سہیل سے روایت کیا ہے اور کہا ہے

توضع فی اللحد — یہاں تک قبر میں رکھ دیا جاتا ۔

اور سفیان معاویہ سے زیادہ حافظ ہیں ۔ ابو داؤد نے عبادہ بن صامت رض سے روایت کیا ہے کہ

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقوم فی الجنازۃ حتی توضع فی اللحد — حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب تک میت قبر میں رکھی جاتی ، اس وقت تک کھڑے رہتے تھے ۔

لیکن اس حدیث کی سند میں بشر بن رافع ہیں جن کے بارے میں ترمذی نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں ہیں اور بخاری نے کہا ہے کہ حدیث میں ان کا تابع نہیں ہے ۔ امام احمد نے ان کو ضعیف قرار دیا

---

[1] اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک ذکر کیا جا چکا ہے کہ جنازہ کے پیچھے چلنا مسنون ہے نہ آگے چلنا ۔

ہے۔ ابن معین نے منکر الحدیث کہا ہے۔ امام نسائی نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ معتبر نہیں ہیں۔ ابن حبان نے کہا کہ وہ موضوع روایات بیان کرتے ہیں۔

غائب کی صلوٰۃ جنازہ

آپ کی عادت شریفہ غائب پر نماز جنازہ پڑھنے کی نہیں تھی، چنانچہ بہت سے مسلمانوں کا انتقال ہوا، اور آپ نے ان کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی، کیونکہ ان کا جنازہ موجود نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ آپ نے نجاشی کی غائبانہ نماز پڑھی۔ اس میں تین طریقے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس میں امت کے لئے بیان جواز ہے کہ غائب کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے یہی قول امام احمد، امام شافعیؒ کا ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ یہ خصائص میں سے ہے اور یہی امام مالکؒ نے فرمایا ہے، اور یہی اصحاب ابو حنیفہ نے فرمایا ہے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنازہ لاکر رکھ دیا گیا تھا۔ اور آپ مشاہدہ کر رہے تھے یہ صلوٰۃ علی الحاضر ہے غائب نہیں ہے۔ اگرچہ حضرات صحابہؓ نے نہیں دیکھا لیکن آپ کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے گئے تھے۔ لہذا یہ صحیح ہے کہ بجز نجاشی کے آپ نے غائب کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اس اعتبار سے یہ دونوں رُخ مسنون ہوئے۔ اور چونکہ مسافت بعیدہ کی آڑ میں ختم ہو جانا اور کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ خصائص میں سے بھی ہے۔

یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے معاویہ بن معاویہ لیثی کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی لیکن یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں علا ابن زیاد ہے علی بن مدینی نے کہا ہے کہ وہ واضع حدیث ہے اس حدیث کو محمود بن هلال نے بھی روایت کیا ہے لیکن بخاری نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ اس کا تابع موجود نہیں ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے فرمایا ہے۔ اگر میت ایسے شہر میں ہے کہ جہاں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی ہوگی تو اس پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے جیسا کہ نجاشی کا انتقال ایسی ہی جگہ ہوا تھا۔ اور اگر ایسے شہر میں ہے جہاں اس کے جنازہ کی نماز پڑھی گئی ہوگی تو نہیں پڑھنا چاہئے۔ کیونکہ فرض ساقط ہو گیا اور ضرورت ختم ہو گئی۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غائب کے

جنازہ کی نماز پڑھی بھی ہے اور نہیں بھی پڑھی۔ دونوں صورتیں مسنون ہیں۔ امام احمدؒ کے نزدیک یہی انسب ہے جو ہم نے کہا ہے لیکن ان کے شاگرد صلوٰۃ علی الغائب کو ترجیح دیتے ہیں[1]

جنازہ کا استقبال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ جب کوئی جنازہ آپ کے پاس سے ہو کر گذرتا تو آپ کھڑے ہو جاتے اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ بیٹھے بھی رہے۔ اسمیں اختلاف ہو گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ کھڑا ہونا منسوخ ہو گیا ہے بیٹھنا درست ہے بعض نے کہا ہے دونوں چیزیں جائز اور مستحب ہیں، لہذا نسخ کے دعوی سے یہ صورت زیادہ بہتر ہے[2]

میت کے دفن کا وقت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ مردہ کو طلوع آفتاب کے وقت اور غروب آفتاب کے وقت اور نصف النہار کے وقت دفن کرنے کی نہیں تھی۔ آپ کی عادت شریفہ گہری لحد کھدوانے کی اور سر اور پیروں کی طرف سے کشادہ کرنے کی تھی۔

جب میت کو قبر میں رکھتے تو بسم اللہ و باللہ و علی ملۃ رسول اللہ پڑھتے۔

---

[1] علامہ نے صلوٰۃ علی الغائب کے بارے میں اوپر جو توجیہات ذکر کی ہیں وہ بہت مناسب ہیں اس میں حنفیہ کا مسلک بھی واضح ہے۔ حنفیہ کے دلائل کے متعلق مزید تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔ مرقاۃ ج۲ ص۴۶

[2] جنازہ کے استقبال میں کھڑا ہونا اس کے بارے میں مشکوٰۃ شریف کی چند احادیث ذکر کی ہیں اور ان کے ساتھ وجہ بھی بیان فرما دی ہے۔ مثلاً ایک یہودی کا جنازہ آیا تو آپ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ فرشتے جا رہے ہیں اور ہم بیٹھے رہیں مناسب نہیں۔ دوسری حدیث میں وجہ بیان فرمائی کہ یہودی کا جنازہ میرے سر سے بلند ہو جائے یہ مجھے پسند نہیں ہے اسی وجہ سے میں کھڑا ہو گیا۔ ان تمام احادیث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مسلمان کا جنازہ جب آئے تو اکراماً کھڑا ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔ ملا علی قاری نے فرمایا ہے کہ اہل علم اور بڑوں کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جانا مستحب ہے جو لوگ اس پر نکیر کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ مرقاۃ ص۴۶، ۶۳ ج۴

جب میت کو دفن کیا جاتا تو آپ کی عادت شریفہ تھی کہ سر کی طرف تین لپ مٹی بھر کر ڈالتے تھے جب دفن سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے اس میت کے ثابت قدم رہنے کے لیے دعا کرتے اور جس طرح سے آج کل لوگوں کی عادت ہے کہ میت کو تلقین کرتے ہیں آپ صلعم تلقین نہیں کرتے تھے، وہ حدیث جس کو طبرانی نے معجم میں ذکر کیا ہے کہ

اذا مات احدٌ من اخوانکم فسویتم التراب علی قبرہ فلیقم احدکم علی راس قبرہ ثم لیقل یا فلاں فانہ یسمعہ ولا یجیب ثم یقول یا فلان ابن فلانۃ فانہ یستوی قاعداً ثم یقول یا فلاں بن فلانۃ فانہ یقول ارشدنا یرحمك ولکن لا تشعرون ثم یقول اذکر ما خرجت علیہ من الدنیا شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ،

جب تمہارا کوئی بھائی مر جائے اور تم اس کی قبر پر مٹی برابر کر چکو تو تم میں سے کوئی ایک اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو کر کہے اے فلاں تو مردہ سنتا ہے اور جواب نہیں دیتا۔ پھر کہو اے فلاں۔ فلانی کے بیٹے تو مردہ بیٹھ جاتا ہے پھر کہو، اے فلاں، فلانی کے بیٹے تو مردہ کہتا ہے ہدایت فرمایئے! اللہ تجھ پر رحم کرے۔ لیکن یہ بات تم سنتے نہیں ہو۔ پھر کہو جس کلمہ پر تو دنیا میں تھا وہی کہو یعنی کلمہ شہادت .. ..

سماعِ موتیٰ

لہ تلقین میت کا تعلق سماع موتیٰ سے ہے اور اس کے متعلق احادیث اور آثار بہت مختلف ہیں۔ ہمارے حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح نے ارشاد فرمایا "یہ مسئلہ عہد صحابہ رض سے مختلف فیہا ہے۔ اس کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا تلقین بعد دفن کے اس پر ہی مبنی ہے۔ فتاویٰ رشیدیہ صـ ج ۱۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رح کا میلان سماع موتیٰ کی طرف ہے وہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ لامع صـ ۱۳۵۔ ملا علی قاری نے مرقات میں تین چار جگہ (باقی ط۴۹)

وانك رضيت بالله ربا وبمحمد نبيًا وبالاسلام دينا وبالقرآن امامًا
فان منكرًا ونكيرًا كل واحد منهما يأخذ بيد صاحبه

اور یہ کلمات کہوا لخ
رضیت باللہ ربا وبمحمد نبیا وبالاسلام دینا وبالقرآن اماما
پس منکر اور نکیر ہر ایک اُس کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے ساتھ چل، یہاں تجھ کو تلقین کی جا رہی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اس مردہ کی مدد کرتا ہے صحابہؓ نے دریافت کیا حضورؐ! اگر کوئی ماں کا نام نہ جانتا ہو تو کس کا نام لے۔ فرمایا حوّا کا نام لیکر کہو، اے فلاں بن حوّا،

یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اثرم نے کہا کہ میں نے ابو عبداللہ سے کہا، دفن میت کے وقت لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ فرمایا میں نے اہل شام کے علاوہ کسی کو یہ کرتے نہیں دیکھا، اور ابو مغیرہ نے عن ابی بکر بن ابی مریم اپنے شیوخ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ ایسا کیا کرتے تھے، میں کہتا ہوں کہ جس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے اس کو سعید بن منصور نے اپنی سنن میں عن راشد بن سعد وضمیر بن جندب وحکیم بن عمیر سے روایت کیا ہے کہ جب قبر پر مٹی ڈال دی جاتی اور لوگ چلے جاتے تو ان کے نزدیک یہ بات پسندیدہ تھی کہ میت کو تلقین کی جائے[1]

(باقی ص۔۔) اس مسئلہ پر کلام کیا ہے۔ رجحان ان کا بھی اسی طرف ہے علّامہ شامی نے اپنی کتاب ردالمحتار میں اسی حدیث کو ذکر کیا ہے جس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی مانتے ہیں۔ ردالمحتار ج۱ ص۔۔ علامہ بدرالدین عینی نے شرح ہدایہ میں اسی حدیث کو ذکر کر کے فرمایا ہے اور کہا ہے اُس کو طبرانی نے نقل کیا ہے اس کے اسناد صحیح ہیں اور فرمایا ہے کہ فقہاء کی ایک بڑی جماعت کا یہی مسلک ہے۔ بعض حضرات نے اگر تردید کی ہے تو علامہ نے ان کی گرفت کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ البنایہ ص۱۰۶۔ اسی کے ساتھ ظاہر روایت بھی نقل کی ہے کہ لا یلقن بعد الموت الخ۔ حدیث مذکور کے بارے میں جو جرح کی ہے وہ بہت مناسب ہے

[1] قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد سورۂ بقرہ کا اول اور آخر کوع قبر کے سرہانے اور نیچے کی طرف پڑھنا متوارث ہے اور اس پر عمل بھی ہے اور زیادہ قوی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔ (عزیز الرحمٰن)

قبر کو پختہ بنانا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ نہیں تھی کہ قبر کو بلند اور اینٹ، پتھر سے پختہ بنایا جائے۔ اور اس پر قبہ بنایا جائے۔ یہ سب کچھ بدعت ہے، مکروہ ہے اور سنت کے خلاف ہے۔ آپ نے حضرت علی بن طالب کو لکھ کر بھیجا تھا کہ "تماثیل کو مٹادیا جائے۔ قبروں کو برابر کردیا جائے۔ لہذا آپ کی سنت شریفہ بلند قبروں کو برابر کردینے کی تھی، آپ نے منع فرمایا ہے کہ قبروں کو پختہ کیا جائے۔ یا ان پر کچھ لکھا جائے۔ صحابہ کی قبریں بلند نہیں تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مقدس اور آپ کے دونوں صحابہ کے مزارات پر باریک سنگریزے پھیلے ہوئے تھے۔ مٹی وغیرہ کسی چیز سے لیپی ہوئی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ علامت کے طور پر ایک پتھر رکھ دیا جاتا تھا لہ

قبر پر چراغ جلانا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو سجدہ گاہ بنانے اور اس پر چراغ جلانے سے منع فرمایا ہے۔ اور قبر کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے سے بھی منع فرمایا ہے اور قبروں پر میلا لگانے کو بھی منع فرمایا عورتوں کو زیارت قبور سے منع کیا ہے۔ آپ قبروں پر بیٹھ بھی جاتے اس سے تکیہ بھی لگا لیتے تھے۔ آپ نے قبروں کی اسقدر تعظیم نہیں کی کہ اس کو سجدہ گاہ یا میلہ گاہ بنا لیا جائے ٹہ

زیارت قبور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے صحابہؓ کی قبور کی زیارت کیلئے جاتے تو ان کے لئے رحم و کرم اور مغفرت کی دعا کرتے تھے۔ اسی لئے زیارت قبر کو اُمت کے لئے مسنون قرار دیا ہے اور قبرستان میں جانے پر اس دعا کی ہدایت فرمائی ہے

السلام علیکم اھل الدیار من المومنین والمسلمین وانا

ان شاء اللہ بکم لاحقون، نسال اللہ لنا ولکم العافیۃ

لہ اسلام کا مزاج یہی ہے جو علاّمہ نے ذکر کیا ہے اور ہمارے مشائخ واکابر علمائے دیوبند کا یہی طریقہ ہے۔ لیکن ملّا علی قاریؒ نے فرمایا ہے مشہور علماء اور مشائخ کی قبور پر عمارت بنانے کو مباح قرار دیا ہے مرقاۃ ج ۲ ص ۶۹ ٹہ مقبرہ میں اس نیت سے چراغ جلانا کہ زائرین کو آسانی ہو جائز قرار دیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تو یہی تھی لیکن اس کے خلاف مشرکین اپنی ضروریات اور حوائج اور امداد کا بھی قبروں سے سوال کرتے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے خلاف ہے۔ اس طرح تین صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یا تو میت کے لئے دعا یا میت کے ذریعہ دعا، یا قبر کے پاس دعا، کفار، قبروں کے پاس دعا مانگنے کو زیادہ بہتر جانتے تھے، لیکن جو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی سیرت مقدسہ میں غور کریگا اس کو اہل شرک اور صحابہ کے عمل میں بیّن طور پر فرق معلوم ہو گا[1]

تعزیت کا بیان

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ تعزیت کرنے کی تو تھی لیکن وہ تعزیت کے لئے مجلس عزیٰ منعقد نہیں فرماتے تھے آج کل جو کچھ ہوتا ہے یہ سب کچھ بعد کی بدعات ہیں۔ آپ تو ہمیشہ ان معاملات میں تسلیم و رضا کے

قبر کے پاس دُعا

علامہ ابن حجرؒ قبر کے پاس دعا مانگنے کے بارے میں فرماتے ہیں۔ کہ قبر کی طرف منہ نہ ہونا چاہئے بلکہ قبلہ رُخ ہو کر دعا مانگنی چاہئیے لیکن ملا علی قاری نے مرقاۃ میں اور علامہ بدرالدین عینی نے البنایہ میں، علامہ ابن ھمام نے فتح القدیر میں، اس سے انکار کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ قبر کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو کر دعا مانگنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

المستحب فی حال السلام علی المیّت ان یکون وجھہ لوجہ المیت وان یستمر کذلك فی الدعا ایضاً وعلیہ عمل عامۃ المسلمین ۔ مرقاۃ ص۱۱۴ ج ۴	میت پر حال سلام میں مستحب یہ ہے کہ اس کا چہرہ میت کے چہرے کی طرف ہو اور دعا تک یہی حالت رہنی چاہئے، اور اسی پر عام مسلمانوں کا عمل ہے۔

لیکن دعا میں ہاتھ اٹھانا ؟ اس کے بارے میں قرین قیاس یہی ہے کہ جائز ہے۔ واللہ اعلم

پیکر بنے رہتے تھے کپڑے پھاڑنا، چیخ و پکار کرنا، بال مونڈوا دینا ان تمام چیزوں سے آپ نے اظہار بیزاری فرمایا ہے۔ آپ اہل میت کو کھانے وغیرہ کی بھی تکلیف نہیں دیتے تھے بلکہ اہل میت کے لئے کھانا بھجوایا کرتے تھے، کیونکہ میت کے اقارب رنج و غم میں ہوتے تھے۔ یہ آپ کے مکارم اخلاق کی بات تھی۔ آپ نے میت کے لئے اعلانات کو بھی منع فرمایا ہے۔ حضرت حذیفہ تو اس کو بھی برا سمجھتے تھے کہ ان عزیزوں کو بھی اطلاع کی جائے [۱]

تعزیت [۱] رنج و غم کے مواقع اور حوادثات پر ایک دوسرے کو تسلی و دلاسہ دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت شریفہ اور اسلامی مکارم اخلاق میں سے ہے ایسے مواقع پر پڑوسیوں اور رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اہل خانہ کے لئے کم از کم دو وقت اور زیادہ سے زیادہ تین دن کھانے پینے کا بندوبست کریں مرقاۃ ص۶۹ پوری برادری کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کرنا یا اہل میت کا اسی نسبت سے تقریبات منعقد کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ موجودہ تہذیب نے ایسے مواقع پر اظہار رنج و غم کے لئے جو تقریبات رائج کی ہیں اور تعیین ایام کردی ہے کہ یادگار کے طور پر دن منانا مثلاً "یوم فلاں" وغیرہ۔ یہ اعراس ہی کی ایک صورت ہے کہ جس کے لئے شریعت میں گنجائش نہیں ہے

تعزیت کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مکتوب گرامی جو آپ نے حضرت معاذ رض بن جبل ... کو تحریر فرمایا تھا درج ذیل ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم ہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معاذ بن جبل رض کو السلام علیکم،

میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اما بعد، اللہ تیرا اجر بڑھائے اور تجھے صبر عطا فرمائے، اور تجھے اور ہمیں شکر کی توفیق بخشے۔ ہم، اور ہمارے مال، اور اولاد، اللہ تعالیٰ کا مبارک عطیہ ہیں اور

(باقی ص۵۳ پر)

تتمّہ

صلوٰۃ خوف کا بیان

اللہ تعالیٰ نے قصر ارکان صلوٰۃ اور قصر عدد رکعات کو مباح قرار دیا ہے جب خوف و سفر دونوں جمع ہو جائیں۔ قصر عدد رکعات جب ہوتی ہے جب تنہا سفر ہو اور قصر ارکان صلوٰۃ اُس وقت ہے جب خوف ہو، یہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی۔ چنانچہ آیت مبارکہ میں "الضرب فی الارض" (سفر) خوف دونوں چیزوں کی قید ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب آپ کے اور قبلہ کے درمیان دشمن موجود ہوتا تو آپ تمام مسلمانوں کی صف بندی فرما کر نماز کے لئے کھڑا کر دیتے تھے جب آپ تکبیر فرماتے تو لوگ بھی تکبیر کہتے، پھر رکوع فرماتے تو لوگ بھی رکوع کرتے، پھر رکوع سے سر اٹھانے اس کے بعد سجدے کے لئے جھک جاتے، تو خصوصاً وہ صف جو آپ کے متصل ہوتی سجدے میں چلے جاتے اور آخری صف دشمن کے مقابل کھڑی رہتی۔ جب آپ پہلی رکعت سے فارغ ہوتے

(صفحہ ۵۲ کا باقی حاشیہ) ایک مدت تک فائدہ اُٹھانے کے لئے عاریتاً عطا ہوئے ہیں۔ پھر ہمارے اوپر اس کا شکر اور آزمائش کے وقت صبر لازم کر دیا ہے تیرا بیٹا بھی اللہ کا مبارک عطیہ تھا جو ایک مدت تک کے لئے عاریتًہ ملا تھا۔ جس پر خوشی تھی اور اب واپسی کے وقت بہت سی نمازوں کا ثواب ہے۔ اگر تو ثواب کا اُمیدوار ہے تو صبر کر۔ خبردار! جزع فزع تیرا اجر کم نہ کرے۔ جزع و فزع کسی چیز کو ٹال نہیں سکتی۔ اور غم کو کم نہیں کر سکتی۔ والسلام۔ مرقاۃ صہ ۸۵ ج ۴

اور دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے تو دوسری صف آپ کے پیچھے کھڑے ہونے کے بعد دو سجدے کرتی پھر کھڑے ہو جاتے اور پہلی صف کی جگہ دوسری صف آجاتی اور دوسری صف پہلی صف کی جگہ چلی جاتی ، تاکہ صف اولیٰ کی بھی دونوں جماعتوں کو فضیلت حاصل ہو جائے۔

دوسری صف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسری رکعت میں دو سجدے حاصل کر لیتی ، جیساکہ پہلی صف نے پہلی رکعت میں دو سجدے حاصل کئے تھے۔ یہ آپ کے غایت درجہ عدل وانصاف کی علامت ہے۔

اگر دشمن جانب قبلہ کے علاوہ کسی دوسری جانب ہوتا تو اس حالت میں کبھی آپ دو جماعتیں بناتے۔ ایک جماعت کو دشمن کے مقابل کھڑا کرتے اور ایک جماعت کو آپ اپنے ساتھ نماز میں کھڑا کرتے جب اس جماعت کی ایک رکعت ہو جاتی تو یہ دشمن کے سامنے چلی جاتی اور دوسری والی جماعت آپ کے پیچھے کھڑی ہو کر ایک رکعت ادا کرتی اور دو رکعت ہونے پر سلام پھیر دیتے ، اور آپ کے بعد ہر جماعت اپنی ایک رکعت پوری کرتی۔

آپ نے کبھی ایسا بھی کیا ہے کہ جب ایک رکعت پڑھ چکتے تو دوسری جماعت آکے شریک ہو جاتی اور ایک رکعت پڑھ کر چلی جاتی تو آپ پہلی والی جماعت کا تشہد میں انتظار فرماتے ، اور اس کے بعد سلام پھیر دیتے۔

کبھی ایسا بھی فرمایا ہے کہ ایک جماعت کو دو رکعت پڑھاتے پھر دوسری جماعت کو دو رکعت پڑھاتے اور سلام پھیر دیتے۔ اس طرح آپ کی چار رکعات ہوتیں اور دونوں جماعتوں کی دو دو رکعت ہوتیں۔

بہر حال صلوٰۃ خوف کی یہ تمام صورتیں جائز ہیں۔ امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ صلوٰۃ خوف کے متعلق جس قدر صورتیں ہیں ان میں سے کسی پر بھی عمل جائز ہے۔ اور فرمایا کہ چھ یا سات طریقے ہیں وہ سب جائز ہیں۔ امام اثرم نے فرمایا ہے کہ میں نے ابو عبداللہ سے عرض کیا کہ آپ نے ان تمام احادیث کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے ؟ فرمایا یہ سب کی سب حسن ہیں۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر جماعت جو امام کے ساتھ ایک ایک رکعت پڑھے اسکو دوسری رکعت کی ادائیگی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی مذہب ابن عباسؓ، جابرؓ، ابن عبداللہ، طاؤسؒ، مجاہدؒ، حسنؒ، قتادہ، حکمؒ، اسحق بن راھویہ کا ہے۔ صاحب مغنی نے لکھا ہے کہ امام احمد کے کلام کی عمومیت سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اور ہمارے اصحاب اس کا انکار کرتے ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ خوف کی دوسری صورتیں بھی منقول ہیں لیکن مبنیٰ ان کا یہی ہے۔ البتہ بعض الفاظ میں اختلاف واقع ہوگیا ہے بعض حضرات نے دس صورتیں نقل فرمائی ہیں، ابن حزم نے پندرہ صورتیں ذکر کی ہیں، لیکن صحیح ترین وہ ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ واللہ اعلم

باب اکتیسواں (۳۱)

صدقات اور زکوٰۃ

کامل ترین سیرت مقدسہ اس میں یہ ہے کہ مقدار زکوٰۃ، نصاب، وقت، ادا کرنے والا اور مصرف کا لحاظ رکھا جائے۔ آپ نے مالداروں اور مساکین دونوں ہی کا لحاظ رکھا ہے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ نے زکوٰۃ کو مال اور صاحب مال کے لئے پاک کرنے والا قرار دیا ہے، اور اس کو مال کی بڑھوتری، دفع آلام، اور مصائب کا ذریعہ اور مزکی کے لئے اُس کو محافظ قرار دیا ہے۔

اقسام زکوٰۃ

اللہ نے چار قسم کے اموال پیدا کئے ہیں، اکثر انھیں اموال سے ضروریات اور حوائج وابستہ ہیں۔ اُن میں سے ایک کھیتی اور بلغ ہے دوسرے چوپائے (اونٹ، گائے، بکری وغیرہ) ہیں تیسرے جواہرات یعنی چاندی اور سونا ہیں، ان ہی کے ذریعہ عالم انسانیت کی بقا اور ان کی ضروریات کا ایفا ہے چوتھے، ہر قسم کے تجارتی سامان ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو سال میں ایک مرتبہ فرض کیا ہے۔ اور کھیتی و پھل وغیرہ کے لئے حول (سال) مقرر فرمایا ہے اگر ہر ماہ یا ہر جمعہ کو زکوٰۃ فرض قرار دی جاتی تو مال والوں کے لئے بہت ضرر تھا۔ اور اگر عمر میں ایک مرتبہ فرض ہوتی تو مساکین کا نقصان تھا، پھر مال والوں کی محنت مشقت کا لحاظ رکھتے ہوئے مقدار زکوٰۃ کو متعین فرمایا ہے۔ چنانچہ رکاز (دفینہ) پر خمس مقرر فرمایا ہے اور جن چیزوں میں مشقت ہے اُن کا عشر مقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ کھیتی اور پھلوں کی زکوٰۃ یہی ہے کہ اس میں بونا، جوتنا، پانی دینا وغیرہ

مشقتیں ہیں چنانچہ ڈول وغیرہ سے سیراب کرنے میں نصف عشر مقرر فرمایا ہے۔

رہا اموال تجارت کا معاملہ اس میں سب سے زیادہ مشقت ہے۔ اس میں نفع نقصان مصائب سفر سب ہی امور پیش آتے ہیں، اس میں چالیسواں حصہ مقرر فرمایا ہے۔ اور نصاب بھی مقرر فرمایا ہے۔ .. ..، چنانچہ دو سو درہم چاندی پر ۵ درہم ہیں اور سونے کا نصاب ۲۰ مثقال مقرر فرمایا ہے۔ غلہ اور پھلوں کا نصاب پانچ وسق ہے وہ پانچ اونٹوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ بکری کا نصاب چالیس بکریاں، گائے کا نصاب تیس گائیں۔ اور اونٹ کا نصاب پانچ اونٹ ہے۔ چنانچہ پانچ اونٹ میں ایک بکری۔ دس میں دو، پندرہ میں تین، اسی طرح جب ۲۵ ہوجائیں تو ۵ بکری، اس پر جب زیادہ ہوجائے تو بنت مخاض یا ابن مخاض، اس کے بعد بنت لبون، اس کے بعد حقہ، اس کے بعد جذعہ خلاصہ کلام یہ ہے مالداروں پر وہ مقدار واجب کردی گئی ہے جو غربار کے لئے کفایت کرجائے اور اُن کا اس میں بھلا ہوجائے۔

مصارف صدقہ

اللہ تعالیٰ نے مصارف صدقہ کی آٹھ قسمیں بیان فرمائی ہیں جن کو دو صنف جامع ہیں، ان میں سے ایک صنف تو وہ ہے جو اپنی شدت احتیاج اور ضرورت کی بنا پر زکوٰۃ حاصل کرتی ہے۔ چنانچہ فقرار، مساکین[1]، الرقاب، ابن السبیل، اسی قبیل سے ہیں۔ قسم ثانی وہ ہے جنکو صرف

---

[1] فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو، مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو۔ اس کے خلاف بھی منقول ہے۔ الرقاب سے مراد غلام ہے، یعنی بدل کتابت ادا کرکے غلام آزاد کرنا۔ ابن سبیل مسافر کو کہتے ہیں۔ مولفۃ قلوب سے مراد وہ جن کی تالیف قلب اور دلبستگی کرکے مسلمان کرنا مقصود ہو، یہ قسم اب ختم ہوچکی ہے۔ غارمین سے مراد مقروض لوگ ہیں۔

اُن کی منفعت کے لئے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ عاملین زکوٰۃ، مولفت قلوب، غارمین اسی قبیل سے ہیں، اگر لینے والا صاحب احتیاج نہیں ہے اور نہ اس میں مسلمانوں کی کوئی منفعت ہے تو ایسے لوگوں کا زکوٰۃ میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔

تقسیم زکوٰۃ کا طریقہ

جب کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ آدمی مستحق زکوٰۃ ہے تو اس کو دیدینا چاہئے اور اگر کوئی یہ بتلائے کہ میں زکوٰۃ کا مستحق ہوں تو تب بھی دیدینا چاہئے خواہ اس کی حالت معلوم نہ ہو، چنانچہ مالدار اور ایسے قوی آدمی کا زکوٰۃ میں کوئی حق نہیں ہے جو کما سکتا ہے[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اہل سے وصول فرماتے اور مستحقین پر تقسیم فرما دیتے تھے جو اسی شہر کے باشندہ ہوتے تھے چنانچہ جو اُن سے بچتا اُس کو دوسرے علاقہ کے لوگوں پر تقسیم فرما دیتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ ایسے لوگوں کی تلاش میں دیہات میں لوگوں کو بھیجتے تھے۔

جب حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو یمن کا عامل مقرر فرمایا تو ان کو ہدایت فرمادی کہ یمن کے مالداروں سے لیکر وہاں کے غربا پر تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کو دوسری جگہ زکوٰۃ بھیجنے کا حکم نہیں تھا[2]

آپ کی عادت شریفہ نہیں تھی کہ فرداً فرداً اہل اموال کے پاس وصول کنندہ بھیجا جائے[3]

---

[1] جو آدمی کسب کر سکتا ہے اُس کو مانگنے کا حق نہیں ہے۔ حدیث میں اس کیلئے سخت وعید ہے

[2] زکوٰۃ کو مقامی طور پر صرف کرنا چاہئے۔ دوسری جگہ منتقل کرنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر دوسرے مقامات پر زیادہ ضرورت ہے یا رشتہ دار ہیں، یا دوسری جگہ کو مقامی جگہ سے زیادہ اہمیت ہو تو منتقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے (اللباب و فتح القدیر) [3] بلکہ یہ اہل اموال کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی زکوٰۃ کو داخل کریں کیونکہ زکوٰۃ فرض ہے اور فرض کی ادائیگی کا فکر خود صاحب فرض کو ہونا چاہئے

البتہ اموال ظاہرہ مثلاً جانور اور پیداوار کی وصول یابی کے لئے اُن لوگوں کو بھیجتے جن کو اندازہ کرنے اور آنکنے میں مہارت ہوتی ان کو خراص کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ باغات میں جاکر اس کا اندازہ لگاتے کہ کس قدر مال ہے۔ ان آنکنے والوں (خراص) کو حکم تھا کہ جب فصل نہ آئے یا بہت ہی کم آئے تو اس کو وصول میں داخل نہ کریں۔ یہ خراص پیداوار کی زکوٰۃ اس کے استعمال سے قبل ہی حاصل کر لیتے تھے۔

آپ نے عبداللہ بن رواحہ کو ایک مرتبہ خیبر بھیجا کہ وہ پیداوار کو آنکیں، وہاں کے لوگوں نے کچھ رشوت دینا چاہی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے فرمایا کہ کیا تم لوگ مجھے حرام دینا چاہتے ہو؟ میں ان کے پاس سے آیا ہوں جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور تمہاری کثرت میرے نزدیک بندر اور سور کے برابر ہے، اس لئے تمہاری کثرت مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی محبت اور تمہارے ساتھ عدل سے کام لینے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ یہ سنکر وہ سب لوگ بولے، زمین و آسمان کا قیام اسی وجہ سے ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، گھوڑوں، غلاموں، خچروں، اور سبزیوں پر زکوٰۃ نہیں لیا کرتے تھے[لے] اور نہ پھلوں کی زکوٰۃ لیتے تھے جو نہ تولے جاتے ہوں اور نہ ذخیرہ ہو سکتے ہوں، البتہ انگور اور کھجوروں کی زکوٰۃ لیتے تھے خواہ خشک ہوں یا تر ہوں۔

لے امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک زمین سے جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے اسی پر عشر ہے سوائے لکڑی اور گھاس کے امام صاحب کی دلیل میں حدیث شریف موجود ہے جس کو بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ امام کرخی فرماتے ہیں۔ امام صاحب کے مسلک میں زیادہ احتیاط ہے۔ النہایہ۔ صفہ ۱۲۳۵

گھوڑے، غلام، خچر، وغیرہ، اگر تجارت کے لئے جمع کئے ہیں تو اُن کی قیمت پر زکوٰۃ ہے اور اگر تجارت کے لئے نہیں ہیں تو اُن پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

شہد کی زکوٰۃ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہد کی زکوٰۃ لیتے تھے یا نہیں اس بارے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب سے روایت کی ہے کہ ہلال نامی بنی متعان کا ایک آدمی آیا اور اپنے لئے ایک وادی جس کا نام سلبہ تھا کے لئے سوال کیا کہ وہ عطا کر دی جائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عطا فرمادی جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو عامل علاقہ حضرت سفیان بن وہب کو اس وادی کے متعلق لکھا کہ جو کچھ یہ آدمی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشر نحل (شہد) دیا کرتا ہو اگر ادا کر دے تو بہتر ہے، زمین کو اسی نام کے نام الاٹ رکھا جائے۔ ورنہ یہ شہد بارش کی پیداوار ہے[1]، جس کا جی چاہے اس کو استعمال میں لائے یہ مباح الاستعمال ہے[2]
ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اسی سند سے روایت کیا ہے کہ شہد میں عشر ہے، اور مسند امام احمد میں ابی سیارہ ثقفی کی روایت ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے پاس شہد کی مکھیوں کے چھتے ہیں آپ نے فرمایا عشر ادا کرو۔ اور عبدالرزاق نے حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کی طرف لکھ کر بھیجا۔

ان یوخذ من العسل العشر — شہد میں سے عشر لیا جائے۔

امام شافعی صاحبؒ بیان فرماتے ہیں کہ مجھ سے انس بن عیاض نے سعد بن ابی ذئب کی

---

[1] اکثر بارش ہونے والے مقامات میں زیادہ ہوتا ہے۔ [2] اس حدیث اور گنے والی دو حدیثوں سے امام صاحب نے استدلال کیا ہے کہ شہد میں عشر ہے۔ امام ترمذی نے اکثر علماء کا یہی مسلک نقل کیا ہے۔ امام شافعی صاحب رحؒ کے دو قول میں سے ایک قول یہی ہے۔ دوسرا قول امام شافعی صاحبؒ کا یہ ہے کہ شہد میں عشر نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ یہ حیوان کا اگلن ہے جیسا کہ ریشم، امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں شہد پھولوں اور پھلوں کے رس سے پیدا ہوتا ہے۔ (ہدایہ اولین) بذل ج ۲ ص ۲۹

کی روایت ذکر کی کہ میں جناب رسول اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور مسلمان ہو گیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میری قوم جس حال میں مسلمان ہوئی ہے وہ مال بعینہٖ ان کے پاس رہنے دیا جائے اور اس میں سے کچھ نہ لیا جائے۔ آپ نے اُسکو منظور فرما لیا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مجھے اُن پر عامل مقرر کر دیا جائے۔ آپ نے مجھے عامل مقرر فرما دیا۔ پھر حضرت ابوبکر رضؓ نے بھی مجھے عامل بنائے رکھا اور حضرت عمرؓ نے بھی عامل بنائے رکھا۔ میری قوم نے شہد کے متعلق مجھ سے دریافت کیا تو میں نے کہا اس میں زکوٰۃ ہے اس لئے کہ

لا خیر فی ثمرۃ لا تزکی — اس پھل میں برکت نہیں جسکی زکوٰۃ نہ دی جائے

اُنھوں نے دریافت کیا، کس قدر؟ میں نے کہا عشر! چنانچہ میں نے اُن سے عشر لیا۔ جب میری ملاقات حضرت عمر رضؓ سے ہوئی تو میں نے ان کو اطلاع دی، چنانچہ اس کو انھوں نے لیا اور اس کی قیمت کو بیت المال میں جمع فرما دیا۔[1]

احادیث پر تنقید

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اسکے الفاظ امام شافعی صاحب کے ہیں۔ اہل علم کا ان احادیث کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ شہد کی زکوٰۃ کے بارے میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ اس باب کی اکثر احادیث صحیح نہیں ہیں۔ ابن منذر نے کہا کہ شہد کی زکوٰۃ کے متعلق کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا ہے شہد میں عشر کے بارے میں احادیث ضعیف ہیں۔ اور یہ بھی ضعیف ہے کہ اس میں عشر نہیں ہے۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے کہ یہ تمام

---

[1] اس سے بھی یہی ثابت ہے کہ شہد میں عشر ہے۔

احادیث معلول ہیں۔ ابن عمرؓ کی روایت تو اس وجہ سے کہ اس کو صدقہ بن عبد اللہ نے روایت کیا ہے اور ان کو یحیٰی بن معین اور امام احمد نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ وہ نافع کی روایت ہے اور مرسل ہے۔ امام نسائی نے صدقہ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہیں اور یہ حدیث منکر ہے لیکن ابی سیارہ کی حدیث یہ سلیمان بن موسیٰ کی سند سے جن کے بارے میں امام بخاری نے فرمایا ہے کہ ان کی ملاقات کسی صحابیؓ سے نہیں ہے اور عمرو بن شعیبؓ کی دوسری روایت کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخذ من العسل عشر

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد میں عشر لیا ہے

اس میں اسامہ بن زید ہیں اور وہ ضعیف ہیں۔ ابن معین نے کہا ہے کہ بنی زید کے تین شخص غیر معتبر ہیں۔ اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ زید بن اسلم کی اولاد میں سے کوئی ثقہ نہیں ہے۔

امام زہری کی روایت جو انھوں نے ابوسلمہ کے واسطہ سے نقل کی ہے وہ اپنے معنی کے اعتبار سے ظاہر نہیں ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کو عبد اللہ بن محرر نے بھی روایت کیا ہے تو ان کو امام بخاری نے متروک الحدیث قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ شہد کی زکوٰۃ کے متعلق کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔

امام شافعی صاحب کی حدیث کے بارے میں امام بیہقی نے کہا کہ اس کو صلت بن محمد نے منیر بن عبد اللہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ ان کے بارے میں امام بخاری نے فرمایا ہے کہ ان کی حدیث صحیح نہیں ہے اور یحیٰی بن مدینی نے کہا ہے کہ میں اس کو نہیں جانتا کون ہے؟ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ سعد بن ابی ذئب نے حکایت کی ہے جس سے اسقدر ترشح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد میں سے صدقہ لینے کا امر نہیں فرمایا ہے۔

البتہ ... ... اُس کو ... ... مرضی پر محول کیا ہے بلکہ امر اختیاری ہے۔ چاہے لیا جائے چاہے نہ لیا جائے۔ اور جہاں تک سنن اور آثار کا تعلق ہے وہ ثابت بھی ہیں اور ثابت بھی نہیں ہیں یحییٰ بن آدم نے روایت کیا ہے کہ شہد میں زکوٰۃ نہیں ہے، اور انھوں نے حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ وہ شہد میں سے کچھ نہیں لیا کرتے تھے۔

امام حمیدی نے حضرت طاؤس کے واسطہ سے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت نقل کی ہے کہ :-

انہ اتی بوقص البقر والعسل — ان کے پاس وقص بقر[1] اور شہد لایا گیا

تو انھوں نے فرمایا کہ ان دونوں کا مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر نہیں فرمایا ہے۔ امام شافعی نے ابن ابوبکر کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کے پاس منی میں عمر بن عبدالعزیز کا مکتوب پیش کیا گیا تو اس میں لکھا تھا، کہ گھوڑوں اور شہد میں صدقہ نہیں ہے بہرحال امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ اور ایک جماعت اس طرف ہے کہ شہد میں زکوٰۃ ہے جہاں تک ان آثار کا تعلق ہے ان سے ایک دوسرے کی تقویت ہوتی ہے، اور ان کے مخارج بھی متعدد ہیں اور سندیں بھی مختلف ہیں بعض مرسل ہیں اور بعض مسند ہیں۔

ابو حاتم سے عبداللہ والدمنیر کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا ان کی حدیث صحیح ہے۔ اور فرمایا :-

انہ یتولد من نور الشجر والزھر ویکال ویدخر فوجبت فیہ الزکوٰۃ کالحبوب والاثمار — یہ پیڑ کے پھولوں اور کلیوں سے پیدا ہوتا ہے تولا جاتا ہے اور ذخیرہ بنا کر رکھا بھی جاتا ہے لہٰذا اس میں زکوٰۃ واجب ہے، جیسا کہ غلہ اور پھلوں میں ہے۔

---

[1] ۳۰ اور ۴۰ کے درمیانی کسور کو وقص کہتے ہیں۔

اس میں کھیتی کے مقابلہ میں کم مشقت ہے امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے۔ اس میں عشر ہے، اگر عشری زمین سے لیا جائے۔ اور اگر خراجی زمین سے حاصل کیا گیا ہے تو کچھ واجب نہیں ہے اس لئے کہ خراجی زمین میں مالک پر خراج واجب ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر دوسرا وظیفہ واجب نہیں ہو سکتا۔ اور عشری زمین پر کچھ واجب نہیں ہوتا اس لئے اس پر عشر لیا جاتا ہے۔ امام احمد نے دونوں صورتوں میں مقرر کیا ہے۔

جو حضرات عشر واجب کرتے ہیں، اُن میں نصاب کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس میں نصاب نہیں ہے یہی قول امام ابو حنیفہ کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ شہد میں نصاب ہے۔ پھر مقدار نصاب میں اختلاف ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں دس رطل نصاب ہے۔ اور امام محمد ۵ فرق، اور ہر فرق ۳۶ رطل کا نصاب مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ پھر فرق کے وزن میں اختلاف ہے۔ ایک قول ۶۰ رطل ہے۔ دوسرا ۳۶ رطل کا ہے۔ تیسرا ۱۶ رطل کا ہے۔ اور یہی بات امام احمد کے قول سے ظاہر ہے۔

زکوٰۃ دینے والے کو دعا جب کوئی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زکوٰۃ لاتا تو آپ اس کو دعا دیتے۔ اے اللہ اس میں اور اس کے اونٹوں میں برکت دے۔ اور کبھی فرماتے اے اللہ اس پر رحمت نازل فرما۔

آپ کی عادت شریفہ زکوٰۃ میں اعلیٰ مال لینے کی نہیں تھی۔ بلکہ اوسط درجہ کا مال لیتے تھے۔ حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو بھی یہی ہدایت فرمائی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ دینے والے کو منع فرمایا ہے کہ جو شے اس نے زکوٰۃ میں ادا کر دی اُس کو خرید لے[۱]۔ آپ نے مالدار کے لئے مباح قرار دیا ہے کہ اگر کوئی فقیر

---

[۱] امام ابو حنیفہ رحؒ کا یہی مسلک ہے۔ بعض حضرات نے اُس کو حرام لکھا ہے، لیکن امام صاحب کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے۔ بذل ص۲

اپنے پاس زکوٰۃ کی چیز اُس کو ہدیۃً پیش کرے[1]، آپ مصالح مسلمین کے لئے صدقہ میں آئی ہوئی چیزوں کو قرضہ کے طور پر بھی دیدیتے تھے، مثلاً آپ نے ایک لشکر کو بھیجا، اتفاق سے اس میں سے کسی مجاہد کا اونٹ گم ہو گیا۔ آپ نے فرمایا صدقہ کے اونٹوں میں سے لے جاؤ۔ آپ صدقہ میں آئے ہوئے اونٹوں پر خود ہی نشان لگایا کرتے تھے۔ اور ان کے کانوں پر نشان لگایا کرتے تھے

صدقۃ الفطر

آپ نے مسلمان پر صدقہ فطر واجب کیا ہے اور ہر بڑے چھوٹے پر فطرہ واجب کیا ہے۔ (فرق صرف اس قدر ہے کہ نابالغ کا صدقہ فطر اُس کے ذمہ ہے جس کی زیر پرورش بچہ ہے) اس کی مقدار ایک صاع چھوارے یا جو یا کشمش (زبیب) آپ سے آدھا صاع آٹا یا گندم بھی مروی ہے اور مشہور یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان اشیاء کی جگہ آدھا صاع آٹا یا گندم مقرر فرمایا تھا۔ ابوداؤد نے صحیحین میں ذکر کیا ہے کہ یہ تناسب امیر معاویہؓ نے قائم کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اس بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے آثار مسند اور مرسل مروی ہیں جن میں سے بعض کی بعض سے تقویت ہوتی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ایک صاع گندم دو آدمیوں کی طرف سے ہے۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کی گلیوں میں ایک منادی اعلان کے لئے بھیجا کہ وہ جاکر اعلان کرے کہ ہر مسلمان، مرد، عورت، آزاد، غلام، چھوٹے بڑے پر دو مد، نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو واجب ہیں، اس کو ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو

---

[1] اس لئے کہ صدقہ اسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ غریب کے پاس تھا، لیکن جب اس نے ہدیہ کر دیا تو اُس کی نوعیت بدل گئی۔

صدقۂ فطر کے بارے میں حکم دیا کہ آدھا صاع گندم ہے"۔ اس حدیث میں سلیمان بن موسیٰ ہیں جن کو بعض نے ثقہ کہا ہے اور بعض نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے۔

حسن بصری کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے آخر رمضان المبارک میں بصرے میں منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا "اپنے روزوں کا صدقہ نکالو! لوگ یہ جانتے نہیں تھے اس وقت وہاں کچھ اہل مدینہ موجود تھے۔ ان سے فرمایا۔ اپنے بھائیوں کو بتلاؤ یہ لوگ نہیں جانتے فرمایا

فرض رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم هٰذہ الصدقة صاعاً من تمر او شعیر او نصف صاع قمح علی کل حر او مملوك ذکر او انثیٰ صغیر او کبیر فلما قدم علی رضی اللّٰہ رای رخص السعر قال قد وسع اللّٰہ علیکم فلو جعلتموها صاعاً من کل شیی،

جناب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے اس صدقہ کو فرض کیا ہے۔ ایک صاع چھوہارے یا جو یا آدھا صاع گندم، ہر آزاد، غلام، مذکر، مونث چھوٹے، بڑے پر۔

جب حضرت علی بصرہ تشریف لائے تو بھاؤ گرا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا اللّٰہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو وسعت دی ہے لہٰذا اگر ہر چیز کو ایک صاع کر دو تو بہتر ہے۔

امام نسائی نے اس جگہ یہ فرمایا ہے کہ "اگر اللّٰہ تعالیٰ تمہیں وسعت دے تو ایک صاع کر دینا ہمارے شیخ اس مذہب کو قوی قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ امام احمد کا کفارات میں یہی قیاس ہے کہ اس میں نصف صاع گیہوں واجب ہے یعنی دوسری چیزوں کے مقابلہ میں آدھا۔

ادائیگی فطرہ کا وقت

جناب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صدقۃ الفطر کو عید کی نماز سے پہلے نکالا کرتے تھے۔ سنن میں حدیث شریف موجود ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:-

من اداها قبل الصلوٰة فهی زکوٰة مقبولة ومن اداها بعد الصلوٰة فهی صدقة من الصدقات

جس نے اس کو عید کی نماز سے پہلے نکالا تو وہ صدقہ مقبولہ ہے اور جس نے اس کو بعد نماز کے ادا کیا تو وہ منجملہ صدقات کے ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ لوگوں کے عید گاہ جانے سے قبل نکالا جائے۔

بہر حال ان دونوں حدیثوں کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے نکالنے میں تاخیر نہ کی جائے ورنہ بعد نماز کے یہ فریضہ فوت ہو جائے گا۔[1] یہی صواب ہے ان دونوں حدیثوں کا نہ کوئی معارض ہے اور نہ ناسخ۔ اور نہ ان کے خلاف کوئی اجماع ہے۔ ہمارے شیخ ابن تیمیہ اسی کو قوی کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کی نظیر قربانی ہے۔ چنانچہ قربانی عید کی نماز سے قبل جائز نہیں ہے۔ اگر عید کی نماز سے قبل ذبح کر لیا تو وہ قربانی نہ ہوگی بلکہ وہ گوشت ہوگا اور کچھ نہیں۔[2] جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ ان دونوں مسئلوں میں یہی ہے۔

صدقۃ الفطر اس صدقہ کا مصرف وہ آٹھوں قسمیں ہی نہیں ہیں بلکہ عام مساکین اسکا مصرف ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ہر مسکین کو ایک ایک مٹھی دیا جائے۔[3] نہ اس کے لئے حکم دیا ہے اور نہ کسی صحابی نے ایسا کیا ہے، اور نہ ان کے بعد والوں نے ایسا کیا ہے۔

نفلی صدقات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقات کے معاملہ میں سب انسانوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ نہ جمع کرتے تھے بلکہ تھوڑا بہت جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا تھا اُس کو خیرات کر دیتے تھے اور فقر کا بالکل اندیشہ نہیں کرتے تھے۔

---

[1] عید کی نماز سے پہلے صدقہ ادا کرنا افضل ہے۔ اور اگر بعد میں ادا کیا تب بھی جائز ہے، یہ نہیں ہے کہ بعد میں قضا ہو جائیگا جس طرح سے زکوٰۃ جب ادا کر دی جائے ادا ہو جاتی ہے یہی حال صدقہ فطر کا ہے۔ حدیث شریف کا منشا صرف اس قدر ہے غرباء کو اگر عید کی نماز سے قبل مل جائے تو ان کو بھی عید کی مسرتیں حاصل ہو جائیں گی بعد میں تو صرف صدقہ ہی رہے گا جس سے وہ غرض حاصل نہ ہو سکے گی جس کیلئے فرض کیا گیا ہے

[2] قربانی کے گوشت پر قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ وہ فریضہ کے واجب ہونے سے پہلے ادا کر دی گئی ہے صدقۃ الفطر کی یہ نوعیت نہیں ہے [3] کم از کم ایک مسکین کو بقدر ایک صدقۃ الفطر کے دیا جائے کم نہیں۔

آپ کے نزدیک صدقہ کرنا بہت زیادہ محبوب تھا۔ اس سے آپ کو بہت زیادہ فرحت ہوتی تھی، چنانچہ آپ بہت ہی زیادہ سخی تھے، اس معاملہ میں آپ چلتی ہوئی ہوا کی طرح تھے یعنی آپ کی فیاضی سے سب فیضیافتہ ہوتے تھے۔ جب آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آتا تو آپ اسکو ترجیح دیتے، چنانچہ کھانا، لباس جس چیز کی اُس کو ضرورت ہوتی عطا کر دیتے تھے

آپ کے عطایا مختلف اقسام کے تھے۔ کبھی بطور ہبہ، کبھی بطور ہدیہ، کبھی بطور صدقہ کبھی بطور قرضہ، کبھی ایسا ہوتا کہ بیچنے والے سے کوئی چیز خرید تے پھر سامان اور قیمت دونوں اُسی کو واپس کر دیتے تھے جیسا کہ حضرت جابر رضؓ کے ساتھ آپ نے کیا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ جس سے قرض لیتے۔ اسکو بعد میں اس سے زیادہ عطا فرما دیتے[1]، غرضکہ آپ ہر اُس چیز کے ذریعہ جو آپ کی ملک ہوتی لوگوں پر صدقہ کر دیتے اور ان کے ساتھ احسان فرماتے تھے۔

جب آپ کسی بخیل کو دیکھتے تو اس کو خرچ کرنے کی دعوت دیتے۔ اور لوگوں کو صدقہ، خیرات اور بھلائی کے کام کرنے کے لئے آمادہ کرتے تھے۔ اس معاملہ میں آپ کو تمام مخلوق میں سب سے زیادہ شرح صدر تھا۔

شرح صدر کے لئے صدقہ و خیرات، اور بھلائیوں کو بہت زیادہ دخل ہے ان کی بہت عجیب و غریب تاثیرات ہیں اللہ تعالیٰ نے اس شرح صدر کی اقسام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتمامہ و کمالہ عطا فرمائے تھے۔

اسباب شرح صدر کا بیان

شرح صدر کے منجملہ اسباب میں سے توحید الٰہی ہے چنانچہ اس میں جس قدر قوت ہوگی اسی قدر شرح صدر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

افمن شرح اللہ صدرہٗ للاسلام فھو علی نور من ربہ ۔ الآیۃ

وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے وہ اپنے رب کی ہدایت پر ہے۔

---

[1] یہ سود کی صورت نہیں ہے۔

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح	اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ ہدایت کا ارادہ
صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ	کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے
یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما	اور جس کو گمراہ کرتا ہے اُس کا سینہ تنگ کر دیتا
یصعد فی السماء	ہے گویا کہ وہ آسمان پر چڑھا چلا جا رہا ہے

بہرحال توحید الٰہی شرح صدر کا بہت بڑا سبب ہے اور شرک اور گمراہی تنگیٔ سینہ کا عظیم سبب ہے۔

یہ نور اللہ تعالیٰ جس کے قلب میں ڈال دیتا ہے، یہی نور ایمان ہے۔ اس سے سینہ کھل جاتا ہے قلب کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور جب یہ نور قلب میں نہیں ہوتا تو دل میں تنگی آجاتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کا سینہ تنگ و تاریک جیل خانہ ہے۔

امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

اذا دخل النور القلب انفسح	جب نور قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس میں
وانشرح قالوا وما علامۃ ذلک یا	کشادگی پیدا کر دیتا ہے۔ عرض کیا، یا رسول اللہ
رسول اللہ قال الانابۃ الی دار	اس کی کیا علامت ہے۔ ارشاد فرمایا آخرت
الخلد والتجافی عن دار الغرور	کی طرف توجہ دنیا سے بے رغبتی۔ موت کے
والاستعداد للموت قبل نزولہ	لئے ہر وقت آمادہ رہنا

بہرحال ہر بندہ کو بقدر ایمان شرح صدر حاصل ہوتا ہے یہی حال نورِ حسّی اور ظلمت حِسّی کا ہے۔

اسباب شرح صدر میں سے علم بھی ہے جس کو جسقدر علم ہے اسی قدر اس کو شرح صدر حاصل ہے اور جس قدر جاہل ہے اسی قدر اُس کا سینہ تنگ ہوگا، جس قدر علم میں وسعت ہوگی اُسی قدر اس کے سینہ میں کشادگی ہوگی۔ اور یہ خصوصیت ہر علم کی نہیں ہے بلکہ یہ خصوصیت صرف اسی علم کی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں ملا ہے

یہی علم نافع ہے، اسی علم کے علماء تمام انسانوں میں سب سے زیادہ فراخ دل ہوتے ہیں۔

اسبابِ شرحِ صدر میں سے رجوع الی اللہ اور اس کی محبت اور اس کی عبادت سے رغبت رکھنا بھی ہے، اس سے زیادہ کسی چیز سے شرحِ صدر نہیں ہوتا، آدمی دنیا ہی میں بیٹھے بیٹھے جنت میں ہوتا ہے۔ جتنا بھی محبت خداوندی میں اضافہ ہوتا ہے اُسی قدر سینہ میں کشادگی ہوتی ہے ایسے لوگوں کے سینہ میں گھٹن اُسی وقت ہوتی ہے جب باطل قسم کے لوگوں اور سیہ کاروں کو دیکھتے ہیں (گویا اُن کے قلوب پر اُن کی ظلمت کا عکس پڑتا ہے

تنگیٔ سینہ کے اسباب میں سے اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنا، اور قلب کا دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، ذکر اللہ سے غفلت ہے۔ جو بھی اللہ کے سوا کسی سے محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو اسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس آدمی سے زیادہ دنیا میں کوئی بدبخت نہیں ہوتا۔ دنیا اُس کی جنت اور نفس کی خوشی اُس کے دل کی لذت، اور اُس کی غذا ہوتی ہے۔

اسبابِ شرحِ صدر میں سے، ذکر اللہ پر ہر حال میں مداومت کرنا بھی ہے چنانچہ شرحِ صدر کے معاملہ میں ذکر اللہ میں عجیب و غریب تاثیر ہے، اور غفلت میں دل تنگ کرنے کی خصوصیت ہے۔

انھیں اسباب میں سے مخلوق کے ساتھ احسان کرنا بھی ہے، جس قدر بھی ممکن ہو سکے جان، مال، ہر قسم کا لوگوں کو نفع پہونچایا جائے۔ جو آدمی کریم اور محسن ہوتا ہے اُس کا سینہ بہت کشادہ ہوتا ہے، اور جو آدمی بخیل ہوتا ہے اُس کا سینہ سب سے زیادہ تنگ ہوتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل اور سخی کی مثال بیان فرمائی ہے۔

کمثل رجلین علیہما جنتان	جیسے وہ دو آدمی کہ جو لوہے کی ڈھال
من حدید کلما ھم المتصدق	اوڑھے ہوئے ہوں، جب صدقہ کرنے والا صدقہ
بصدقۃ اتسعت علیہ وانبسطت	کا ارادہ کرتا ہے تو وہ پھیل جاتی ہے یہاں تک کہ
حتی تجر ثیابہ ویعفی اثرہ و	اُس کے کپڑوں سے بھی تجاوز کر جاتی ہے اور

كلما هم البخيل بالصدقة لزمت كل حلقة مكانها ولم تتسع عليه

گھٹتی ہے اور جب بخیل صدقہ کا ارادہ کرتا ہے اس کے تمام کڑے آپس میں چپک جاتے ہیں اور کشادہ نہیں ہوتے ہیں۔

پس یہ مثال صدقہ کرنے والے مومن اور نہ صدقہ کرنے والے بخیل کی ہے۔

اسباب شرح صدر میں سے ایک شجاعت بھی ہے۔ شجاع آدمی کا دل بہت کشادہ ہوتا ہے اور بزدل آدمی بہت تنگ دل ہوتا ہے، ایسے آدمی کو بجز زندگی کی چیزوں کے کسی چیز سے نہ فرحت حاصل ہوتی ہے اور نہ سرور حاصل ہوتا ہے۔ روح کی لذت اور فرحت سے ہر بزدل محروم ہوتا ہے جیسا کہ بخیل محروم ہوتا ہے اور جیسا کہ حق سے غافل۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے ناواقف ہوتا ہے اُس کا دین غیر اللہ سے قلب کا تعلق ہوتا ہے۔ صاحب دل کے لئے یہ فرحت وخوشی، قبر میں جنت ہوتی ہے، اور ان تنگ دلوں کے لئے قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ بندہ کا حال قبر میں کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ قلب کی تنگی اور فراخی سے ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کسوٹی اور ترازو ہے۔

منجملہ اسباب کے یہ بھی ہے بلکہ سب سے بڑھ کر، کہ قلب میں سے کھوٹ اور کپٹ دور کیا جائے، اور عادات ذمیمہ سے قلب کو صاف کیا جائے۔ اس لئے کہ جب ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں کہ جن سے شرح صدر حاصل ہو تو یہ اخلاق ذمیمہ اس کے آڑے آتے ہیں اور قلب میں انشراح پیدا نہیں ہونے دیتے

اخلاق ذمیمہ آدمی میں چند چیزوں سے پیدا ہوتے ہیں، غلط نظر، غلط کلام بولنا اور سننا عوام کے ساتھ مخالطت، کھانا اور سونا، یہ فضولیات، بیجا تفکرات پیدا کرتے ہیں جس سے قلب تنگ ہوتا ہے۔ دینا و آخرت کا زیادہ تر عذاب اسی وجہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے کہ جس کا سینہ ان آفات میں سے کسی وجہ سے تنگ ہوا ہو، اس کی زندگی تنگ اور تاریک ہوتی ہے۔

بخلاف اس کے وہ آدمی انتہائی خوش نصیب ہے جس میں اچھی عادات ہیں۔ ان دونوں قسم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

ان الابرار لفی نعیم — بیشک ابرار لوگ نعیم میں ہیں

اور دوسری قسم کے بارے میں ارشاد ہے:۔

ان الفجار لفی جحیم — بدکار لوگ دوزخ میں ہیں

ان دونوں کے درمیان بہت سے تفرقِ مراتب اور درجے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمارا مقصود ان تمام باتوں سے یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام صفات میں جن سے شرح صدر حاصل ہوتا ہے۔ تمام مخلوق میں اکمل ترین ہیں۔ اور آپ کی اتباع کے بقدر آدمی کو انشراح صدر نصیب ہوتا ہے جس کو جبقدر خیر حاصل ہے اس میں خدا کی حمد کرنا چاہئے اور جس میں جبقدر برائی ہے اُس کو چاہئے کہ اپنے نفس پر ملامت کرے۔

تیئیسواں باب

روزوں کے بارے میں سیرت مبارکہ

اسرار الصوم روزہ سے مقصود نفس کو خواہشات سے روکنا اور اس کے مالوفات کو توڑنا، اور قوتِ شہوانیہ میں اعتدال لانا ہے تاکہ نفس میں ان چیزوں کی استعداد پیدا ہو جائے جن میں سعادت دارین ہے اور وہ پاکی حاصل ہو جائے جس سے حیات ابدیہ نصیب ہوتی ہے۔

جہاں بھوک و پیاس سے نفس کی حدت اور تیزی ختم ہوتی ہے وہاں بھوکے پیاسے مساکین کے حالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ اور کھانے پینے کے راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے شیطان کی گذرگاہیں بھی تنگ ہو جاتی ہیں اور حکم طبعی سے اعضاء کی قوتیں بھی ٹھہر جاتی ہیں جن سے بہت سی مضرتوں سے آدمی رُک جاتا ہے۔ چنانچہ تمام قوتوں میں ایک قسم کی لگام لگ جاتی ہے، یہی متقیوں کی لگام ہوتی ہے اور یہی مجاہدہ کرنے والوں کے لئے ڈھال ہے اور یہی مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے ریاضت ہے کیونکہ روزہ دار کا صرف یہی کام ہے کہ وہ تمام شہوات اور محبوبات نفس اور اس کے لذائذ سے رُک جائے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا غلبہ اُس پر ہو جائے۔ یہ ایک ایسا راز ہے کہ جس پر سوائے خدا کے کوئی آگاہ نہیں ہوتا ہے۔ انسان تو صرف ظاہری مفطرات صوم کو دیکھتے ہیں، لیکن کھانا پینا جس وجہ سے ترک کیا ہے اُس کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا ہے یہی روزہ کی حقیقت ہے۔

روزہ میں اعضا ظاہری اور قوت باطنی کی حفاظت کے بارے میں عجیب و غریب تاثیرات ہیں۔ روزہ انسان کے جسم کو تمام مواد فاسدہ سے پاک کر دیتا ہے جس سے تقویٰ کے لئے بہت بڑی مدد حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

یاایہا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔	ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

الصوم جنۃ	روزہ ڈھال ہے

آپ نے اس آدمی کو بھی روزہ رکھنے کا امر فرمایا ہے جس میں نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو اور اس پر شہوت کا غلبہ ہو، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ روزہ اس کے لئے ڈھال ہے
بہرحال روزہ کے مصالح عقول سلیمہ اور فطرت مستقیمہ کے نزدیک نہایت واضح ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر انتہائی کرم فرمایا کہ ان کے لئے روزہ مقرر فرمایا۔ (گویا روزہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے)

روزہ کی فرضیت

روزہ کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سب سے زیادہ اکمل ہے جس کی اتباع سے عظیم مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور انتہائی سہولت اور آسانی رہتی ہے۔ اور چونکہ روزہ نفس انسانی پر انتہائی شاق اور دشوار گذار ہوتا ہے اس لئے اس کی فرضیت اسلام کی درمیانی مدت بعد ہجرت کے ہوئی، چنانچہ جب نفوس انسانی توحید الٰہی اور نماز پر جم گئے اور اوامر قرآنی سے مانوس ہو گئے تو ان کو روزہ کی طرف بالتدریج لگایا گیا۔ اس طرح روزہ کی فرضیت سنہ ۲ھ میں ہوئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ رمضانوں کے روزے رکھے۔

روزہ کی فرضیت پہلے سال اختیاری تھی، جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے، وہ ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ پھر اس اختیار میں تبدیلی کر دی گئی۔ اس طرح کہ روزہ سب پر لازم کر دیا گیا۔ شیخ فانی اور عورت جو روزے کی طاقت نہ رکھتے ہوں ان پر فدیہ مقرر کر دیا گیا۔ مریض اور مسافر اور وہ حاملہ عورتیں جن کو روزہ سے ضرر ہو سکتا ہے ان کو رخصت دیدی گئی کہ وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ دوسرے موقعہ پر اس کی قضا کریں۔ اسی کے ساتھ روزہ کے لئے روزہ کی تین منزلیں اور تھیں ایک یہی اختیاری منزل دوسرے یہ کہ افطار سے قبل سو جانے کی حالت میں آئندہ رات تک کچھ کھایا پیا نہیں جا سکتا تھا تیسری منزل میں اس کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اور روزہ کو موجودہ حالت ملی جو قیامت تک باقی رہے گی۔

رمضان المبارک میں عبادت

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک ہی میں جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن پاک کا دور فرمایا کرتے تھے۔ جب جبرئیل علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوتی تو آپ تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔ آپ رمضان المبارک میں تمام انسانوں سے زیادہ سخی ہوتے تھے۔ آپ رمضان المبارک میں صدقہ، احسان، نماز، تلاوت قرآن پاک، ذکر اعتکاف میں کثرت فرما دیتے تھے۔

اعتکاف تو آپ صرف رمضان المبارک ہی کے مہینہ میں کرتے تھے دوسرے مہینوں میں نہیں۔ غرضکہ رمضان میں خصوصیت کے ساتھ اضافہ فرما دیتے تھے۔ کبھی کبھی رمضان میں مسلسل روزہ پر روزہ رکھ لیتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ اوقات عبادت میں مشغول ہو جائیں۔ لیکن آپ اپنے اصحاب کو صوم وصال سے منع فرماتے تھے وہ اگر کہتے تو ارشاد فرما دیتے۔

لست کمثلکم انی اظل عند ربی یطعمنی ویسقینی — میں تم جیسا نہیں ہوں، میں اپنے رب کے پاس سے کھاتا پیتا ہوں۔

اس کھانے پینے سے مراد کیا ہے؟ لوگوں کا اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول تو یہ ہے کہ یہی کھانا

پینا مراد ہے یہی معنی حقیقی ہیں، اس سے عدول کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد علوم و معارف، محبت اور شوق اور اس جیسی کیفیات ہیں کہ جن سے قلب کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ غذا اس قدر قوت رکھتی ہے کہ مدت دراز تک جسم کو کسی دوسری غذا کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جن لوگوں کو اس بارے میں ادنیٰ درجہ کا تجربہ یا شوق ہے وہ جانتے ہیں کہ جسم غذائے حیوانی سے اکثر مستغنی ہو جاتا ہے۔ خصوصًا جیسا کہ وہ شخص جو اپنے محبوب اور مطلوب کے ملنے سے مسرور اور خوش ہوتا ہے اور محبوب کی طرف سے اُس پر غایت درجہ الطاف و مہربانی اور توجہ ہوتی ہے، کیا یہ غذا نہیں ہے؟ بلکہ بہت بڑی غذا ہے خصوصًا وہ محبوب اعلیٰ و اکمل جب راضی اور خوش ہو اور غایت درجہ مہربان ہو کیا اُس کو یہ نہیں کہا جا سکتا ہے؟ "کہ میرا رب مجھے دن، رات کھلاتا ہے۔" اگر اُس کو ظاہری کھانے پینے سے تعبیر کیا جائے تو آپ کا روزہ دار ہونا ناممکن، اور اگر رات کو کھانا پینا مراد لیا جائے تو صوم وصال ناممکن ہے۔

صوم وصال

مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کی حدیث ہے کہ ایک رمضان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دن رات روزہ رکھنا شروع کیا، حضرات صحابہ رضؓ نے بھی یہی کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے ان کو منع فرمایا تو عرض کیا، آپ بھی تو رات دن روزہ رکھتے ہیں تب آپ نے ارشاد فرمایا" مجھے کھلایا پلایا جاتا ہے۔ بخاری شریف میں اس طرح ہے:۔

نہی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الوصال فقالوا انک تواصل قال رایکم مثلی ولست مثلکم انی اطعم و اسقیٰ	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے منع فرمایا تو عرض کیا آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا، تم میں میرا مثل کون ہے اور میں بھی تم جیسا نہیں ہوں، مجھے کھلایا پلایا جاتا ہے۔

(اور صیغہ مجہول کی صورت میں مجھے کھلایا پلایا جاتا ہے)

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے منع فرمایا تو مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے دریافت کیا۔ آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں، تو آپ نے فرمایا، تم میں مجھ جیسا کون ہے۔ مجھے تو کھلایا پلایا جاتا ہے۔ دوسری حدیث ہے۔ آپ نے صوم وصال سے منع فرمایا، تو لوگ باز نہیں آئے۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کے ساتھ روزہ رکھا، پھر اگلے دن، پھر اگلے دن، اتنے میں چاند رات ہو گئی۔ تب آپ نے فرمایا کہ اگر چاند رات نہ ہوتی تو میں اور رکھتا۔ دوسری روایت ہے اگر مہینہ اور دراز ہو جاتا تو میں اور روزہ رکھتا۔ مجھے میرا رب کھلاتا پلاتا ہے۔ بہرحال جہاں آپ نے صوم وصال رکھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی رکھا۔ آپ نے یہ صوم وصال صحابہ کو عاجز کرنے اور روکنے کے لئے بڑھا دیا تھا

آپ نے صحابہ کو جو صوم وصال سے روکا تو وہ امت کے لئے شفقت اور رحمت کی وجہ سے تھا۔ بخاری شریف میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث شریف ہے۔

لا تواصلوا فایکم اراد ان	تم لوگ صوم وصال نہ رکھو اور جو تم میں سے رکھنا
یواصل فلیواصل الی السحر	چاہے تو سحر تک رکھے (اور بس)

اگر یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ میں کیا حکم ہے۔ آیا صوم وصال جائز ہے یا حرام ہے یا مکروہ؟ تو لوگوں کا اس میں اختلاف ہے اور اس میں تین قول ہو گئے ہیں۔

ایک قول یہ ہے، اگر کوئی صوم وصال پر قادر ہے تو جائز ہے۔ یہی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور دوسرے بزرگوں سے مروی ہے۔ خود حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ صوم وصال رکھا کرتے تھے۔ اس مسلک کے حضرات کا کہنا ہے کہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے منع کرنے کے باوجود صوم وصال رکھا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے۔ اگر یہ ممانعت تحریم کے لئے ہوتی تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ایسا نہ کرتے۔ بلکہ یہ ممانعت رحمت اور تخفیف کی وجہ سے تھی جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے کہ:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الوصال رحمۃ لھم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے برنبائے شفقت منع فرمایا تھا۔

دوسری جماعت کہتی ہے کہ صوم وصال بالکل جائز نہیں ہے۔ یہی مسلک امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام ثوری کا ہے۔ ابن عبدالبر نے ان حضرات کے بارے میں بیان فرمایا ہے کہ یہ حضرات جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ امام شافعی صاحب رح سے اس بارے میں کراہت منقول ہے۔ البتہ ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی ہے۔ جو لوگ تحریمی کو فرماتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی موجود ہے، اور نہی تحریم کو چاہتی ہے ان حضرات نے حضرت عائشہ رض کے قول کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ مرحمت صرف ان کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری اُمت کے لئے تھی جس سے نہی کی تاکید ہو رہی ہے لیکن حضرات صحابہ رض کے ساتھ آپ کا بھی رکھنا، تنکیلاً (انکار کے طور پر تھا) نہ کہ اجازت کے طور پر۔ اور عملاً ان کو روکنا تھا کہ صوم وصال کے مفاسد معلوم ہو جائیں۔ پس جب حضرات صحابہ رض کو صوم وصال کا مفسدہ ظاہر ہو گیا کہ اس سے عبادات اور وظائف، دین اور ادائیگی حقوق میں کس قدر کوتاہی ہوتی ہے تو ان کو نہی کی حکمت معلوم ہو گئی نہ یہ کہ صوم وصال میں کوئی مفسدہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تھا۔ حضرات صحابہ رض کو صوم وصال پر منع کے بعد قائم رکھنے کی یہ حکمت اعرابی کے مسجد[1] میں پیشاب کرتے ہوئے باز رکھنے سے زیادہ تھی تاکہ وہ اسلام سے مانوس ہو جائے اور اس کے دل میں کسی قسم کی نفرت نہ بیٹھے۔ اور جیسا کہ ایک اعرابی سے بار بار آپ نے یہ کہہ کر

---

[1] ایک اعرابی آیا اور اس نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا شروع کر دیا تھا تو صحابہ رض نے اسکو روکنا چاہا تو آپ نے منع فرما دیا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو محبت سے پاس بلا کر سمجھایا کہ یہ مساجد اس کام کے لئے نہیں ہیں۔

پڑھوائی کہ۔ پڑھ کہ تو نے ابھی نماز نہیں پڑھی، ایسا آپ نے تعلیماً کیا تھا[۱]

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

اذا امرتکم بشیئٍ فاتوا منہ	جب میں کسی چیز کا تم کو حکم دوں تو حتی الامکان
ما استطعتم و اذا نہیتکم عن	اُس کو کرو، اور جب منع کروں تو اس سے
شیئٍ فاجتنبوہ	رُک جاؤ۔

علماء نے ذکر کیا ہے کہ صوم وصال جناب رسول اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔ اس لئے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ "میں تم جیسا نہیں ہوں، اگر اس کو مباح قرار دیا جائے تو یہ خصائص میں سے نہ ہوگا۔ بخاری و مسلم میں حدیث شریف موجود ہے۔

اذا اقبل اللیل من ھھنا و	جب رات اس جگہ آجائے اور دن اس
وادبر النہار من ھھنا وغربت	جگہ ہو جائے اور سورج چھپ جائے، تو
الشمس فقد افطر الصائم	روزہ دار افطار کرے۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی ایک دوسری حدیث اسی طرح اور ہے، بہرحال آپ نے دخول وقت افطار سے مفطر قرار دیا ہے۔ اگرچہ افطار نہ کرے اور یہ چیز وصال کے لئے مانع ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ "میری اُمت ہمیشہ خیر اور فطرت پر رہے گی جب تک وہ افطار میں جلدی کرتے رہینگے دوسری حدیث یہ ہے کہ" دین ہمیشہ غالب رہے گا۔ جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے، اس لئے کہ یہود و نصاری افطار میں تاخیر کرتے ہیں۔ سنن میں ایک حدیث

---

[۱] ایک اعرابی آیا اور اس نے جلد جلد نماز ادا کر کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام پیش کیا۔ آپ نے فرمایا نماز پڑھ، تو نے نماز نہیں پڑھی ہے۔ اسی طرح تین مرتبہ کرایا اور آخر میں بتلایا نماز اس طرح پڑھی جاتی ہے

قدسی ہے۔

احب عبادی الی اعجلھم فطراً — میرے نزدیک محبوب ترین بندہ وہ ہے جو افطار میں جلدی کرتا ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے، چہ جائیکہ افطار کو بالکل ترک کر دینا، اور جب مکروہ ہے تو عبادت نہیں ہے۔ اور کم سے کم درجہ عبادت کا یہ ہے کہ مستحب ہو مگر یہاں مستحب نہیں مکروہ ہے۔

تیسرا قول، ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ معتدل ہے۔ وہ یہ کہ صوم وصال سحر تک جائز ہے۔ یہی قول امام احمد صاحب اور اسحٰق کا ہے، کیونکہ حدیث شریف ہے۔

لا تواصلوا فایکم اراد ان یواصل فلیواصل الی السحر — صوم وصال نہ رکھو! اور اگر کوئی رکھنا چاہے تو سحر تک رکھے۔

(رواہ البخاری)

(یعنی سحر کے وقت ضرور بطور سحری کچھ کھا پی لے)

یہ روزہ سب سے زیادہ معتدل صوم وصال ہے۔ اور روزہ دار کے لئے آسان بھی ہے۔ یہ بھی بمنزلہ شام کے کھانے کے ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ذرا تاخیر سے کھالیا ہے۔ الخ

رویت ہلال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب تک رویت نہ ہو جاتی روزہ نہ رکھتے تھے اور اگر رویت نہ ہوتی تو ایک شاہد کی گواہی پر اکتفا فرماتے، جیسا کہ ایک مرتبہ آپ نے ابن عمرؓ کی شہادت پر اور ایک مرتبہ ایک اعرابی کی شہادت پر روزہ رکھا۔ آپ نے ان دونوں کی خبر ہی پر اعتماد کیا، اور لفظ شہادت ادا نہ کرایا[۱]۔ بہرحال

۱۔ امام اعظم ابوحنیفہ رح کا یہی مسلک ہے۔ اگر رمضان المبارک کا چاند کسی علت کی وجہ سے نہ دکھائی دے تو ایک عادل کی خبر پر روزہ رکھ لیا جائے۔

اگر یہ خبر ہے تو رمضان المبارک کے لئے صرف ایک خبر کافی ہے اور اگر شہادت ہے تو اس کے لئے لفظ شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔

اور اگر نہ رویت ہوتی اور نہ شہادت ہوتی تو اس صورت میں آپ شعبان کے تیس دن پورے فرماتے تھے۔ اور یہ اس صورت میں ہوتا جب کوئی بادل وغیرہ ہوتا اور رویت ثابت نہ ہوتی۔ ایسے دن نہ آپ خود روزہ رکھتے اور نہ روزہ رکھنے کا حکم دیتے۔ بلکہ شعبان کے تیس دن پورے کرنے کا امر فرماتے یہی آپ کا قول تھا، اور یہی آپ کا عمل تھا۔ اس کے یہ حدیث منافی نہیں ہے۔

فان غمّ علیکم فاقدروا لہ — اگر تم کو چاند نہ دکھائی دے تو حساب لگاؤ

قدر سے مراد حساب ہے اور اس سے مراد تیس دن پورے کرنا ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں مذکور ہے۔

فاکملوا عدۃ شعبان — شعبان کے دن پورے کرو

چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ بلا چاند دیکھے نہ روزہ رکھو! اور نہ بلا چاند دیکھے عید کرو، اگر چاند دکھلائی نہ دے تو شعبان کی گنتی پوری کرلو! یعنی تیس دن۔ اس سے زیادہ واضح ارشاد دوسرا ہے۔

مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ لہذا بلا چاند دیکھے نہ روزہ رکھو! اور نہ افطار کرو۔ اگر چاند نہ دکھائی دے تو مہینہ کی گنتی (تیس دن) پورے کرلو۔

یہاں لفظ کے اعتبار سے مہینہ کا اول مراد ہے اور معنی کے اعتبار سے مہینہ کا آخر مراد ہے، لہذا لفظ اور معنی دونوں میں سے کسی کو بھی لغو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے "مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے اور مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ اگر چاند نہ دکھائی دے تو تیس دن پورے کرو"۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے "رمضان المبارک سے قبل روزہ نہ رکھو! چاند دیکھ کر روزہ رکھو! اور ارشاد فرمایا ہے "مہینہ سے پہلے روزہ نہ رکھو! یہاں تک کہ چاند

نہ دیکھ لو۔ یا گنتی پوری نہ کرلو! حضرت عائشہ رضؓ ارشاد فرماتی ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کو اس قدر یاد رکھتے تھے کہ اتنا دوسرے مہینہ کو یاد نہیں رکھتے تھے۔ پھر آپ چاند دیکھ کر روزہ رکھتے۔ اگر بادل ہوتا تو شعبان کے تیس دن پورے فرماتے۔

اس حدیث کو دارقطنی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے

(نوٹ) اس جگہ ہم نے طوالت کی وجہ سے چار پانچ حدیثوں کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے ان کا ترجمہ اوپر آچکا ہے۔

سماک نے بروایت عکرمہ ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ فرمایا، ایک مرتبہ لوگوں میں چاند کے متعلق اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا آج ہے اور بعض نے کہا کل کو ہے۔ اتنے ہی میں ایک اعرابی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کیا تو گواہی دیتا ہے۔ ان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ اس نے کہا ہاں۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضؓ کو امر فرمایا کہ اعلان کردو کہ لوگ روزہ رکھیں۔

صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان غم علیکم فقدروا ثلاثین یوماً ثم صوموا ولا تصوموا۔ قبلہ یوماً

چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور چاند دیکھ کر افطار کرو، اگر کسی وجہ سے نہ دکھائی دے تو تیس دن پورے کرلو، پھر روزہ رکھو، اس سے پہلے ایک دن روزہ نہ رکھو!

یہ تمام احادیث صحیح ہیں۔ بعض حدیث صحیحین میں ہیں۔ بعض صحیح ابن حبان میں اگرچہ بعض احادیث میں علت ہے، مگر مجموعی طور پر صحت استدلال کے لئے مضر نہیں ہیں۔ بلکہ بعض بعض کے لئے تفسیر ہیں۔ اور ہر ایک سے دوسری کی تصدیق ہوری ہے۔ نتیجۃً متفق علیہ ہیں۔

یوم شک کا روزہ

اور اگر یہ کہا جائے جبکہ یہ آپ کی سیرت مبارکہ ہے تو حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابوہریرہؓ حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت حکم بن ایوب غفاریؒ۔ حضرت عائشہؓ، حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے اس کے خلاف کیوں کیا۔ اور سالم بن عبداللہ، مجاہد، طاؤس، ابو عثمان الہندی، مطرف ابن الشخیر میمون بن مہران، بکر بن عبداللہ المزنی نے کیوں خلاف کیا اور امام اہل حدیث حضرت احمد بن حنبل نے کیوں خلاف کیا۔ ان تمام کے اقوال سند کے ساتھ موجود ہیں

(۱) حضرت عمرؓ کا ارشاد سند کے ساتھ یہ ہے کہ جب اس رات میں آسمان پر کوئی ابر وغیرہ ہوتا تو وہ روزہ رکھ لیتے تھے، اور فرماتے یہ تقدم نہیں ہے بلکہ تحری ہے۔

(۲) حضرت علیؓ کا قول سند کے ساتھ امام شافعیؒ نے نقل کیا ہے کہ شعبان کی آخری تاریخ کا روزہ رکھنا میرے لئے اس سے بہتر ہے کہ میں رمضان کا کوئی روزہ ترک کردوں۔

(۳) حضرت ابن عمرؓ کی روایت مصنف عبدالرزاق میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگر آسمان ابر آلود ہو تو روزہ رکھوں گا۔ اور اگر آسمان صاف ہوا تو نہیں۔

صحیحین میں ان کی ایک دوسری روایت اور ہے اور وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ جب چاند دیکھو! اور جب دوسرا چاند دیکھو! تو افطار کردو! اگر نہ دکھائی دے تو گنتی پوری کرو۔ امام احمدؒ نے صحیح سند کے ساتھ کہا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ جب شعبان کے ۲۹ دن گذر جاتے تو چاند دیکھنے کے لئے کسی کو بھیجتے۔ اگر چاند دکھائی دے گیا تو بہتر روزہ رکھ لیتے اور اگر چاند نہ دکھائی دیتا اور مطلع بھی صاف ہوتا تو روزہ نہ رکھتے تھے۔ اور اگر مطلع صاف نہ ہوتا تو (یوم شک میں احتیاطاً) روزہ رکھ لیتے تھے۔

(۴) حضرت انسؓ کی روایت ہے جس کو امام احمد نے نقل کیا ہے کہ یحییٰ بن ابی اسحٰق کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نے ظہر کے وقت یا اس کے قریب چاند دیکھا تو بعض لوگوں نے افطار کردیا۔

ہم حضرت انسؓ کے پاس آئے اور ان کو چاند دیکھنے اور بعض لوگوں کے افطار کر لینے کی خبر دی تو فرمایا آج مجھے ۳۱ دن ہوتے ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ حکیم بن ایوب نے مجھے لوگوں کے روزہ رکھنے (یعنی رمضان شروع ہونے سے قبل) اطلاع بھیجی تھی کہ انھوں نے روزہ رکھ لیا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی لوگوں کی اتباع میں روزہ رکھ لیا اور ان سے اختلاف مناسب نہ سمجھا۔ اور آج میں اس دن کو رات تک پورا کر دوں گا۔

(۵) لیکن امیر معاویہ رضؓ کی روایت یہ ہے کہ جس کو امام احمد نے سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا میرے نزدیک شعبان کا ایک روزہ رکھ لینا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ میں رمضان کا کوئی روزہ ترک کروں۔

(۶) عمرو بن العاصؓ کی روایت بھی امام احمد نے ذکر کی ہے کہ عبداللہ بن ہبیرہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص، یوم الشک میں روزہ رکھا کرتے تھے۔

(۷) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے۔ ابو مریم کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے، رمضان سے ایک دن پہلے روزہ رکھنا میرے نزدیک اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ مجھ سے رمضان کا کوئی روزہ چھوٹ جائے۔ اس طرح روزہ فوت نہیں ہوتا۔ اور تاخیر میں فوت ہو جاتا ہے۔

(۸) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے وہ فرماتی ہیں، شعبان کے ایک دن کا روزہ رکھنا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اس سے کہ میں کوئی رمضان کا روزہ ترک کر دوں۔

(۹) اسماء بنت ابی بکرؓ کی روایت یہ ہے۔ فاطمہ بنت منذر کہتی ہیں، جب کبھی کسی وجہ سے چاند نہ دکھلائی دیتا تو حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ روزہ رکھتی تھیں اور اس کا امر بھی فرماتی تھیں امام احمد فرماتے ہیں حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق یوم شک میں روزہ رکھا کرتی تھیں۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ فضل بن زیاد کی سند سے ذکر کیا ہے۔ اثرم نے امام احمدؒ کا ارشاد نقل کیا ہے جب کبھی آسمان پر کوئی علت یا بادل ہوتا تو امام احمد روزہ رکھ لیا کرتے تھے

اور اگر مطلع صاف ہوتا تو روزہ نہیں رکھا کرتے تھے۔ اسی طرح سے ان کے بارے میں عبد اللہ اور مروزی نے نقل کیا ہے۔

آثار صحابہ کی تاویل

ان آثار کا جواب چند طرح پر دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ آثار میں صراحۃً وجوب صوم یوم شک کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو سیرت مقدسہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف خیال کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اس کو احتیاط پر محمول کیا جائیگا۔ کیونکہ حضرت انس رضؓ نے اس کی صراحت فرمادی ہے کہ انھوں نے امراء کی مخالفت سے بچنے کے لئے روزہ رکھا ہے، ایسا ہی امام احمدؒ نے بیان فرمایا ہے۔

الناس تبع للامام فی صومہ و افطارہ — لوگ افطار و صوم میں امام کے تابع ہوتے ہیں۔

اور جس قدر نصوص ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذکر کی ہیں، وہ دلالت کرتی ہیں کہ بادل کے دن روزہ رکھنا واجب نہیں ہے حرمت پر دلالت نہیں کرتی ہیں۔ لہٰذا جنھوں نے روزہ رکھا اُنھوں نے احتیاط پر عمل کیا ہے اور جنھوں نے نہیں رکھا اُنھوں نے جواز پر عمل کیا ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے، اگر یہ کہا جائے کہ بعض صحابہؓ روزہ رکھتے تھے اور بعض نہیں رکھتے تھے۔ یہ زیادہ صریح اور صحیح ہے جیسا کہ ابن عمرؓ روزہ رکھا کرتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے اسی قول کو احمد ابن حنبل اور طاؤس یمانی نے اختیار کیا ہے۔ اور ایسا ہی حضرت عائشہؓ حضرت اسماءؓ کے بارے میں مروی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ کسی نے حضرت ابن عمرؓ کا مسلک اختیار نہیں کیا، بلکہ یوم شک کے روزہ کی کراہت کے بارے میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت حذیفہ رضؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت انس رضؓ کا رجحان موجود ہے۔ میں کہتا ہوں، ان حضرات سے یوم شک میں نفلی روزہ کی ممانعت منقول

ہے۔ چنانچہ عمارؓ فرماتے ہیں :۔

من صام الیوم الذی یشك فیہ	جس نے یوم شک میں روزہ رکھا، اس نے
فقد عصی ابا القاسم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔

لیکن اگر کسی نے (یوم الشک میں بادل کی وجہ سے) احتیاطاً روزہ رکھ لیا کہ اگر رمضان ہے تو اس کا روزہ اور اگر نہیں ہے تو نفلی روزہ۔ اس بارے میں جہاں تک حضرات صحابہ رضؓ کا معاملہ ہے ان سے جواز منقول ہے۔

اور وہ فعل جو حضرت ابن عمر رضؓ اور حضرت عائشہ رضؓ کا مروی ہے اس کو رد کیا ہے کیونکہ اگر یہ عمل صحیح قرار دیا جائے تو انھوں نے اس کے خلاف حدیث نقل کی ہے۔ گویا ان کی حدیث میں یہ علّت پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے کیونکہ صوم یوم شک جب واجب نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ تو احتیاطاً روزہ رکھ لیتی تھیں، کیونکہ انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے یہی سمجھا تھا، انھوں نے اور حضرت ابن عمر رضؓ نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ جائز نہیں ہے۔ اس تاویل کے اعتبار سے تمام آثار اور احادیث میں اتفاق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضؓ کی یہ روایت، اس تاویل کی تائید کرتی ہے، روایت یہ ہے

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان
قال لھلال رمضان اذا رائیتموہ	کے چاند کے بارے میں فرمایا، جب اس کو دیکھو
تصوموہ واذا رائیتموہ فافطرہ	روزہ شروع کردو، اور جب اس کو دیکھو
فان غم علیکم فاقدروا لثلاثین	افطار کر لو۔ اگر چاند نہ دکھائی دے تو تیس دن
یوماً	پورے کرو۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضؓ نے یہ نہیں سمجھا کہ تیس دن پورے کرنا واجب ہیں بلکہ انھوں نے جواز ہی سمجھا ہے۔ کیونکہ جب انھوں نے ۳۰ تاریخ کو روزہ رکھ لیا تو گویا انھوں نے دو جائز چیزوں میں سے ایک کو اختیار کیا، اس کی تائید اسی سے ہوتی ہے

کہ حضرت ابن عمر رض نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کا یہ مطلب مراد نہیں لیا ہے۔

اقدروا لہ ثلاثاً و عشرین ثم صوموا — کہ ۲۹ دن پورے کرو پھر روزہ رکھو

اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابن عمر رض اپنے متعلقین اور غیر متعلقین سب کو روزہ کا امر فرماتے اور ایسا ہے نہیں۔

جہاں تک حضرت ابن عباس رض کا معاملہ ہے، وہ روزہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

لا تصوموا حتیٰ تروا الہلال — بلا چاند دیکھے نہ روزہ رکھو! اور نہ بلا
ولا تفطروا حتیٰ تروہ فان غم — دیکھے افطار کرو! اگر چاند نہ دکھائی دے تو
علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین — تیس دن پورے کرلو!

امام مالک نے اس روایت کو موطا میں حضرت ابن عمر رض کی روایت کے بعد ذکر کیا ہے گویا یہ اس کی تفسیر ہے۔ حضرت ابن عباس رض فرمایا کرتے تھے مجھے اس آدمی پر تعجب ہے جو مہینہ سے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ رکھتا ہے، حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

لا تقدموا رمضان بیوم ولا بیومین — رمضان سے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھو

گویا کہ حضرت ابن عباس رض نے حضرت ابن عمر رض کے ارشاد کو رد کیا ہے۔ بہرحال یہ دونوں صاحب امام ہیں، ان میں سے ایک صاحب شدت کی طرف مائل ہیں اور دوسرے رخصت پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا یہ مزاج دوسرے مسائل میں بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رض نے بہت سے مسائل میں شدت کو اختیار کیا ہے مثلاً وہ وضو میں، آنکھوں کے اندر پانی داخل کرنا ضروری قرار دیتے ہیں، اسی وجہ سے وہ نابینا ہو گئے تھے۔ وہ کانوں کا مسح نئے پانی سے کرتے تھے۔ حمام میں داخل ہونے سے منع کرتے تھے۔ اور حضرت ابن عباس حمام میں داخل

ہو جاتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ تیمم میں ایک ضرب چہرے کے لئے اور ایک ضرب ہاتھوں کے لئے کہتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں کے لئے ایک ہی ضرب کافی سمجھتے ہیں حضرت ابن عمرؓ عورت کا بوسہ لینے کے بعد وضو کیا کرتے تھے۔ اور جب حضرت ابن عمرؓ کی اولاد میں سے کوئی بچہ آتا تو اس کا بوسہ لیتے اور صرف کلّی کر کے نماز پڑھتے۔ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے مجھے ان کا بوسہ لینے سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ یہ تو خوشبو ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ تشدید اور احتیاط کو اختیار کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت نافع حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اذا ادرک مع الامام رکعۃ	جب وہ امام کے ساتھ ایک رکعت پاتے
اضاف الیھا اخری فاذا فرغ من	تو اس کے ساتھ دوسری رکعت اور ملا لیتے جب
صلوتہ سجد سجدتی السھو	نماز سے فارغ ہوتے تو دو سجدے سہو کے کرتے تھے۔

امام زہری فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا بھی ایسا کرتا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ سجدہ غالباً اس وجہ سے تھا کہ جب ان کو بعد رکعت جلسہ ملتا، حالانکہ جلسہ کا مقام بعد دو رکعت کے ہے۔

بہر حال حضرات صحابہؓ یوم شک کا روزہ واجب سمجھتے ہوئے نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ ان حضرات کا فرمانا ہے کہ شعبان کا ایک روزہ رکھنا رمضان کے ایک روزہ چھوڑنے سے زیادہ پسندیدہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ فرماتے کہ یہ رمضان کا روزہ ہے اور ہمارے لئے آج افطار جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرات استحباباً روزہ رکھا کرتے تھے۔ اور جو حضرات نہیں رکھتے تھے۔ .. .. اس سے جواز معلوم ہو رہا ہے کہ نہ رکھنا بھی جائز ہے حضرت ابن عمرؓ کے امام احمد نے چند مسائل ذکر کئے ہیں، مثلاً وہ فرماتے ہیں:۔

(۱) اگر میں پورے سال روزہ رکھوں تو یوم شک میں ضرور افطار کروں گا۔

(۲) لوگوں نے ان سے دریافت کیا، کیا ہم رمضان سے ایک روز قبل روزہ رکھ لیا کریں۔ فرمایا افسوس۔ افسوس، لوگوں کے ساتھ روزہ رکھو، تم میں سے کوئی آدمی مہینہ سے قبل روزہ نہ رکھے، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور چاند دیکھکر افطار کرو۔

حضرت علی رض، حضرت ابن مسعودؓ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ ان آثار کو پہلے آثار کے منافی اور معارض قرار دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان میں توافق کی صورت پیدا کر لی جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ روزے والے آثار کو احتیاط پر محمول کیا جائے نہ کہ وجوب پر۔ اور ان آثار میں وجوب کی صراحۃً نفی مذکور ہے۔ لہٰذا یہ تاویل قواعد شرع اور نصوص سے زیادہ قریب ہے۔ اور اس میں زیادہ سلامتی ہے۔ کیونکہ اس سے یوم شک اور یوم یقین میں مساوات لازم نہیں آتی۔ واللہ اعلم

رویت ہلال کے لئے شہادت

رمضان کے روزہ کے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک آدمی کی گواہی پر اکتفا فرمانے اور عید کے لئے دو آدمیوں کی گواہی لیتے۔ اگر ایسا اتفاق ہوتا کہ شاہد عید کا وقت گذرنے کے بعد چاند کے دیکھنے کی شہادت دیتے تو آپ خود بھی افطار فرماتے اور دوسروں کو بھی افطار کا حکم فرما دیتے تھے اور عید کی نماز اگلے دن اسی وقت پڑھتے جو نماز عید کا وقت ہوتا ہے [1]

---

[1] اثبات رویت کے لئے، رمضان المبارک کے علاوہ بقیہ تمام مہینوں کے لئے آسمان پر کوئی علت نہ ہونے کی صورت میں خبر مستفیض کو بھی نصاب شہادت کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے آج آلات جدیدہ (ریڈیو وغیرہ) کی وجہ سے چند برسوں سے یہ مسئلہ زیر بحث ہے، تاہم علماء کی اچھی خاصی تعداد، رویت ہلال کی ریڈیو پر، خبر کو اعلان کا درجہ دیتے ہوئے خبر مستفیض کے مثل (باقی ص۹۰ پر)

آپ کی عادت شریفہ تھی کہ افطار میں جلدی کرتے اور اسی کی ترغیب دیتے اور سحر میں تاخیر فرماتے اور اسی کی ترغیب دیتے تھے، اور آپ کھجور سے افطار کرنے کے لئے فرمایا کرتے تھے اور اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے افطار کو فرماتے تھے۔ یہ اُمت پر آپ کی کمال شفقت تھی۔ اس لئے کہ معدے کے خالی ہونے کی حالت میں میٹھی چیز کھانا زیادہ مفید ہے اور قوت پیدا کرتا ہے۔ خاص طور سے آنکھ کو قوت دیتا ہے۔ اور مدینہ منورہ کی مٹھائی صرف کھجور ہی ہے۔ اس میں غذا بھی ہے اور ایک قسم کا سالن بھی ہے

اور پانی سے اس وجہ سے افطار کرنے کو فرماتے، کہ جگر میں بھوک کی حالت میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے بھوک کی حالت میں اگر پہلے تھوڑا پانی پی لیا جائے اور پھر کھانا کھایا جائے تو بہت زیادہ مفید ہے۔ پانی اور چھوارے کے بارے میں یہ حکمت بالغہ، اطباء قلوب ہی کو معلوم ہے، دوسرے لوگ یہ خاصیت نہیں جانتے۔

حضور صلعم کے افطار کا بیان

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز سے قبل افطار فرماتے تھے۔ افطار کے وقت آپ یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اللّٰھم لک صمت وعلی رزقک افطرت فتقبل منا انک انت السمیع العلیم	اے اللہ میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا ہے اور تیرے رزق پر افطار کیا ہے تو ہم سے اس کو قبول فرما۔ تو سننے والا جاننے والا ہے۔

یہ بھی روایت ہے۔ اللّٰھم لک صمت وعلی رزقک افطرت» ابوداؤد نے

باقی حاشیہ ص۸۹) قرار دیتی ہے بہر حال مسئلہ مختلف فیہ اور زیر بحث ہے اس سلسلہ میں میرے چند فتاوی اور مضامین اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ میرا رجحان یہی ہے کہ ریڈیو کی خبر جو ذمہ دار حضرات کی طرف سے نشر کیجائے تو اسکی حیثیت خبر کی نہیں بلکہ اعلان کی ہے اور اس پر عمل کرنا جائز ہے۔ واللہ اعلم

یہ بھی روایت کی ہے :۔

ذھب الظمأ وابتلت العروق — پیاس ختم ہوگئی، عروق تر و تازہ ہوگئیں اجر
وثبت الاجر — ثابت ہوگیا، اگر اللہ نے چاہا۔

ان شاء اللہ تعالیٰ رواہ ابوداؤد

ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے "روزہ دار کے لئے افطار کے وقت کی دعا رد نہیں ہوتی ہے۔ یہ بھی آپ نے ارشاد فرمایا ہے "جب رات اس جگہ آجائے اور دن اس جگہ چلا جائے، تو روزہ افطار کا وقت ہو جاتا ہے" اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ حکماً افطار ہو جاتا ہے اگرچہ افطار نہ کرے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ دار کو، بُری باتوں اور بدکلامی سے منع کیا ہے۔ اور اگر کوئی کسی کو گالی دیدے تو اس کے جواب میں اسقدر کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں کہا گیا ہے کہ یہاں یہ الفاظ زبان سے کہنا مراد ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ .... دل میں یہ یاد رکھے کہ میں روزہ سے ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فرض روزہ میں زبان سے یہ الفاظ کہہ دے، اور نفلی روزے میں دل میں یہ خیال رکھے، اس لئے کہ نفلی روزہ اظہار کی چیز نہیں ہے۔

سفر میں روزہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں سفر کیا ہے۔ بعض مرتبہ آپ نے روزہ رکھا ہے اور بعض مرتبہ افطار کیا ہے اور آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اختیار دیدیا تھا کہ وہ ان دونوں میں سے جو چاہے اختیار کریں۔ اور جب کبھی دشمن سے مقابلہ کا موقع آجاتا تو آپ افطار کا حکم فرمایا کرتے تھے تاکہ جنگ کرنے میں قوت رہے اور اگر ایسی صورت کبھی حالت قیام میں پیش آجائے تو اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ روزہ نہ رکھا جائے۔ دلیل کے اعتبار سے یہی صحیح ہے۔ اسی کو علامہ ابن تیمیہ نے اختیار کیا ہے اور انھوں نے لشکر اسلام کو یہی فتویٰ دیا تھا جب دشمن سے دمشق میں مقابلہ کی صورت پیش آگئی تھی۔

اور اس میں بھی شک نہیں ہے کہ محض سفر کی حالت میں روزہ رکھنا افضل ہے۔ بہرحال حالتِ سفر میں افطار کی اجازت ہے اور جہاد کی صورت میں بھی افطار کی اجازت ہے ا۔ .. .. بلکہ جہاد کی صورت میں زیادہ مصالح ہیں۔ وہ مصالح سفر کی صورت میں نہیں ہیں کیونکہ جہاد میں سفر کے مقابلہ میں زیادہ مشقت ہے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ — کفار کے مقابلے کے لئے جہاں تک ہو سکے قوت حاصل کرو۔

اور افطار کرنا مقابلہ کے وقت زیادہ قوت کا باعث ہوتا ہے کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ "القوۃ بالرمی" قوت تیر پھینکنے میں ہے۔ اور یہ قوت بغیر افطار کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اس لئے کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ سے اس وقت فرمایا تھا جب وہ دشمن کے مقابلہ میں کھڑے تھے۔

قد دنوتم من عدوکم والفطر اقوی لکم — تم اپنے دشمنوں سے قریب ہو گئے (ایسی حالت میں) افطار کرنا تمہارے لئے زیادہ قوت کا باعث ہوگا۔

یہ بطور رخصت ارشاد فرمایا تھا، جب دوسری منزل میں اترے تو ارشاد فرمایا

انکم مصبحو عدوکم والفطر اقوی لکم فافطروا — صبح کو تم دشمن سے مقابلہ کرو گے، اس لئے افطار تمہارے لئے زیادہ قوت کا باعث ہے لہٰذا افطار کر دو

ان احادیث میں روزہ نہ رکھنے کی علت بیان فرمادی ہے۔ اس کے علاوہ ایک علت سفر بھی ہے جس کے لئے رخصت ہے، حاصل یہ ہے کہ جہاد میں سفر کے مقابلہ میں افطار کی زیادہ اہمیت ہے، کیونکہ وہاں زیادہ قوت کی احتیاج ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فتح مکہ کے موقعہ کا

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے۔

انه یوم قتال فافطروا — یہ جنگ کا دن ہے روزہ توڑ دو۔

اس حدیث میں سعد بن ربیع شعبہ کے تابع ہیں۔ دونوں نے یہی کہا ہے کہ یہاں افطار کا حکم قتال کی وجہ سے دیا تھا لیکن محض سفر کے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

انہ رخصة من اللہ فمن اخذ بھا فحسن ومن احب ان یصوم فلا جناح علیہ — (سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھنا) اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جس نے اس کو اختیار کیا بہتر اور جس نے روزہ رکھنا پسند کیا تو کوئی حرج نہیں ہے [1]

رمضان شریف کے غزوات

سب سے بڑا غزوہ جس کے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر اختیار کیا، وہ غزوہ بدر اور غزوہ فتح ہے۔" حضرت عمر رض فرماتے ہیں کہ ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو غزوات رمضان میں کئے ہیں، غزوہ بدر اور غزوہ فتح ہم نے ان دونوں میں روزہ نہیں رکھا۔

دار قطنی نے حضرت عائشہ رض کی حدیث روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان المبارک میں عمرہ کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے"۔ لیکن یہ روایت غلط ہے۔ اس میں جس قدر بات درست ہے وہ درست ہے۔ حضرت ابن عمر رض فرماتے ہیں:۔

اعتمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رجب — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں عمرہ کیا

---

[1] حنفیہ کے یہاں سفر کی حالت میں روزہ رکھنا افضل ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں اللہ تعالیٰ ابو عبد الرحمٰن پر رحم فرمائے" کیونکہ جس قدر بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرے کئے ہیں، ان سب میں ہمراہ تھی۔ آپ نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا۔

مقدار سفر جس میں رخصت ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بارے میں کوئی سیرت مبارکہ نہیں ہے کہ آپ نے افطار صوم کے لئے کوئی مقدار سفر مقرر فرمائی ہو۔ اس مسئلہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبیؓ نے تین میل کے سفر میں افطار کر لیا تھا۔

مقدار سفر کتنے تعجب کی بات ہے کہ علامہ نے کس طرح انکار کر دیا کہ مقدار سفر کے بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور استدلال میں حضرت وحیہ کلبی کی حدیث پیش کر دی جس کے ایک راوی ابو الخیر مرشد ہیں جن کو ابن مدینی اور ابن خزیمہ نے مجہول قرار دیا ہے۔ اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے بذل صفحہ ۶۵ ج ۳۔ حقیقت حال یہ ہے کہ مقدار سفر میں اختلاف ہے حنفیہ کے نزدیک تین دن کی مسافت ہونا چاہیے، جس کی دوری ۴۸ میل قرار دی ہے۔ حنفیہ نے سفر کی یہ مقدار، حدیث مسح علی الخفین سے مقرر کی ہے جس کو بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ اور اس پر اجماع بھی ہے حدیث شریف میں تین دن کے سفر کرنے والے کو مسافر کہا ہے۔ لہذا آیات اور احادیث میں جہاں جہاں مسافر یا سفر کا ذکر ہے، اس سے یہی سفر مراد ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مسح علی الخفین میں مقدار سفر کچھ ہو اور قصر صلوٰۃ میں مقدار سفر کچھ ہو۔ اور افطار صوم میں مقدار سفر کچھ اور ہو۔ علامہ کے استدلال میں یہی اضطراب ہے۔ یہاں داؤد ظاہری کے مسلک کو اختیار کر لیا اور قصر صلوٰۃ میں دوسرے آئمہ کی راہ اختیار کی۔

حضرت وحیہ کلبی کی حدیث میں خود ان ہی کے الفاظ میں اختلاف موجود ہے کہ ان کا ایک ٹیمی جماعت نے اس بارے میں ساتھ نہیں دیا کیونکہ ادنیٰ درجہ کی حالت ہجرت کو سفر قرار دیا جائے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بقیع، قبا وغیرہ تشریف لے جاتے رہتے تھے (باقی ص ۹۵ پر)

اورجنھوں نے روزہ رکھ لیا تھا، ان سے کہا تھا:-

رغبوا عن ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم — انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کیا ہے۔

اورحضرات صحابہؓ جب سفر کی ابتدار فرماتے تو روزہ نہیں رکھتے تھے۔ خواہ وہ اپنے گھروں سے ابھی خارج نہ ہوئے ہوں۔ چنانچہ ان کے آثار موجود ہیں جن میں انھوں نے فرمایا ہے کہ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ جیسا کہ عبید بن جبر کہتے ہیں کہ میں ابوبصرۃ غفاریؓ کے ساتھ ایک کشتی میں سوار ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ ابھی ہم بستی سے نکلے بھی نہیں تھے کہ دسترخوان طلب فرمایا، اور مجھ سے فرمایا آؤ! میں نے کہا ابھی تو بستی کے گھر دکھلائی دے رہے ہیں تو فرمایا

اترغب عن سنۃ رسول اللہ علیہ وسلم — کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کرتے ہو۔

اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے[1]۔ لیکن امام احمد کے الفاظ یہ ہیں۔ میں ابوبصرۃؓ کے

(صفحہ ۹۴ کا باقی) جب آپ کو کسی نے بھی ادنیٰ درجہ کی مسافت پر افطار کرتے نہیں دیکھا تو انھوں نے اختلاف کیا۔ لہذا یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔ البتہ حنفیہ کے مسلک کی تائید میں بکثرت احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ یہ بات غلط ہے کہ کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے البنایہ صفحہ ۱۳۲۸۔ مرقاۃ صفحہ ۲۷۶ ج ۵۔ تفسیر مظہری صفحہ ۱۹ ج ۱۔ بذل صفحہ ۱۶۵ ج ۳

[1] اس حدیث کی شرح کئی طرح کی ہے۔ بہترین شرح یہ ہے کہ ابوبصرۃؓ فسطاط (خیمے اور ان کے ڈیرے) میں بطور مہمان تھے۔ ویسے مسافر تھے مقیم یا مسافر اگر ہونے والی صبح کو سفر کی نیت رکھتا ہو تو اس کے لئے افطار جائز ہے لیکن اگر سفر کی نیت نہیں تھی اور صبح کو سفر شروع کر دیا تو آبادی کے گھروں سے نکلنے کے بعد افطار جائز ہے۔ بعض احادیث میں مقام سفر کا نام بھی ذکر کر دیا ہے، جیسا کہ امام احمد کی روایت میں موجود ہے۔ بذل صفحہ ۱۶۵ - ج ۳

ساتھ رمضان المبارک کے مہینہ میں فسطاط سے اسکندریہ کی طرف سفر کرنے کے لئے کشتی میں سوار ہوا۔ جب ہم مقام لنگراندازی کی جگہ پہونچے تو دسترخوان طلب فرمایا۔ میں نے کہا، ابھی تو ہمارے گھر دکھائی دے رہے ہیں۔ فرمایا نہیں۔ آپ کھائیے! بہرحال جب تک ہم منزل مقصود تک پہونچے روزہ نہیں رکھا۔

محمد بن کعب کہتے ہیں کہ ہم رمضان کے مہینہ میں حضرت انس بن مالکؓ کے پاس آئے وہ سفر کا ارادہ کر رہے تھے۔ سواری کا جانور تیار رکھا لباس سفر پہن چکے تھے۔ اسی حال میں انھوں نے کھانا طلب فرمایا۔ میں نے ان سے کہا کیا یہ سنت ہے؟ فرمایا ہاں یہ سنت ہے۔ اور یہ فرما کر سوار ہو گئے۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اس روایت میں دار قطنی نے اس قدر اور اضافہ کیا ہے کہ غروب شمس کا وقت قریب تھا کہ انھوں نے کھانا تناول فرمایا تھا۔ ان تمام آثار میں اس قدر صراحت ہے کہ جو شخص اثنائے یوم میں سفر کا ارادہ کرے، اس کو افطار کرنے کا حق ہے۔

جنابت کی حالت میں روزہ

بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ فجر ہو چکی ہوتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل کی حاجت ہوتی تھی اور آپ روزہ سے بھی ہوتے تھے۔ آپ روزہ کی حالت میں اپنی ازواج مطہرہ کا بوسہ بھی لے لیتے تھے۔ آپ نے روزہ دار کے بوسہ لینے کے بارے میں فرمایا ہے، وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ پانی سے کلی کر لی (یعنی جس طرح منہ میں پانی لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ایسے ہی بوسہ لینے سے نہیں ٹوٹتا۔ لیکن ابو داؤد نے مصدع بن یحییٰ کی سند سے حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبلھا وھو صائم ویمص لسانھا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں اُن کا بوسہ لے لیا کرتے تھے اور ان کی زبان بھی چوس لیتے تھے۔

اس حدیث میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے مصدع کو ضعیف کہا ہے۔ سعدی نے

کہا ہے کہ مصدرع راستہ سے ہٹ گئے۔ ایک جماعت نے ان کی تحسین کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ثقہ ہیں۔ امام مسلم نے بھی ان کی روایت اپنی صحیح میں نقل کی ہے اور اس کی سند میں محمد بن دینار بصری ہیں جن کے بارے میں بھی اختلاف ہے یحییٰ بن معین نے کہا ہے وہ ضعیف ہیں ان ہی سے یہ بھی منقول ہے "کوئی حرج نہیں ہے"، بعض دوسرے حضرات نے ان کی تصدیق کی ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے کہ روایت میں لفظ "ویمص لسانھا" اُس کو صرف محمد بن دینار نے روایت کیا، اس کی سند میں سعد بن اوس ہے جس کے بارے میں اختلاف ہے یحییٰ بصری نے کہا ہے، ضعیف ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے کہ وہ ثقہ ہیں۔ اور ابن حبان نے بھی اُس کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے ایک روایت حضرت میمونہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آزاد کردہ باندی) سے نقل کی ہے کہ

سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل قبل امراتہ وھما صائمان، فقال قد افطر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی عورت کا حالت صوم میں بوسہ لیا تھا، فرمایا روزہ ٹوٹ گیا۔

یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس میں ابو یزید الضبی ہیں جس نے میمونہ سے روایت کیا ہے وہ میمونہ بنت سعد ہیں دارقطنی نے کہا یہ معروف نہیں ہے۔ اور یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ بخاری نے کہا کہ میں یہ حدیث روایت نہیں کرسکتا یہ منکر ہے اور ابو یزید رجل مجہول ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں بوڑھے، جوان میں کوئی فرق نہیں کیا ہے (دونوں کے بارے میں یکساں حکم ہے) ان تمام احادیث میں ابو داؤد کی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ نے کہا ہے کہ ایک آدمی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور روزہ میں مباشرت[1] کرنے کے بارے میں پوچھا آپ نے اس کو اجازت دیدی اور دوسرا آیا تو آپ نے اُس کو منع فرمادیا

---

[1] یہاں مباشرت سے مراد وطی کرنا نہیں ہے۔

جس کو اجازت دی تھی وہ بوڑھا تھا اور جس کو منع کیا تھا وہ جوان تھا۔" بخاری و مسلم نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور اصحاب ستہ نے اُس کو نہیں لیا ہے۔ کیونکہ اُس کی سند میں ابو العنبس ہیں جو عدوی ہیں اور کوفی ہیں۔ نام ان کا حارث بن عبید ہے۔ محدثین نے ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے [1]

بھول کر کھا پی لینا

جو آدمی بھول کر کچھ کھا پی لے اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے :-

ان اللہ سبحانہ ھو الذی اطعمہ وسقاہ — اللہ تعالیٰ نے اس کو کھلایا پلایا ہے۔

لہٰذا بھول کر کھا پی لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، یہ تو ایسے ہی ہے گویا نیند میں کھا پی لیا۔ اور نیند والا مکلف نہیں ایسے ہی (کھا لینے والا) مکلف نہیں۔

وہ چیزیں جن سے روزہ ٹوٹتا ہے

کھانے، پینے، پچھنے[2] لگوانے، قے[3] کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ قرآن پاک میں دلالۃً موجود ہے کہ جس طرح کھانے پینے سے روزہ ٹوٹتا ہے ایسے ہی جماع سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس میں کسی کا خلاف موجود نہیں ہے۔ صحیح طور پر سرمہ کے بارے میں کوئی روایت ثابت[4] نہیں ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ آپ روزہ کی حالت میں مسواک کر لیا کرتے تھے۔ امام احمد نے ذکر کیا ہے کہ آپ روزہ کی حالت میں سر پر پانی بہایا کرتے تھے۔ اور روزہ کی حالت میں کلی

---

[1] روزہ کی حالت میں اپنی اہلیہ کا بوسہ لینا جائز ہے، اگر انزال کا اندیشہ نہ ہو [2] یہی امام شافعی صاحب کا مسلک ہے اسی کو علامہ نے اختیار کیا ہے حنفیہ کے نزدیک پچھنے لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ان کا استدلال، حدیث عکرمہؓ ہے جو انھوں نے ابن عباس سے نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ بذل ج ۱/۳۱۳ [3] حنفیہ کے نزدیک قے کرنے یا ہونے سے روزہ نہیں (باقی ص ۹۹ پر)

بھی کر لیا کرتے تھے اور ناک میں پانی بھی دے لیا کرتے تھے (یہ دونوں چیزیں وضو میں مسنون ہیں) البتہ روزہ دار کو اس بارے میں مبالغہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ سے صحیح طور پر ثابت نہیں ہے کہ آپ نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوائے ہیں، لیکن امام بخاری نے جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ ؎

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم احتجم وھو صائم محرم	آپ نے اس حال میں پچھنے لگوائے کہ آپ روزہ دار بھی تھے اور محرم بھی تھے۔

راوی کہتا ہے میں نے امام احمد سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا یہ صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث کا انکار یحییٰ بن سعید انصاری نے بھی کیا ہے۔ اور میمون مہران (شاگرد ابن عباس) کی پندرہ حدیثیں روایت کی ہیں۔ اثرم نے کہا ہے کہ میں نے ابو عبداللہ سے سُنا ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو ذکر کیا اور پھر کہا یہ ضعیف ہے۔ اور کہا کہ میں نے امام احمد سے قبیصہ والی حدیث جو انھوں نے سعید بن جبیر کے واسطے سے حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے اس میں ہے کہ حضور صلعم نے پچھنے روزہ اور احرام کی حالت میں لگوائے ہیں فرمایا قبیصہ نے خطا کی ہے۔ اور میں نے یحییٰ سے قبیصہ کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا "آدمی تو صادق ہے، مگر اس حدیث میں خطا ہو گئی ہے"۔ امام احمد نے "اشجعی کی کتاب میں

(باقی حاشیہ صفحہ ۹۸) ٹوٹتا، تا وقتیکہ کوئی چیز واپس نہ لوٹ جائے۔ ابو داؤد شریف میں حدیث ہے جس نے روزہ کی حالت میں قے کی اس پر قضا نہیں ہے۔ یعنی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ دوسری حدیث ہے تین آدمیوں کے روزے نہیں ٹوٹتے۔ ان میں سے ایک قے کرنے والا بھی ہے۔ بذل صفحہ ۱

؎ یہ بھی غلط ہے بلکہ امام ترمذی نے اپنی جامع میں روایت نقل کی ہے علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ رات کو سوتے وقت سرمہ لگانے کی تھی لیکن حضرت انسؓ روزہ کی حالت میں دن میں سرمہ لگا لیا کرتے تھے بذل صفحہ ۱۲۹ (حاشیہ صفحہ ھذا) بخاری شریف کی حدیث چونکہ علامہ کے مطابق نہیں ہے اس لئے اسکی صحت سے بھی انکار ہے۔ المجیب

سعید بن جبیر سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ " جناب رسول اللہ صلعم نے احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے" اس میں روزہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ چنانچہ جب میں نے امام احمد سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا " روزہ کا ذکر نہیں ہے" چنانچہ اسی کو سفیان نے طاؤس کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ " جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سر پر پچھنے لگوائے تو وہ محرم تھے" اسی کو عبدالرزاق نے سعید بن جبیر کی سند سے ابن عباس سے روایت کیا ہے، اور روح نے بھی طاؤس کی سند سے ابن عباس سے یونہی ذکر کیا ہے۔ ابن عباس کے ان تمام شاگردوں نے " صائماً " ذکر نہیں کیا جنس نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے بعد

افطر الحاجم والمحجوم — پچھنے لگانے اور لگوانے والا دونوں غطرہ گئے

آپ نے پچھنے لگوائے تھے اس حدیث کی سند میں " رجل " سے مراد ابان ابی عباس ہیں اور وہ قابل حجت نہیں ہیں۔ اثرم کہتے ہیں میں نے ابو عبداللہ سے کہا کہ محمد بن معاویہ نے سدی کے واسطہ سے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ تو اس روایت کا انکار کیا اور سدی کے حضرت انسؓ سے روایت کرنے پر تعجب کیا۔ امام احمد نے (اوپر والی حدیث) افطر الحاجم الخ کے بارے میں کہا یہ حدیث ثابت نہیں ہے اور امام اسحق نے اس کو پانچ طریقوں سے ثابت کیا ہے۔ ماحصل کلام یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی حالت میں پچھنے نہیں لگوائے۔ اور آپ سے یہ بھی ثابت نہیں ہے کہ دن کے شروع حصہ میں روزہ کی حالت میں مسواک کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ اس کے خلاف موجود ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا

خیر خصال الصائم السواک — روزہ دار کی بہترین خصلت مسواک کرنا ہے

اور اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس میں ضعف ہے[1]۔

روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا

آپ نے روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا ہے چنانچہ مروی ہے کہ آپ رمضان المبارک میں حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لائے اور آپ کی چشم مبارک میں اِثمد لگا ہوا تھا۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے بلکہ یہ مروی ہے کہ روزہ دار کو سرمہ لگانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ابوداؤد نے کہا ہے یہ حدیث منکر ہے[2]۔

آپ کے نفلی روزے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفلی روزوں کے بارے میں مروی ہے کہ آپ جب روزہ رکھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ اب روزہ ہی رکھتے رہیں گے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ آپ اب روزہ نہیں رکھیں گے آپ نے رمضان المبارک کے علاوہ کسی پورے مہینہ کے روزے نہیں رکھے۔ اور شعبان کے مہینہ میں اکثر روزے سے رہتے تھے۔ اور کوئی مہینہ ایسا بھی نہیں گذرتا تھا کہ جس میں آپ روزہ نہ رکھتے ہوں۔ اور آپ نے کبھی مسلسل تین مہینوں کے روزے نہیں رکھے، جیساکہ بعض لوگوں کی عادت ہے۔ آپ نے رجب کے مہینہ میں کبھی روزہ نہیں رکھا بلکہ رجب کے مہینہ میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ اکثر دو شنبہ اور جمعرات کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ ہمیشہ ایام بیض کے روزے رکھا کرتے تھے سفر حضر کسی حالت میں بھی ان روزوں کو نہیں چھوڑا۔ اس کو امام نسائی نے ذکر کیا ہے۔ آپ نے کبھی ان روزوں کو نہیں چھوڑا اس کو امام نسائی نے ذکر کیا ہے۔ آپ ہمیشہ ان روزوں کے رکھنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے[3] حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں آپ ہر مہینہ کے شروع میں تین روزے رکھا

---

[1] حنفیہ کے نزدیک، روزہ کی حالت میں مسواک کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ افضل ہے [2] یہاں تک جو احادیث گذری ہیں۔ ان کے متعلق گذشتہ حاشیہ میں ذکر کر چکے ہیں [3] ہر مہینہ کے تین روزے رکھنا اس وجہ سے تھا تاکہ پورے مہینہ کا بدل ہو جائے کیونکہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔

کرتے تھے۔ اس کو ابوداؤد اور نسائی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ آپ نے مہینہ کے کون سے حصے میں روزے رکھے ہیں۔ اس کو امام مسلم نے ذکر کیا ہے۔ لیکن ان آثار میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

عشرہ ذی الحجہ کے روزوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں۔ میں نے عشرہ ذی الحجہ میں کبھی آپ کو روزے سے نہیں دیکھا۔ اس کو امام مسلم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حفصہ رض فرماتی ہیں "چار چیزیں آپ نے کبھی ترک نہیں کیں۔ عاشورہ کا روزہ، عشرہ ذی الحجہ کے روزے، ہر مہینہ کے تین دن کے روزے، سنت فجر" اس کو امام احمد نے ذکر کیا ہے اور انھوں نے بعض ازواج سے بھی نقل کیا ہے "آپ ۹ ذی الحجہ کو روزہ رکھتے اور صوم عاشورہ، ہر مہینہ کے تین روزے، پیر اور جمعرات کا روزہ رکھا کرتے تھے" اور یہ اصولی بات ہے کہ مثبت، منفی سے مقدم ہوتا ہے۔

شوال کے چھ روزوں کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ چھ روزے رمضان المبارک کے ساتھ مل کر پورے سال روزے رکھنے کا بدل بن جاتے ہیں[1]۔ صوم عاشورہ کے روزہ کو آپ تمام دنوں کے روزوں پر فوقیت دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہود اس دن کی عظمت کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا میں تمہارے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زیادہ حقدار ہوں، چنانچہ آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھنے کے لئے امر بھی فرمایا۔ اور یہ صورت حال رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت سے قبل تھی۔ لیکن جب رمضان المبارک کے روزے فرض قرار دیئے گئے تو آپ نے اختیار دیدیا کہ جس کا جی چاہے رکھے اور جس کا

---

[1] پورے سال کا بدل اس طرح کہ سال میں ۳۶۰ دن ہوتے ہیں اور ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔ چنانچہ رمضان کے ۳۰ روزوں کا ثواب برابر ۳۰۰ روزوں کے اور ان ۶ روزوں کا ثواب برابر ۶۰ روزوں کے ہوا۔

جی چاہے نہ رکھے۔

صوم یوم عاشورہ

بعض لوگوں نے اس پر اشکال وارد کیا ہے کہ آپ مدینہ منورہ میں ربیع الاول کے مہینہ میں تشریف لائے تھے لہٰذا حضرت ابن عباس نے یہ کیسے فرما دیا کہ "جب آپ مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کو روزہ رکھتے پایا" اور اس میں ایک دوسرا اشکال بھی ہے وہ یہ کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں "قریش زمانہ جاہلیت میں عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے، اور آپ بھی عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے روزہ کا امر فرمایا لیکن جب رمضان المبارک کے روزے فرض ہو گئے تو آپ نے فرمایا "جو چاہے رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔

تیسرا اشکال یہ ہے کہ حضرت اشعث بن قیس، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئے وہ ناشتہ فرمارہے تھے فرمایا، ابوعبداللہ آپ بھی ناشتہ میں شریک ہو جائیے۔ انھوں نے جواب دیا۔ کیا آج یوم عاشورہ نہیں ہے؟ اس کے جواب میں حضرت ابن مسعود نے فرمایا "کیا ہوا؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کی فرضیت نازل ہونے سے قبل رکھا کرتے تھے۔ جب رمضان المبارک کے روزوں کا حکم ہوا تو آپ نے اس کو ترک کردیا

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت موجود ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور اس کا امر فرمایا تو لوگوں نے عرض کیا حضور! اس دن کی تو یہود تعظیم کرتے ہیں[1]۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا انشاء اللہ آئندہ سال نویں کا بھی روزہ رکھوں گا لیکن سال آئندہ آپ اس سے قبل وصال فرما گئے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوم عاشورہ کا معاملہ وفات سے صرف ایک سال قبل کا ہے اور گذشتہ حدیث سے یہ

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایام جن کو دوسرے مذاہب والے مانتے ہیں اور ان کو بڑا دن سمجھتے ہیں مسلمانوں کو ان میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

معلوم ہو رہا ہے کہ یہ معاملہ مدینہ منورہ کی آمد کے وقت کا ہے۔ اور پھر ابن مسعودؓ نے خبر دی ہے کہ آپ نے رمضان کی فرضیت کی وجہ سے اُس کو ترک کر دیا تھا۔ یہ بات حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے بالکل خلاف ہے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ آپ نے فرض کو ترک کر دیا تھا۔ صحیحین میں حدیث شریف ہے۔

هذا یوم عاشوراء ولم یکتب الله علیکم صیامه وانا صائم فمن شاء فلیصم ومن شاء فلیفطر

یہ عاشورہ کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا روزہ تمہارے اوپر فرض نہیں کیا ہے۔ اور میں روزے سے ہوں لہٰذا جس کا جی چاہے رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔

اس کے راوی حضرت معاویہ ہیں جن کے بارے میں یہ طے ہے کہ انھوں نے فتح مکہ کے بعد سنا ہے۔

چوتھا اشکال یہ ہے کہ امام مسلم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا یہ عاشورہ کا دن ہے اور یہودی اور نصرانی اس کی تعظیم کرتے رہیں تب آپ نے ارشاد فرمایا، اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو ۹ تاریخ کا روزہ ضرور رکھوں گا لیکن سال آئندہ آپ کی وفات ہو گئی، پھر امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ میں ابن عباسؓ کے پاس حاضر ہوا وہ زمزم کے پاس چادر اوڑھے بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے عاشورہ کے روزے کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا "جب تم محرم کا چاند دیکھو تو ۹ دن شمار کرو اور ۹ تاریخ کا روزہ رکھو! جناب رسول اللہ علیہ وسلم کا روزہ ایسے ہی تھا"

پانچواں اشکال یہ ہے کہ اگر صوم عاشورہ ابتدائے اسلام میں فرض یا واجب تھا تو فوت ہونے کی صورت میں آپ نے قضا کا حکم نہیں دیا۔ اور اگر فرض نہیں تھا تو بقیہ دن امساک (روزہ) کا حکم کیوں دیا ہے جیسا کہ مسند اور سنن میں متعدد طریقوں سے مروی ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ جس کسی نے کھا پی لیا ہو بقیہ دن ٹھہرا رہے،، یہ خصوصیت تو واجب یا فرض کی ہوتی

ہے پھر حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول :۔

فلمّا فرض رمضان ترکہٗ عاشورا	جب رمضان کی فرضیت ہوئی تو اس کو چھوڑ
واستحبابہ۔ لم یترکہٗ	دیا گیا اور اس کا استحباب ترک نہیں ہوا۔

کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

چھٹا اشکال یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے عاشورہ کا روزہ ۹ تاریخ کو قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں خبر دی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روزہ یہی تھا۔ چنانچہ روایت بھی موجود ہے :۔

صوموا یوم عاشوراء وخالفوا الیھود	عاشورہ کا روزہ رکھو اور یہود کی اس طرح
وصوموا یومًا قبلہ و یومًا بعدہ	مخالفت کرو کہ اس سے ایک دن پہلے روزہ رکھو
	اور ایک دن بعد

امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دسویں تاریخ کے روزہ کا امر فرمایا۔

جوابات

ان اشکالات کے جوابات اللہ تعالیٰ کی تائید اور توفیق سے دیئے جاتے ہیں پہلے اشکال کا جواب یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ آئے تو آپ نے یہودیوں کو یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے ہوئے پایا،، اس میں یہ نہیں ہے کہ جس دن آپ تشریف لائے تھے اسی دن اُن کو روزہ سے پایا کیونکہ وہ ربیع الاول کا پیر کا دن تھا۔ اور آپ کے علم میں آنے کا پہلا دن یہی پیر کا دن تھا کہ آپ مدینہ منورہ تشریف لا چکے تھے، آپ مکہ میں نہیں تھے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ اگر اہل کتاب اپنا روزہ چاند کے اعتبار سے رکھتے ہوں اور اگر سورج کے اعتبار سے رکھتے ہیں تو اشکال کی کوئی وجہ نہیں ہے اور وہ دن کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی تھی۔ ماہ محرم کے عاشورہ کا دن تھا۔ اتفاق سے اہل کتاب نے اس کو حساب لگا کر یاد رکھا اور وہ دن ربیع الاول کے

مہینہ کا پیر کا دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا دن ہوا۔ اور مسلمان تو چاند کے حساب سے روزہ رکھتے ہیں یہی حال حج کا ہے اور ہر اس چیز کا ہے جس سے مسلمانوں کا تعلق ہے خواہ واجب ہو یا مستحب ہو۔ اسی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب موسٰی علیہ السلام سے اپنی اولیت اور قربت ظاہر فرما دی۔ یہود و نصاریٰ نے اس کی تعیین میں خطا کی کہ اس کو سورج کے اعتبار سے مقرر کیا۔

دوسرا جواب کہ قریش عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رکھا کرتے تھے بلا ریب قریش اس دن کو بڑا دن مانتے تھے۔ اس دن کعبہ کو لباس پہناتے تھے اور روزہ رکھا کرتے تھے لیکن وہ چاند کے اعتبار سے حساب لگاتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ دن عاشورہ محرم تھا۔ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے۔ تو آپ نے دیکھا کہ یہود بھی اس دن کو محترم سمجھتے ہیں، اور روزہ رکھتے ہیں تب آپ نے ان سے سوال کیا، تو انھوں نے بتلایا کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات دی تھی۔ تب آپ نے فرمایا: میں تمہاری بہ نسبت حضرت موسٰی علیہ السلام سے زیادہ قریب ہوں۔ چنانچہ آپ نے روزہ رکھا اور روزہ کا حکم فرمایا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے بطور شکریہ روزہ رکھا تو ہم ان کی اقتدا کے زیادہ حقدار ہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ہمارا اصول ہے۔

شرع من قبلنا شرع لنا اذا لم مخالف شرعنا — ہم سے پہلی شریعت ہماری شریعت ہے بشرطیکہ وہ ہماری شریعت کے خلاف نہ ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام نے روزہ رکھا تھا۔ ہم کہیں گے کہ صحیحین میں ہے کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے یہود سے سوال کیا تو انھوں نے بتلایا کہ اس دن

لہ مسلمانوں کو اپنے معاملات ہلالی اعتبار سے رکھنا انکے شعار میں ہے افسوس اس شعار کو انھوں نے ترک کر دیا ہے

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا تھا اُس وقت بطور شکریہ موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا میں زیادہ مستحق ہوں اور روزہ رکھا اور اُس کا امر فرمایا۔ یہود کی تکذیب نہیں کی چنانچہ جو روزہ آپ قبل ہجرت رکھا کرتے تھے اس کی تعظیم میں اسقدر اور اضافہ ہوگیا۔ اور اس کا اعلان کر دیا کہ لوگ روزہ رکھیں

تیسرا جواب تیسرے اشکال کا جواب کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کی فرضیت نازل ہونے سے قبل عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو آپ نے اس کو ترک کر دیا۔ اس اشکال سے چھٹکارہ اسی طرح ممکن ہے کہ صوم عاشورہ قبل رمضان کے فرض تھا اور بعد رمضان کی فرضیت کے واجب رہ گیا نہ کہ مستحب۔ اور یہ اس وجہ سے کہ آپ نے اپنی وفات سے ایک سال قبل فرمایا تھا

لأن عشت الی قابل	اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں تاریخ کا روزہ
لأصومنّ التاسع	بھی ضرور رکھوں گا۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "یہود، نصاریٰ کی مخالفت اس طرح کرو کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد میں روزہ رکھو" یہ آخری بات تھی شروع میں تو یہود و نصاریٰ کی موافقت تھی (کیونکہ ان کے ساتھ دسویں تاریخ کو روزہ رکھا جاتا تھا) پس معلوم ہوا کہ اس روزہ کا استحباب ترک نہیں ہوا تھا۔

دوسرے قول کی بنا پر یہ بھی ممکن ہے کہ دو چیزوں میں سے ایک ضرور تھی یا تو یہ کہ واجب نہیں تھا، یا مستحب بھی نہیں تھا لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ مستحب بھی نہ ہو۔ اور حضرت ابن مسعودؓ پر اس کا استحباب بھی مخفی رہا ہو اور انھوں نے اپنی رائے سے ہی کہہ دیا ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم برابر اس روزہ کی تاکید فرمایا کرتے تھے اور اس کو ایک سال کے لئے مکفرّ

قرار دیتے تھے۔ اور حضرات صحابہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک اسی پر قائم رہے۔ اور آپ سے اس روزہ کی کراہت کے بارے میں ایک حرف بھی ممانعت کا منقول نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کا وجوب ترک ہو گیا تھا نہ کہ استحباب۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت معاویہ کی متفق علیہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ روزہ کبھی بھی فرض نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی حدیث میں اس روزہ کے استمرار وجوب کی صراحۃً نفی ہے کہ وہ اس وقت بھی واجب نہیں ہے۔ وجوب متقدم جو منسوخ ہو چکا ہو اس کی نفی نہیں ہے۔ تا کہ یہ کہا جا سکے کہ پہلے واجب تھا اب واجب نہیں ہے۔

دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزہ کی نفی عام ہے زمانہ ماضی ہو یا حال ہو۔ لیکن وجوب کے دلائل سے اس کی تخصیص کر لی گئی ہے اور نفی کو استمرار وجوب پر محمول کیا گیا ہے۔

تیسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روزہ کی فرضیت اور وجوب کی نفی قرآن پاک کے اعتبار سے کی ہے یعنی اس کا وجوب یا فرضیت قرآن پاک سے ثابت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد فرمایا ہے "ولم یکتب علینا" یہ ہمارے اوپر فرض نہیں ہے۔ اس سے اس وجوب کی نفی نہیں ہے اور یہ وجوب ایسا نہیں ہے جس کو قرآن پاک میں "کتب علیکم الصیام" کے تحت ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشاد فرمایا ہے اس سے یہی مراد ہے کہ عاشورہ کا روزہ اس فرضیت کے تحت نہیں آتا ہے "جس کو کتاب اللہ میں بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا تناقض نہیں رہا۔ کیونکہ یہ فرضیت اور ہے اور منسوخ شدہ فرضیت اور تھی۔ اور حضرت معاویہ نے جو کچھ سنا وہ بعد فتح مکہ کے سنا تھا یعنی رمضان کی فرضیت بھی اور یوم عاشورہ کے وجوب کی منسوخی بھی لیکن جن حضرات صحابہؓ نے یوم عاشورہ کے روزے کے امر کا زمانہ پایا تھا اور جنھوں نے منادی کو بھی سنا تھا کہ جو لوگ کچھ کھا پی چکے ہوں وہ بھی بقیہ دن کچھ نہ کھائیں۔ یہ سب کچھ انھوں نے رمضان المبارک کی فرضیت سے پہلے مدینہ منورہ آنے کے وقت سنا تھا۔ اور رمضان المبارک کی فرضیت ۲ھ میں ہوئی تھی

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۹ر رمضان المبارک گذار کر ہوئی۔ لہٰذا بعض حضرات نے رمضان المبارک سے قبل والی فرضیت کو پایا اور اسی کو بیان کر دیا اور بعض حضرات نے رمضان المبارک کی فرضیت کے بعد کا زمانہ پایا تو انھوں نے اسی کو نقل کر دیا۔ اگر یہ تاویل نہ کی جائے تو اس باب کی تمام احادیث کا اضطراب بدستور باقی رہے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ صوم عاشورہ کے لئے رات سے نیت کو لازم نہ قرار دیا جائے تو اسکی فرضیت کیسے حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

لا صیام لمن لم یبت الصیام من اللیل — اس کا روزہ نہیں جو رات سے روزہ کی نیت نہ کرے۔

اس حدیث کے بارے میں اختلاف ہے آیا یہ حضور کا ارشاد ہے یا حضرت حفصہؓ یا حضرت عائشہؓ کا قول ہے۔ حدیث حفصہ کے بارے میں یہ ہے کہ اس کو معمر، زہری۔ سفیان بن عیینہ یونس بن یزید ایلی نے موقوف قرار دیا ہے۔ اور بعض نے مرفوع کہا ہے۔ اکثر اہل حدیث کا کہنا ہے کہ موقوف علیہ ہیں سب سے زیادہ صحیح ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ اس کو نافع نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح ترین ہے۔ بعض نے اس کے مرفوع ہونے کو صحیح بتلایا ہے۔

حضرت عائشہؓ کی حدیث بھی مرفوعاً، اور موقوفاً دونوں طرح مروی ہے البتہ اس کے مرفوع ہونے کی صحت میں اختلاف ہے اگر اس کا مرفوع ہونا تسلیم کر لیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ آپ نے رمضان کی فرضیت کے بعد فرمایا تھا۔ اور اس میں حکم واجب کی تجدید ہے اور وہ رات سے نیت کرنا ہے،، جہاں تک عاشورہ کے روزہ کا معاملہ ہے وہ دن میں بھی نیت کر لینے سے جائز ہو جاتا ہے جیسا کہ قبل رمضان کے تھا[1]۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رات سے نیت کرنا پہلے فرض تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ پھر جب رمضان کی فرضیت ہوئی تو پھر وہی رات سے نیت کرنے کا حکم دیدیا گیا۔ پس یہ طریقہ اور دوسرا طریقہ اصحاب

[1] حاشیہ صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ فرمائیے۔

امام ابی حنیفہؒ کا ہے۔

وجوب صوم عاشورہ میں دو چیزیں ہیں۔ یہ روزہ دن میں نیت کر لینے سے جائز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب اس کا وجوب منسوخ ہو گیا تو رات سے نیت کرنا بھی منسوخ ہو گیا۔ اور جب دوسری چیز (رمضان) کا وجوب ہو گیا تو صوم عاشورہ کے لئے دن میں نیت کر لینا باقی رہا۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ واجب، علم کے تابع ہے (یعنی وجوب کا علم ہونا ضروری ہے) عاشورہ کا وجوب دن میں معلوم ہوا، اور اُس وقت رات سے نیت کرنا ممکن نہ ہوگا اگر یہ نہ تسلیم کیا جائے تو تکلیف مالایطاق لازم آئے گی جو ممتنع ہے۔ اسی اصول کی بنا پر کہا ہے کہ اگر دن میں گذشتہ رویت کی شہادت مل جائے تو اسی وقت سے روزہ کی نیت کر لینا چاہیے، روزہ صحیح ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وجوب کے لئے

(صفحہ ۱۰۹ کا حاشیہ) روزہ میں نیت کب سے کرنا چاہیے؟ اس میں ذرا تفصیل ہے روزے کی تین قسم ہیں۔ فرض، واجب، نفل، رمضان المبارک کا روزہ فرض ہے۔ اور قضاء رمضان المبارک صوم کفارہ اور نذر، واجب ہے۔ اسکے علاوہ نفل ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ دن روزے کیلئے معیار ہے ظرف نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن میں ایک ہی روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ اس اصول کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ رمضان المبارک کے ایام فرض روزے کے لئے متعین ہیں، ان دنوں میں کوئی دوسرا روزہ ہرگز جائز نہیں ہے اور اگر رکھا تو وہ رمضان ہی کا روزہ شمار ہوگا بدیں وجہ اس روزے کے لئے دن کے نصف اول سے پہلے ہی پہلے نیت ہونا ضروری ہے یہی حال نفل کا ہے، کیونکہ ہر دن نفل روزہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے اس کے لئے بھی دن کے نصف اول سے پہلے پہلے نیت ضروری ہے۔ اسکے علاوہ قضاء کفارہ اور نذر کا روزہ صبح صادق سے قبل نیت کئے بغیر ادا نہ ہوگا۔ حنفیہ کا یہی اصول ہے اور یہی مسلک ہے۔ جو قرآن پاک اور احادیث کے مطابق ہے۔ علامہ نے بیان مسلک میں صاف گوئی سے کام نہیں لیا۔

علم ضروری ہے یہی طریقہ سب سے زیادہ صحیح ہے جو ہمارے شیخ ابن تیمیہ کا ہے[1]۔ جو اصول او. قواعد شرع کے مطابق ہے۔ اسی پر احادیث دلالت کرتی ہیں اور سیرت مقدسہ کا بھی اسی پر اجتماع ہو جاتا ہے اور نسخ کے دعویٰ سے بھی خلاصی مل جاتی ہے۔ لیکن اس طریقہ کے علاوہ جو طریقے ہیں وہ قواعد شرع کے بھی مخالف ہیں اور بعض آثار کے بھی خلاف ہیں (اس کی نظیر یہ ہے) کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قبا کو اس نماز کے اعادہ کا حکم نہیں دیا تھا جو انھوں نے قبلہ منسوخہ کی طرف ادا کرلی تھی، کیونکہ ان کو اس کی اطلاع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح علم نہ ہونے کی صورت میں صوم عاشورہ کی قضا کا حکم نہیں دیا

یہ اعتراض بھی مناسب نہیں ہے کہ رات سے نیت کرنا جو واجب ہے اس کا ترک لازم آتا ہے۔ کیونکہ جب معلوم نہیں ہے تو وجوب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ طریقہ واضح ہے اس سے کہ کہا جائے کہ صوم عاشورہ واجب تھا، اور دن سے نیت کرلینے میں ادا ہو جاتا تھا، پھر یہ منسوخ ہو گیا تو اس کے متعلقات (دن سے نیت کرنا وغیرہ) سب منسوخ ہو گئے کیونکہ جب متبوع ہی ختم ہو گیا تو اس کے توابع اور سب اجزا ختم ہو گئے۔ اس لئے کہ صوم واجب کے اجزاء میں سے دن کو نیت کرنا بھی ہے یہ نہیں ہے کہ دن کو نیت کرنا صرف اسی دن کی خصوصیت تھی، بلکہ وہ روزے سے تعلق رکھتی ہے جہاں تک روزے کا وجوب تھا وہ باقی رہا صرف محل بدل گیا یعنی عاشورہ کے بجائے رمضان ہو گیا۔ اسی طرح اس کے اجزا بھی منتقل ہو گئے۔

ایک صحیح طریقہ یہ بھی ہے کہ صوم عاشورہ کبھی واجب ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ روزہ کا امر روزہ سے معلوم ہوا اور یہ امر ندا سے موکد ہو گیا۔ اور مزید تاکید اس سے معلوم ہوئی کہ

---

[1] ۔ علامہ ابن تیمیہ کا مسلک مغالطہ سے خالی نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ دن کے نصف اول سے قبل نیت ہونا چاہئے۔

جب ارشاد ہوا[1] وجس نے کھایا ہو وہ بھی رُکا رہے یعنی اب نہ کھائے،، ان سب چیزوں سے وجوب کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رمضان فرض ہوا تو عاشورہ کا وجوب ختم ہو گیا اور استحباب باقی رہا بہرحال علماء نے جوابات میں یہ پانچ طریقے اختیار کئے ہیں۔

چوتھا جواب اشکال یہ تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر میں سال آئندہ زندہ رہا تو نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھوں گا۔ اور آپ کی وفات اس سے قبل ہوگئی۔ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے نویں تاریخ کا روزہ رکھا،، بہرحال حضرت ابن عباس نے یہ روایت کی ہے۔ اور یہ صحیح ہے۔ اور اس میں تضاد نہیں ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ آپ نے نویں تاریخ کا روزہ رکھا ہو اور آئندہ کے لئے بھی فرمایا ہو کہ آئندہ بھی ایسا ہی کروں گا یا یہ کہنا چاہیے کہ چونکہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے عزم فرمالیا تھا اسی عزم کو فعل سے تعبیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ نے روایت کر دیا۔

پانچواں اور چھٹا جواب پانچویں کا جواب گذر چکا ہے۔ چھٹے کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا" نویں تاریخ کا روزہ رکھو! جو بھی حضرت ابن عباسؓ کی روایات پر غور کرے گا اس کو اشکال نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس سے

---

[1] علامہ کی یہ بحث غیر فقیہانہ ہے کیونکہ صیغہ امر سے وجوب معلوم ہوتا ہے جب تک امر نہ ہو وجوب نہ ہوگا۔ علامہ کا فرمانا ہے مامور بہ کے وجود سے امر کا وجود معلوم ہوا۔ یہ عقلاً و نقلاً غلط ہے کیونکہ اگر امر نہ ہو تو مامور بہ کا وجود نا ممکن ہے مثلاً اگر نماز کا امر نہ ہوا ہوتا تو نماز کا وجود بھی نہ ہوا ہوتا۔ علامہ زرقانی نے شرح مواہب میں ان کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے کہ ان کی عقل سے ان کا علم بڑا ہے،، یہ بجا طور پر فرمایا ہے۔ احادیث اور نصوص قرآنیہ کی روشنی میں بحث کرنا صرف حنفیہ ہی کا حصہ ہے۔ یہ مقولہ درست ہے کہ دنیا فقہ میں امام ابوحنیفہ کی عیال ہے"

ان کی وسعت علم کا حال معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے یوم عاشورہ نویں تاریخ کو قرار نہیں دیا ہے۔ بلکہ سائل سے نویں تاریخ کے روزہ رکھنے کو کہا ہے۔ اور سائل کو چونکہ پہلے ہی سے صوم عاشورہ کے بارے میں معلوم تھا اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا بلکہ نویں تاریخ کے بارے میں اسقدر فرما دیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکھا کرتے تھے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ آپ نے حقیقۃً روزہ رکھا، دوم یہ کہ امر کو فعل پر محمول کر لیا جائے۔ اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں ہے

صوموا یوماً قبلہٗ ویوماً بعدہٗ — اس سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد روزہ رکھو

دوسری روایت جس میں ارشاد ہے کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دسویں تاریخ کا روزہ رکھنے کا امر فرمایا، یہ تمام آثار صحیح ہیں۔ ان میں سے بعض کی بعض سے تائید ہوتی ہے جن کا ماحصل یہ ہے کہ روزے کے تین مراتب ہیں۔ اکمل درجہ یہ کہ ایک دن پہلے اور ایک دن بعد میں روزہ رکھا جائے، اس سے متصل یہ ہے کہ نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھا جائے اس کی موافقت میں اکثر احادیث ہیں اور اس سے متصل یہ کہ تنہا دسویں تاریخ کا روزہ رکھا جائے۔ صرف نویں تاریخ کا روزہ رکھنا، یہ فہم ناقص کی دلیل ہے کہ آثار کو سمجھا نہیں گیا ہے۔ اور ان کے الفاظ اور طرق پر غور نہیں کیا گیا ہے۔

بعض اہل علم نے دوسرا مسلک اختیار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مقصود صرف اس قدر ہے کہ اہل کتاب کی اس جادۃ میں مخالفت کی جائے اس طرح پر کہ اس کو ادا بھی کیا جائے یہ دو طرح ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ دس کی بجائے نو کو رکھا جائے۔ یا دونوں تاریخوں میں روزہ رکھا جائے چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں یہ دونوں احتمال موجود ہیں لہذا احتیاط اس میں ہے کہ دونوں دن روزہ رکھا جائے۔ اور یہ زیادہ اچھا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ حضرت ابن عباس رضؓ کی تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک حدیث امام احمدؒ نے روایت کی ہے۔

خالفوا الیہود وصوموا قبلہ یومًا ویومًا بعدہٗ — یہود کی مخالفت کرو! ایک دن پہلے بھی روزہ رکھو اور ایک دن بعد میں بھی۔

اور امام ترمذی کی حدیث ہے:

امرنا بصیام عاشوراء — ہمیں یوم عاشورہ کے روزہ کا امر فرمایا

ان دونوں حدیثوں سے اسی طریقہ کی تائید ہو رہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے

یوم عرفہ کا روزہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرفات میں عرفہ کے دن روزہ نہیں رکھا کرتے تھے۔ صحیحین کی روایت سے یہی ثابت ہے بلکہ ممانعت منقول ہے۔ اور اس کو اہل سنن سے بھی روایت ہے کہ آپ نے یوم عرفہ کا روزہ سال گذشتہ اور سال آئندہ کے لئے کفارہ قرار دیا ہے۔ اس کو امام مسلم نے ذکر کیا ہے[1]

عرفہ کے دن عرفات میں روزہ نہ رکھنے میں چند حکمت ہیں۔ یہ کہ دعا مانگنے میں قوت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ کہ جبکہ فرض روزہ سفر میں نہ رکھنے کی اجازت ہے تو نفلی روزہ کی بہ طریق اولیٰ اجازت ہے۔ اور یہ کہ یوم عرفہ کا دن اتفاق سے یوم جمعہ تھا اور آپ نے تنہا یوم جمعہ کو روزہ رکھنے کے لئے منع فرمایا ہے[2]۔ پس لوگوں کے اس گمان کو ختم کرنے کے لئے کہ شاید عرفات میں روزہ کی تخصیص ہے۔ لہٰذا آپ نے منع فرما دیا۔ اور ہمارے شیخ نے ایک دوسرا مسلک اختیار کیا ہے وہ یہ کہ عرفہ کا دن اہل عرفات کے لئے یوم عید ہے۔ جیسا کہ لوگ عید میں جمع ہوتے ہیں۔ اسی کی طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے:

یوم عرفۃ ویوم النحر وایام منیٰ عیدنا اھل الاسلام — یوم عرفہ اور یوم نحر اور منیٰ کے قیام کے دن ہم اہل اسلام کی عید ہیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ عید اہل عرفات کے اجتماع کی وجہ سے ہے۔

---

[1] یعنی ان لوگوں کے لئے جو عرفات میں نہیں ہیں [2] جمعہ کے روزے کے متعلق تفصیل آرہی ہے۔

ہفتہ اور اتوار کا روزہ

روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ اور اتوار کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ غرض اس سے یہود و نصاریٰ کی مخالفت تھی۔ جیسا کہ مسند اور سنن نسائی میں کریب کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے مجھے حضرت ام سلمہ کے پاس یہ دریافت کرنے بھیجا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کن دنوں میں زیادہ روزہ رکھا کرتے تھے جواب دیا۔ ہفتہ اور اتوار کا، اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

انھما عید المشرکین فانا احب ان اخالفھم	یہ دونوں دن مشرکین کی عید کے دن ہیں اور مجھے ان کی مخالفت کرنا پسند ہے[1]

اس حدیث کی صحت میں کلام ہے اس کو محمد بن عمر بن علی ابن طالب نے روایت کیا ہے اور بعض حضرات نے ان کی حدیث کا انکار کیا ہے۔ عبدالحق نے احکام میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اپنے چچا فضل کی روایت ذکر کی ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے جنگل میں عباس سے ملاقات کی" اس کے اسناد ضعیف ہیں۔ ابن قطان نے کہا ہے۔ یہ ضعیف ہے۔ محمد بن عمر کے بارے میں معلوم نہیں وہ کون ہیں عبدالحق نے اس حدیث سے سکوت اختیار کیا ہے۔

امام احمد اور ابو داؤد نے عبداللہ بن بشری کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بجز فرض روزہ کے اتوار کا روزہ نہ رکھو۔ اگر کسی کے پاس افطار کو کچھ نہ ہو تو درخت کی لکڑی چبا کر ہی افطار کر لو۔

---

[1] کیونکہ عید کے دن روزہ نہیں رکھا جاتا۔ اس لئے یہود و نصاریٰ بھی روزہ نہیں رکھتے۔ روزہ رکھ کر یہود و نصاریٰ کے قومی دن کی عملاً تردید کر دی گئی۔ اس میں کس قدر واضح دلیل ہے کہ غیر قوموں کے شعار اور تہذیب کو اختیار کرنے کے بجائے ان کی تردید کی جائے۔

ان دونوں حدیثوں میں بہت اختلاف ہے ۔ امام مالک نے فرمایا ہے "یہ جھوٹ ہے ۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے ۔ ابوداؤد نے کہا ہے یہ حدیث منسوخ ہے ۔ نسائیؒ نے اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس حدیث اور ام سلمہ رضؓ والی حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے ۔ اس لئے کہ ممانعت صرف ہفتہ کے ایک دن کا روزہ رکھنے کی ہے ۔ اس کے اوپر ابوداؤد نے ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے ۔ "النہی ان یخص یوم السبت بالصوم" اور ہفتہ کے دن روزہ رکھنے والی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اتوار کا بھی روزہ رکھا جائے ۔ اسی کے مثل تنہا جمعہ کے دن کا روزہ کا معاملہ ہے اس میں بھی ایک دن پہلے روزہ رکھا جائے یا ایک دن بعد رکھا جائے ۔ اسی سے یہ اشکال دور ہو جاتا ہے کہ

ان صومہ نوع تعظیم لہ فھو موافقۃ لاھل الکتاب فی تعظیمہ ۔ جمعہ کے دن کے روزہ میں اس کی ایک قسم کی تعظیم ہے وہ تعظیم میں اہل کتاب کی موافقت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ تعظیم تنہا ایک روزہ رکھنے میں ہے اور اگر اس کے ساتھ دوسرا روزہ ملا لیا جائے تو یہ تعظیم نہیں ہے

مسلسل روزے رکھنا

آپ کی عادت شریفہ زمانہ کثیر تک مسلسل روزہ رکھنے کی نہیں تھی ۔ بلکہ آپ نے ارشاد فرمایا وہ جس نے سال بھر مسلسل روزہ رکھا، اس کا نہ روزہ ہے اور نہ افطار ہے ۔ اس سے ایام محرّمہ کے روزے مراد نہیں ہیں ۔ اس لئے کہ یہ آپ نے کسی کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے ۔ اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس طرح روزہ رکھنے پر ثواب مرتب نہ ہو سکے گا ۔ ایام محرّمہ اس سے مستثنیٰ ہیں اور وہ ایسے ہی ہیں جیسا کہ روزہ رکھنے کے معاملہ میں رات دکہ رات کا روزہ ، روزہ ہی شمار نہیں ہوتا) اور جیسا کہ ایام حیض کے روزے

حقیقت حال یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن افطار کرنا ، یہ عمر بھر

روزہ رکھنے سے افضل اور محبوب ہے۔ اور مسلسل عمر بھر روزے رکھنا مکروہ ہے۔ اور اگر مکروہ نہ تسلیم کیا جائے تو تین چیزوں میں سے ایک چیز لازم آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلسل روزہ رکھنا افضل اور واجب ہوگا۔ اور یہ حدیث صحیح کے بموجب مردود ہے۔

ان احب الصیام الی اللہ صیام داؤد — اللہ کے نزدیک محبوب روزہ صوم داؤد ہے

اور یہ ظاہر ہے کہ وہ اس سے افضل نہیں ہے۔ ۲۔ یہ کہ مرتبہ مساوی ہوگا۔ یہ بھی ممتنع ہے یا یہ کہ یہ مباح ہوگا کہ نہ مکروہ ہو اور نہ مستحب ہو۔ یہ بھی ممتنع ہے۔ کیونکہ عبادت کی یہ شان نہیں ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے

من صام رمضان واتبعہ ستۃ ایام من شوال فکانّما صام الدھر — جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے۔ گویا پورے سال روزے رکھے۔

اور آپ نے اس شخص کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے جس نے ہر ماہ تین دن کے روزے رکھے

ذلك یعدل صوم الدھر — یہ پورے سال کے روزوں کے برابر ہے۔

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ صوم الدہر افضل ہے۔ اور مطلوب ہے اور اس پر ثواب ملے گا۔ اسی وجہ سے تو اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نفس تشبیہ سے جواز ثابت نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ اس سے استحباب ثابت کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اس سے اس قدر ثابت ہو رہا ہے کہ اس کا ثواب صوم الدہر (یعنی پورے سال روزے رکھنے کے برابر ہوگا۔ نفس حدیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے ہر مہینہ کے تین روزوں کو صوم الدہر کے برابر قرار دیا ہے۔ کیونکہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوگا۔ چنانچہ سال کے ۳۶۰ روزوں کا ثواب ملے گا۔ یہی تاویل شوال کے چھ روزوں کے بارے میں ہے کہ حساب کے اعتبار سے دس گنا کرنے پر ۳۶۰ روزے ہوتے ہیں یعنی ۳۰×۱۰=۳۰۰ اور ۶×۱۰=۶۰

بہر حال آپ نے یہ تشبیہ اس وجہ سے دی ہے کہ بالفرض اگر صوم الدہر جائز ہو تو اس کے ثواب کے برابر ملیگا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ آپ سے کسی نے سوال کیا کہ جہاد کے برابر کونسا عمل ہے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا تھا "کیا تجھ میں یہ طاقت ہے کہ جب مجاہد اللہ کے راستہ میں نکلتا ہے، اور مسلسل نماز پڑھتا ہے اور روزہ رکھتا ہے"۔ یہ عادۃً ایسے ہی ناممکن ہے جیسا کہ ۳۶۰ روزے رکھنا شرعاً ناممکن ہے حالانکہ عمل فاضل نے ہر دو سے تشبیہ دی ہے چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

احب القیام الی اللہ قیام داؤد	اللہ کے نزدیک پسندیدہ قیام قیام داؤد
وھو افضل من قیام اللیل کلہ	ہے جو پوری رات کے قیام سے افضل ہے۔

اسی کے مثل دوسری حدیث ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

من صلی العشاء والصبح فی	جس نے عشا اور صبح کی نماز جماعت سے پڑھی
جماعۃ کمن قام اللیل کلہ	ایسا ہی ہے گویا پوری رات قیام کیا

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

من صام الدھر ضیقت علیہ	جس نے پوری عمر روزہ رکھا اس کے لئے
جھنم حتی تکون ھکذا وقبض	دوزخ اس طرح تنگ ہو جائے گی آپ
کفہ	نے ہاتھ کو بند کر کے فرمایا

اس حدیث کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں اپنے نفس کے ساتھ شدت کا معاملہ کرنا مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دوزخ کے تنگ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس میں داخلہ کی گنجائش نہ رہے گی۔ یہ تاویل زیادہ بہتر ہے کیونکہ روزہ دار جب اپنے لئے شہوات کے دروازے بند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دوزخ کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

نفلی روزہ کا بیان

ایسا بھی ہوتا تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل کے پاس تشریف لے جاتے اور کھانے کی کسی چیز کے بارے میں دریافت کرتے اور وہاں سے انکار ہوتا کہ کچھ نہیں ہے تو آپ فوراً ہی روزہ کی نیت کر لیتے۔[1] کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ نفلی روزہ رکھے ہوئے ہوتے اور حضرت عائشہ رض کے خبر دینے کے بعد (کہ کھانے کو موجود ہے) تو روزہ توڑ دیتے تھے[2] پہلی حدیث مسلم میں ہے اور دوسری حدیث نسائی میں ہے۔ ایک حدیث سنن میں ہے جس کو حضرت عائشہ رض نے روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں اور حفصہ دونوں روزہ سے تھیں، پس اتفاقاً کہیں سے کھانا آگیا۔ ہمیں بھوک لگی تھی، ہم نے اس میں سے کچھ کھایا اتنے ہی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو جلدی سے حضرت حفصہ رض نے سبقت کی (اور وہ اپنے باپ کی بیٹی ہیں) اور کہنا شروع کیا حضور! ہم دونوں روزے سے تھیں، کہیں سے کھانا آگیا۔ ہمیں بھوک لگی تھی ہم نے اس میں سے کچھ کھالیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

اقضیا یوماً مکانہ۔ اس کے بدلہ روزہ رکھ لینا

یہ حدیث معلول ہے۔ امام ترمذی نے ارشاد فرمایا ہے اس کو مالک بن انس، معمر عبداللہ بن عمر، زیاد بن سعد، اور دوسرے حفاظ حدیث نے عن زہری عن عائشہ رض مرسل روایت کیا ہے۔ اور اس میں عروۃ کا ذکر نہیں ہے اور یہ زیادہ صحیح ہے۔ اور ابوداؤد و نسائی نے عن شریک، عن زمیل، مولیٰ عروۃ، عن عروۃ، عن عائشہ متصلاً روایت کیا ہے۔ نسائی نے کہا ہے زمیل مشہور نہیں ہے۔ بخاری نے کہا ہے زمیل

---

[1] اس حدیث میں حنفیہ کے لئے دلیل ہے کہ نفل روزے کی نیت دن کے نصف اول سے پہلے کی جا سکتی ہے [2] اس کے بعد والی حدیث میں تفصیل موجود ہے۔

کے لئے عروۃ ے اور شریک کے لئے زمیل سے سماع ثابت نہیں ہے۔ لہذا اس کو دلیل میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے یہاں مہمان ہوتے اور آپ کا روزہ ہوتا تو آپ روزہ پورا کرتے تھے اس کو توڑتے نہیں تھے[1]۔ جیسا کہ آپ حضرت ام سلیم رض کے یہاں تشریف لے گئے، اور انھوں نے آپ کی خدمت میں کھجور اور گھی پیش کیا، تو فرمایا اس گھی کو برتن میں اور کھجوروں کو ٹوکری میں رکھ دو، میں روزے سے ہوں لیکن حضرت ام سلمہ رض آپ کے اہل بیت کی طرح تھیں۔ اور آپ سے بروایت صحیح ثابت ہے۔

اذا دعی احدکم الی طعام وھو صائم فلیقل انی صائم — جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لئے کہا جائے اور وہ روزے سے ہو تو کہہ دے میں روزے سے ہوں

لیکن ابن ماجہ، ترمذی، بیہقی نے حضرت عائشہ رض کی حدیث روایت کی ہے۔

من نزل علی قوم فلا یصومن تطوعاً الا باذنھم — جب کوئی کسی کے یہاں مہمان ہو تو نفلی روزہ ان کی بلا اجازت نہ رکھے۔

ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث منکر ہے اس کو کسی ثقہ راوی نے روایت نہیں کیا ہے اس کو ہشام بن عروۃ نے روایت کیا۔

جمعہ کا روزہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن کو روزے کے لئے خاص کر لینے کو مکروہ سمجھتے تھے[2]۔ چنانچہ اس بارے میں جابر بن عبداللہ رض

---

[1] نفلی روزے کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر کسی کے یہاں مہمان ہو یا اس کے یہاں کوئی مہمان ہو اور کھانا نہ کھانے کی وجہ سے افسوس ہو تو اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ نفل روزے کی قضا ہو جائیگی لیکن اس سے افسوس اور صدمہ کا تدارک نہ ہو سکے گا۔
[2] کیونکہ تخصیص کرنے کی وجہ سے وجوب اور فرضیت کا گمان ہوتا ہے۔

ابو ہریرہؓ جویریہ بنت الحارث، عبداللہ بن مسعود، خادۃ الازدی وغیرہ کی روایات موجود ہیں، چنانچہ آپ نے منبر پر جمعہ کے دن دکھلا کر پانی پیا تاکہ لوگوں کو آپ کے روزہ دار ہونے کا گمان نہ ہوسکے۔ اور اس کو امام احمد نے بھی ذکر کیا ہے اور وجہ بھی بیان فرمادی ہے کہ یہ عید کا دن ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کیا ہے۔

یوم الجمعۃ یوم عید فلا	جمعہ کا دن عید کا دن ہے۔ لہٰذا تم اپنی
تجعلوا یوم عیدکم یوم صیامکم	عید کے دن کو روزہ کا دن دنیا و مگر یہ کہ اس سے پہلے
الا ان تصوموا قبلہ او بعدہٗ	یا بعد روزہ رکھو۔

اگر یہ کہا جائے کہ یوم عید سے پہلے روزہ رکھا جاتا ہے نہ کہ بعد میں تو جواب یہ ہے کہ یوم جمعہ کو عید کے مشابہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا ادنیٰ مشابہت کی وجہ سے ممانعت کردی گئی ہے۔ لہٰذا جب ایک دن پہلے روزہ رکھ لیا یا ایک دن بعد رکھ لیا تو ایسا ہی ہوگیا گویا رمضان کا روزہ رکھ لیا تھا۔

اگر جمعہ کے دن عرفہ یا عاشورہ ہوجائے تو اس دن یہ کراہت نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث موجود ہے۔

ما رایت رسول اللہ صلی اللہ	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ
علیہ وسلم یفطر فی یوم الجمعۃ	کے دن افطار کرتے نہیں دیکھا

اس کو اہل سنن نے روایت کیا ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک دن پہلے روزہ رکھا ہوگا یا ایک دن بعد روزہ رکھا ہوگا۔ یا یہ کہ یہ حدیث غریب ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے کہا ہے

اعتکاف کا بیان

صلاح قلب اور سیر الی اللہ جمعیت خاطر پر موقوف ہے اگر قلب میں انتشار ہے تو سیر الی اللہ نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ فضول طعام، فضول پینا، فضول سونا، فضول اختلاط، ان ہی سے انتشار میں زیادتی

ہوتی ہے۔ اور سیر الی اللہ منقطع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انتہائی کرم ہوا کہ اس نے روزہ مقرر فرما دیا۔ جس سے فضول کھانے پینے اور شہوات پر پابندی لگ گئی جو کہ سیر الی اللہ کے لئے رکاوٹ تھیں۔ اور بقدر مصلحت اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کو مشروع قرار دیدیا۔ تاکہ بندہ دنیا سے بھی نفع اٹھائے اور آخرت سے بھی اور اس کی روح بھی اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جائے۔ اور مخلوق سے کٹ کر تنہا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو جائے۔ مخلوق سے انس کے بجائے اللہ تعالیٰ سے اُنس پیدا ہو جائے۔ تاکہ یہ انس وحشت کے دن جو قبر میں ہوگا کام آئے کہ اس دن کوئی مونس کام نہ آئے گا۔ اعتکاف کا یہی عظیم مقصد ہے اور یہ مقصد بغیر روزہ کے پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اعتکاف کو روزے کے افضل دنوں میں (یعنی رمضان میں) مشروع قرار دیدیا گیا، اور وہ رمضان کا آخری عشرہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے کہ آپ نے بلا روزے کے کوئی اعتکاف کیا ہے[۱]۔ جمہور سلف نے جس قول کو ترجیح دی ہے وہ یہی ہے کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے۔ اسی کو ابن تیمیہ نے ترجیح دی ہے۔ جہاں تک بات چیت کرنے کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ ہے کہ فضول بات سے ہر حال میں اجتناب ضروری ہے۔ اور قلت منام (کم سونے) کا جہاں تک تعلق ہے، اس کا معاملہ یہ ہے کہ قیام لیل کو چونکہ مشروع قرار دیا ہے اس لئے متوسط درجہ کی بیداری ضروری ہے جس سے قلب اور بدن دونوں کو راحت ملے اور مصالح انسانی میں خلل واقع نہ ہو۔ بہرحال ان ہی چار ارکان پر ارباب اہل سلوک نے مدار رکھا ہے۔

۱ے چونکہ عام طور سے آپ نے رمضان المبارک میں ہی اعتکاف کیا ہے اس لئے بلا روزہ کے اعتکاف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

چونکہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام، صیام، کلام وغیرہ کے متعلق ذکر کر چکے ہیں، اب یہاں اعتکاف کے بارے میں ذکر کرتے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ عشرہ اخیرہ رمضان المبارک میں اعتکاف کیا کرتے تھے، آپ نے عمر میں صرف ایک مرتبہ اس کو ترک کیا ہے لیکن بعد میں اس کی قضا شوال کے مہینہ میں کی ہے[1]۔ ایک مرتبہ آپ نے رمضان المبارک کے پہلے عشرہ میں بھی اعتکاف کیا ہے پھر درمیانی عشرہ میں، پھر آخری عشرہ میں لیلۃ القدر کو تلاش کیا کرتے تھے۔ بہرحال آپ نے اعتکاف پر ہمیشہ مداومت کی ہے یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا۔

آپ اعتکاف کے لئے مسجد میں خیمہ لگانے کا امر فرمایا کرتے تھے تاکہ آپ اس میں خلوت گزیں ہو جائیں۔ جب آپ اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھ کر معتکف میں داخل ہو جاتے[2]۔ آپ نے اپنی ازواج کو خیموں کا امر فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے صبح کی نماز پڑھی تو ان خیموں کو دیکھا۔

بہرحال آپ سال میں دس دن کا اعتکاف کیا کرتے تھے۔ جس سال آپ کا وصال ہوا، اس سال آپ نے بیس دن کا اعتکاف کیا تھا۔ ہر سال جبرئیل علیہ السلام آپ پر قرآن پیش کیا کرتے تھے یعنی قرآن پاک کا دور کیا کرتے تھے جب آخری سال ہوا تو دو مرتبہ دور کیا

---

[1] اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ جس طرح تہجد کی نماز آپ پر واجب تھی اسی طرح رمضان المبارک کا اعتکاف بھی واجب تھا۔ اور واجب کی قضا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ اعتکاف واجب کسی وجہ سے توڑ دینے کی وجہ سے اس اعتکاف کی قضا واجب ہے۔ واللہ اعلم

[2] امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے کہ وہ دن کی ابتدا صبح سے مانتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ شرعی دن غروب آفتاب سے مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غروب آفتاب سے قبل معتکف میں داخل ہونا چاہیے۔

جب آپ اعتکاف میں بیٹھتے تو اپنے قبہ میں تنہا بیٹھتے تھے۔ اور آپ گھر میں سوائے انسانی حاجت کے تشریف نہ لے جاتے تھے۔ آپ کبھی اپنے معتکف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف سر نکال دیتے تھے۔ وہ سر مبارک کو دھوتیں اور کنگھی کرتی تھیں حالانکہ وہ بعض مرتبہ حیض کی حالت میں بھی ہوتی تھیں۔ بعض مرتبہ آپ کی زیارت کے لئے آپ کی ازواج معتکف ہی میں تشریف لے آتیں، جب وہ واپسی کے لئے کھڑی ہوتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور بوسہ لیتے[1]۔

آپ نے حالت اعتکاف میں رات میں اپنی ازواج سے مباشرت نہیں کی۔ صرف بوسہ لیا ہے۔ اعتکاف کی حالت میں آپ کے لئے تخت بچھا دیا جاتا تھا اور اس پر بستر کر دیا جاتا تھا۔ جب آپ کسی حاجت[2] یا مریض کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تو راستہ میں کوئی بھی آپ سے سوال نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے قبہ ترکیہ میں اعتکاف کیا ہے اور اس میں بوریا بچھا دیا گیا تھا۔ آج کل جاہل لوگ اعتکاف میں بیٹھنے کے لئے بہت کچھ کرتے ہیں وہ سب غلط ہے۔ ہم نے اس جگہ اطراف حدث کو ذکر کر دیا ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اعتکاف بھی ایک طریقہ ہے۔

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ بحالت اعتکاف دن یا رات میں بوسہ لینے سے اعتکاف میں فرق نہیں آتا۔

[2] حاجت سے مراد پیشاب و پاخانہ وغیرہ ہیں۔ عیادت کے بارے میں یہ ہے کہ اگر اعتکاف میں بیٹھتے وقت شرکت جنازہ یا عیادت مریض کی نیت کر لی ہے تو جانا جائز ہے۔

۳۳ تینتیسواں باب

حج اور عمرہ کا بیان

عمرات النبی صلعم [1] جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے جو کل کے کل ذی قعدہ میں کئے تھے ۔

سب سے پہلا عمرہ ، عمرہ حدیبیہ ہے جو ۶ھ میں کیا ، لیکن اس مرتبہ مشرکین نے آپ کو اور آپ کے صحابہ کو بیت اللہ سے روک دیا تھا ۔ اسی وجہ سے حدیبیہ ہی میں قربانی کرکے اور سر کے بال منڈوا کر حلال ہو گئے[2] تھے ۔ اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے تھے ۔

دوسرا عمرہ ، عمرۃ القضا[3] ہے ۔ جو آئندہ سال کیا تھا ۔ اس مرتبہ آپ مکہ معظمہ میں اندر تشریف لے گئے اور تین دن قیام فرمایا ۔ اور ارکان عمرہ ادا کر کے واپس تشریف لائے اس میں اختلاف ہے کہ عمرہ ثانیہ ، کوئی جدید عمرہ تھا یا گذشتہ عمرہ کی قضاء تھا ۔ اس میں علماء کے دو قول ہیں ۔ اور امام احمد سے بھی دو روایتیں مروی ہیں ۔ پہلی روایت یہ ہے کہ یہ قضا تھی اور یہی امام ابو حنیفہ رح کا مسلک ہے ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ قضا نہیں تھی ، یہ امام مالک رح کا مسلک ہے ۔ جن حضرات نے اس کو قضا کہا ہے ان کا کہنا ہے کہ چونکہ اس کا نام عمرۃ القضا ہے ، اور یہ نام حکم کے تابع ہے ۔ دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ "القضا" اس

---

[1] عمرے کا بیان اس وجہ سے مقدم کیا ہے کہ عمرہ چھوٹا حج ہے [2] حلال ہونا احرام سے باہر آنے کو کہتے ہیں [3] یہ نام حنفیہ کے نزدیک ہے اس کو عمرۃ القصاص بھی کہتے ہیں ۔

جگہ مقاضات سے ماخوذ ہے۔ نہ کہ قضی، یقضی قضاءً سے اسی وجہ سے اس کا نام عمرۃ القضیۃ ہے[1]

علماء نے کہا ہے کہ جو حضرات بیت اللہ سے روک دیئے گئے تھے۔ ان کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی۔ اگر یہ عمرۃ القضاء ہوتا تو اس میں بھی چودہ سو آدمی ہوئے ہوتے اور کوئی بھی باقی نہ رہنا چاہیئے تھا، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امر نہیں فرمایا تھا۔ اس کے بعد والے عمرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے اور اس بارے میں اس سے زیادہ دلیل ہیں جن کو ہم عنقریب ذکر کرینگے

چوتھا عمرۃ الجعرانہ ہے جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنین تشریف لے گئے تھے۔ اور پھر مکہ معظمہ لوٹ کر تشریف لائے تھے۔ صحیحین میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے ہیں وہ سب ذی قعدہ میں ہوئے ہیں۔ مگر وہ عمرہ جو آپ نے اپنے حج کے ساتھ کیا ہے۔ عمرۂ حدیبیہ ذی قعدہ میں کیا۔ اس کے بعد کا عمرہ ذی قعدہ میں کیا، اور عمرۂ جعرانہ جب آپ تقسیم غنائم سے فارغ ہوئے ذی قعدہ میں کیا اور ایک عمرہ حج کے ساتھ کیا

اس حدیث کے دوسری حدیث خلاف نہیں ہے وہ بھی صحیحین میں ہے۔ یہ حدیث براء بن عازبؓ کی ہے:۔

اعتمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذی القعدۃ قبل ان یحج مرتین	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کرنے سے پہلے ذی القعدہ کے مہینہ میں دو عمرے کئے۔

---

[1] یہ نام امام شافعی صاحب کے نزدیک ہے۔

اس جگہ عمرۃ سے مراد عمرۂ مفردہ اور مستقلہ ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ تنہا عمرے ان کی تعداد دو ہے۔ اس لئے کہ عمرۂ قران، مستقل عمرہ نہیں تھا۔ اور عمرۂ حدیبیہ وہ عمرہ ہے جس سے کفار مکہ نے آپ کو روک دیا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رض نے فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے۔ عمرۂ حدیبیہ عمرۃ القضا تیسرا عمرۃ الجعرانہ اور چوتھا حج کے ساتھ۔

امام احمد رح نے فرمایا ہے کہ حضرت انس رض اور حضرت عائشہ رض کے قول میں تضاد نہیں ہے۔ اور نہ حضرت ابن عباس رض کے قول میں کوئی تضاد ہے۔ کیونکہ ابتداء عمرۂ قران[1] کی ذی قعدہ میں ہوئی اور انتہا اس کی ذی الحجہ میں حج کے پورا ہونے کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ پس حضرت ابن عباس رض اور حضرت عائشہ رض نے ابتدا کی خبر دی ہے اور حضرت انس رض نے انتہا کی خبر دی ہے۔ لیکن حضرت ابن عمر رض کی روایت ہے

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے
اعتمر اربعاً احدٰھن فی رجب	ان میں سے ایک عمرہ رجب میں کیا۔

یہ حضرت ابن عمر رض کا وہم ہے۔ حضرت عائشہ رض کو جب یہ خبر پہونچی تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں میں موجود نہ ہوں۔ آپ نے کوئی عمرہ رجب میں نہیں کیا۔ لیکن وہ روایت جس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رض نے فرمایا۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رمضان
المبارک میں عمرہ کے لئے نکلی۔ آپ نے افطار کیا لیکن
میں نے روزہ رکھا۔ آپ نے قصر کیا، لیکن میں نے اتمام

---

[1] ۔ حج، عمرہ ایک ساتھ ایک احرام سے ایک سفر میں ادا کرنے کو قران کہتے ہیں۔

کیا۔ میں نے عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان
ہوں۔ آپ نے افطار کیا، لیکن میں نے روزہ رکھا۔ آپ
نے قصر کیا، لیکن میں نے اتمام کیا۔ آپ نے فرمایا، تونے
اچھا کیا۔

یہ حدیث غلط ہے اس لئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ رمضان میں نہیں کیا۔ آپ کے تمام عمرے وقت اور تعداد کے اعتبار سے بالکل محفوظ ہیں۔ ہم کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ام المومنین پر رحم فرمائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ رمضان المبارک میں نہیں کیا لہ

حضرت عائشہ صدیقہ رض نے خود ارشاد فرمایا ہے:

لم یعتمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذی القعدہ	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیقعدہ کے علاوہ اور کسی مہینہ میں عمرہ نہیں کیا

اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس میں اختلاف نہیں ہے کہ حضرت ابن عمر رض نے چار عمروں سے زیادہ نہیں بیان فرمائے ہیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کوئی عمرہ کیا ہوتا تو پانچ ہوتے۔ اور اگر رمضان میں کوئی عمرہ کیا ہوتا، تو چھ ہوتے۔ مگر یہ کہ کہا جائے کہ آپ نے بعض رجب میں، بعض رمضان میں، بعض ذی قعدہ میں کئے ہیں اور ایسا ہوا نہیں۔ آپ کے سب عمرے ذی قعدہ میں ہوئے ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رض حضرت انس رض حضرت عائشہ رض نے ارشاد فرمایا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت عائشہ رض سے روایت نقل کی کہ آپ نے ایک عمرہ شوال میں کیا ہے۔

لہ علامہ نے حضرت عائشہ رض کے بارے میں جواب تو مناظرانہ دیدیا۔ مگر یہ منہ اس قابل نہیں ہے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رض کی طرف یہ انتساب کسی راوی نے غلط طور پر کر دیا ہو۔

یہ روایت محفوظ ہے غالباً عمرہ جعرانہ کے بارے میں ہے اس کی تاویل یہ ہے کہ آپ اس موقعہ میں مدینہ منورہ سے شوال کے مہینہ میں نکلے اور ذی قعدہ کے مہینہ میں احرام باندھا

عمرہ کا طریقہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر شریف میں کبھی ایک عمرہ بھی مکہ سے باہر نہیں کیا جیسا کہ آجکل بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ آپ کے تمام عمرے داخل مکہ ہوئے۔ نزول وحی کے بعد آپ تیرہ سال تک مکہ معظمہ رہے لیکن کوئی روایت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ آپ نے اس مدت میں مکہ سے خارج ہو کر کوئی عمرہ کیا ہے۔ پس وہ عمرہ جس کو آپ نے کیا ہے اور جائز بھی قرار دیا ہے وہ داخل مکہ کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو مکہ میں رہتا ہو وہ عمرے کے لئے خارج مکہ (حل) کی طرف جائے۔ ایسا آپ کے زمانے میں کبھی نہیں ہوا۔ البتہ حضرت عائشہ رضؓ کو آپ نے ایسا ہی عمرہ کرایا ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ اتفاق سے وہ حائضہ ہو گئیں۔ تب آپ نے اُن کو حکم دیا چنانچہ انھوں نے اسی پر حج کا احرام باندھ لیا۔ اس طرح وہ قارنہ ہو گئیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لہ عمرہ چھوٹا حج ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ حدود مکہ معظمہ سے باہر (جس کو حل کہتے ہیں) جاتے ہیں اور احرام باندھتے ہیں اور پھر مکہ معظمہ میں داخل ہو کر پہلے طواف کعبہ سات چکر اور پھر سعی بین الصفا والمروۃ سات چکر کرتے ہیں۔ عمرے کے یہی دو رکن ہیں عمرے کے لئے قدرے سفر ہونا ضروری ہے اس لئے جو لوگ مکہ معظمہ میں رہتے ہیں اُن کو مکہ معظمہ سے باہر آنا پڑتا ہے تاکہ نوعیت سفر پائی جائے عمرہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سال کے پانچ دنوں (یوم عرفہ، یوم النحر، ایام تشریق) کے علاوہ پورے سال جائز ہے اور جتنے چاہے اتنے کئے جا سکتے ہیں، اس پر کوئی پابندی نہیں۔ علامہ نے جو تنقید کی ہے وہ تنقید حضرت عائشہ رضؓ کے عمرہ تنعیم اور عمرے کے فضائل میں جو احادیث مذکور ہیں بے وزن ہو گئی۔ آئندہ صفحات میں حضرت انس رضؓ کا عمل بھی موجود ہے۔

ان کو بتلادیا تھا۔ کہ انھوں نے جو طواف بیت اللہ اور سعی بین الصفا والمروۃ کی ہے۔ وہ حج اور عمرہ میں شمار ہوگی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ چاہتی تھیں کہ وہ حج اور عمرہ مستقل کریں۔ جیسا کہ دوسری ازواج مطہرات نے کیا ہے۔ ان کو حیض نہیں آیا تھا، اس وجہ سے وہ متمتعہ رہیں قارنہ[1] نہیں ہوئیں چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خوشی کرنے کے لئے یہ کیا کہ حضرت عائشہ رضؓ کے بھائی کو امر فرمایا کہ وہ ان کو اپنے ہمراہ تنعیم تک لے جائیں، وہاں سے وہ عمرہ کا احرام باندھ کر ادا کریں۔ اس کے علاوہ نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ کسی صحابی نے کوئی عمرہ تنعیم سے کہا۔

مکّہ میں داخل ہونا

ہجرت کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں پانچ مرتبہ تشریف لے گئے۔ اس میں پہلی مرتبہ شامل نہیں ہے کیونکہ اس مرتبہ آپ صرف حدیبیہ تک ہی تشریف لے گئے تھے۔ چار مرتبہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ آپ نے میقات سے احرام باندھا تھا۔ حدیبیہ کی مرتبہ آپ نے ذی الحلیفہ سے احرام باندھا تھا۔

دوسری مرتبہ عمرۃ القضا کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ پھر تیسری مرتبہ فتح مکہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اس مرتبہ آپ بغیر احرام کے داخل ہوئے اور یہاں سے آپ حنین تشریف لے گئے۔ پھر جعرانہ سے عمرہ کیا۔ اس عمرہ میں آپ رات میں داخل ہوئے تھے اور رات ہی میں نکلے تھے۔ اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا کہ آپ جعرانہ تشریف لائے ہوں اور پھر احرام باندھ کر مکہ تشریف لائے ہوں جیسا کہ آج کل اہل مکہ کرتے ہیں۔ جب آپ عمرہ ادا کر چکے تو رات ہی کو آپ جعرانہ تشریف لائے اور رات کو جعرانہ ہی میں قیام فرمایا

---

[1] قران، حج اور عمرہ کا میقات سے احرام باندھنا اور درمیان میں بلا حلال ہوئے دونوں نسک کو ادا کرنا۔ حنفیہ کے یہاں قران افضل ہے اس کی فضیلت اور فوقیت کے بارے میں بہت سی احادیث آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے

تھا۔ جب صبح ہوگئی اور سورج بھی ڈھل گیا، تو آپ بطن سرف[1] سے ہو کر راستہ پر پہنچ گئے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں پر یہ عمرہ پوشیدہ رہا ہے۔

الحاصل عمرے کے مہینے حج کے مہینے ہیں۔ (یعنی شوال، ذی القعدہ، ذی الحجہ) یہ مہینے مشرکین مکہ کی عادت کے خلاف ہیں، کیونکہ وہ ان مہینوں میں عمرہ کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ان مہینوں میں عمرہ کرنا سب سے بڑا گناہ ہے" اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان مہینوں میں عمرہ کرنا بہت افضل ہے۔ بخلاف رجب کے کہ اس میں یہ فضیلت نہیں ہے۔ لیکن یہ بات کہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنا افضل ہے یا نہیں؟ یہ محل نظر ہے۔

یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ نے حضرت ام معقل رضؓ کو (وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک نہ ہو سکی تھیں) رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا امر فرمایا تھا اور ارشاد فرمایا تھا۔

عمرۃ فی رمضان تعدل حجۃ۔ رمضان المبارک میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے کیونکہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے میں دو فضیلتیں حاصل ہیں ایک تو افضل ترین وقت دوسرے افضل ترین مقام۔ اس خصوصیت کے باوجود حق تعالیٰ شانہ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس زمانہ کو عمرہ کرنے کو منتخب نہیں فرمایا بلکہ عمرہ کے اوقات ہی میں آپ نے عمرہ کیا اور وہ حج کے مہینے ہیں۔ ان مہینوں کو اللہ تعالیٰ نے اسی عبادت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ اور ان ہی مہینوں کو اس کا وقت قرار دیا ہے اور چونکہ عمرہ حج اصغر ہے۔ لہذا حج کے مہینے ہی اس کے لئے مناسب ہیں[2]

---

[1] سرف وہ مقام ہے جہاں سے مدینہ منورہ ہو کر سیدھا راستہ جاتا ہے

[2] رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کی فضیلت مروی ہونے کے بعد یہ تنقید مناسب نہیں ہے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رمضان المبارک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان عبادات میں مشغول رہتے تھے جو عمرے سے بھی زیادہ افضل ہیں۔ اور چونکہ ان عبادات اور عمرہ کو ایک ساتھ ادا کرنا ممکن نہ تھا اس لئے آپ نے عمرہ کو حج کے مہینوں کے لئے مؤخر کر دیا۔ اور رمضان المبارک میں آپ نے ان عبادات کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا علاوہ ازیں رمضان المبارک میں عمرہ کرنے میں مشقت بھی زیادہ ہے اس لئے آپ نے اُمت پر شفقت اور رحمت کی وجہ سے اس کو نہیں کیا، اور آپ نے بہت سے اعمال اُمت کی مشقت کی وجہ سے نہیں کئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے، اور وہاں سے مغموم باہر تشریف لائے۔ اور فرمایا مجھے اُمت کے مشقت میں مبتلا ہونے کا ڈر ہے۔

ایک سال میں ایک عمرہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال میں ایک ہی عمرہ کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے ایک سال میں دو عمرے کئے ہیں۔ ان حضرات کی دلیل ابوداؤد کی روایت ہے

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتمر عمرتین، عمرۃ فی ذی القعدۃ وعمرۃ فی شوال

آپ نے دو عمرے کئے ہیں۔ ایک عمرہ ذی قعدہ میں، اور ایک عمرہ شوال میں

علماء نے کہا ہے کہ اس سے ... عمروں کا مجموعہ مراد نہیں ہے بلکہ حضرت انس رضی

حضرت عائشہ اور

حضرت ابن عباس رضی اور دوسرے حضرات نے فرمایا ہے کہ آپ نے چار عمرے کئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی کی اس حدیث میں مراد یہ ہے کہ آپ نے سال میں دو عمرے کئے ہیں۔ ایک ذی قعدہ میں اور ایک شوال میں

اگر اس حدیث کو محفوظ سمجھا جائے تو یہ حضرت عائشہ رضی کا وہم ہے کیونکہ آپ نے کبھی

ایسا نہیں کیا بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ آپ نے چار عمرے کئے ہیں (جیسا کہ مذکورہ سطور میں ان عمروں کی تفصیل گذر چکی ہے)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ سال میں چند مرتبہ عمرہ کرنا جائز ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ امام مالکؒ نے ارشاد فرمایا ہے "ایک سال میں ایک عمرہ سے زیادہ کرنا مکروہ ہے۔ امام مالکؒ کے شاگردوں میں سے مطرف اور ابن المواز نے کہا ہے "ایک سال میں ایک عمرہ سے زیادہ کرنا جائز ہے اور خیال یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضؓ نے بھی ایک ماہ میں دو مرتبہ عمرہ کیا ہے۔ اور میں نہیں جانتا کہ کسی نے ان عبادات سے روکا جس میں تقرب ہے اور خیر ہے اور اس کی ممانعت کے بارے میں کوئی نص بھی وارد نہیں ہوئی ہے اور یہی قول جمہور کا ہے۔ مگر امام اعظم ابوحنیفہ رضؓ نے عمرے سے پانچ دنوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔ یوم عرفہ، یوم نحر، اور ایام تشریق اور امام ابو یوسفؒ نے صرف یوم النحر، اور ایام تشریق کو مستثنیٰ کیا ہے۔ اور امام شافعیؒ نے صرف منٰی میں قیام کرنے والوں کو مستثنیٰ کیا ہے

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے ایک سال میں دو مرتبہ عمرہ کیا ہے۔ جب قاسم سے اس کا ذکر کیا گیا کہ اس کا کسی سے انکار منقول نہیں ہے۔ فرمایا "ہاں وہ ام المومنین" ہیں بلکہ حضرت انسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان کے سر میں کچھ گرانی ہوتی تو وہ باہر تشریف لے جاتے اور عمرہ ادا کرتے (مراد یہ ہے کہ مکہ سے باہر نکل کر عمرہ کا احرام باندھتے اور پھر اس احرام سے عمرہ ادا کرتے)

حضرت علیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ سال میں چند عمرہ کرتے تھے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے "ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک درمیانی مدت کے لئے کفارہ ہے۔ اور اس بارے میں اس قدر کافی ہے کہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو تنعیم سے عمرہ کرایا تھا۔ اور یہ عمرہ اس کے علاوہ تھا جس کا انھوں نے احرام باندھا تھا۔ اور یہ ایک ہی سال میں ہوا۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت عائشہ رض نے احرام والا عمرہ چھوڑ دیا تھا اور یہ تنعیم والا عمرہ اُس کی قضا تھا۔ اس لئے کہ عمرہ کا چھوڑنا صحیح نہیں ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض سے ارشاد فرمایا تھا "تیری سعی اور طواف تیرے حج اور عمرے دونوں کے لئے ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے "تو دونوں سے حلال ہوگئی" اور اگر یہ کہا جائے کہ بخاری شریف میں روایت ہے :۔

ارفضی عمرتك وانقضی راسك وامتشطی [۱] — اپنا عمرہ چھوڑ دے اور سر کھول کر کنگھی کر لے۔

دوسری روایت میں یہ ہے

اھلی بالحج ودعی العمرۃ — حج کا احرام باندھ لے اور عمرہ چھوڑ دے۔

اس میں ۲ دو وجہ سے صراحت ہے۔ ایک میں عمرہ کو چھوڑنے کو کہا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کنگھی کرنے کا امر فرمایا ہے۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ رفض کے معنی ترک کرنے کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رض سے فرمایا کہ عمرے کے افعال کو چھوڑ کر حج کے افعال شروع کر دو، اس سے اس ارشاد کی بھی شرح ہو جاتی ہے جس میں مذکور ہے۔ "اب تو ان دونوں سے حلال ہوگئی" اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک "سعیك وطوافك لحجك وعمرتك" اس سے ظاہر ہے کہ احرام عمرہ نہیں ٹوٹا تھا۔ بلکہ اُس کے افعال کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ مسلم شریف میں زہری کی حدیث موجود ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں :۔

ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حجۃ الوداع میں چلے اتفاقاً مجھے حیض آنا شروع ہوگیا اور عرفہ کے دن

---

[۱] حاشیہ ص ۱۳۵ پر

تک آتا رہا۔ اور میں عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھی۔ مجھے
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں اپنا سر کھول
دوں اور کنگھی کروں عمرہ کا احرام چھوڑ کر حج کا احرام باندھ
لوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب میں حج سے فارغ ہوئی تو
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بھائی عبدالرحمٰن کو میرے ساتھ
بھیجا، کہ میں تنعیم سے (جو میرے عمرے کی جگہ ہے)۔ سے عمرہ
ادا کروں۔

یہ حدیث ایسی ہے جو واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت عائشہ حلال نہیں ہوئی تھیں بلکہ وہ محرم ہی تھیں۔ انھوں نے عمرہ پر حج کو داخل کرلیا تھا۔ یہ خبر حضرت عائشہ نے اپنی ذات کے بارے میں دی ہے۔ اس کے علاوہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی

ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک درمیانی مدت کے لئے
کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ بجز جنت کے کچھ نہیں"

یہ روایت حج اور عمرہ کے درمیان تفریق کرتی ہے۔ اور اگر عمرہ مثل حج کے ہے تو عمرہ میں تکرار نہ ہونا چاہیئے، بلکہ سال میں ایک ہی مرتبہ ہونا چاہیئے۔ اس سے برابری معلوم ہوتی ہے۔ امام شافعی صاحب نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ وہ ہر مہینہ ایک عمرہ کیا کرتے تھے وکیع نے ابوجعفر کی روایت ذکر کی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر طاقت ہو تو ہر مہینہ عمرہ کرنا چاہیئے۔ حضرت انسؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ مکہ میں تھے اور وہاں سے تنعیم تشریف لائے اور پھر عمرہ ادا کیا۔

(صفحہ ۱۳۴ کا حاشیہ) مراد اس سے یہ ہے کہ احرام سے باہر آجاؤ۔ احرام کے بعد چند ممنوعات ہیں اگر انکو کرلیا جائے تو احرام فاسد ہو جاتا ہے۔ احرام باندھ کر بغیر افعال کئے باہر آنا جائز نہیں ہے۔

حضور صلعم کا حج

اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ہجرت کے بعد آپ نے صرف ایک ہی حج کیا ہے جس کا نام حجۃ الوداع ہے۔ اور یہ سنہ ۱۰ھ میں کیا تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ ہجرت سے پہلے کوئی حج کیا تھا یا نہیں۔ ترمذی نے حضرت جابرؓ کی حدیث نقل کی ہے

حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث حجج، حجتین قبل ان یھاجر وحجۃ بعد ھا۔	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کئے ہیں۔ دو ہجرت سے پہلے اور ایک ہجرت کے بعد۔

ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے میں نے امام بخاری سے دریافت کیا تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ حدیث محفوظ نہیں ہے۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جیسے ہی حج فرض ہوا آپ نے اس کی ادائیگی کے لئے جلدی کی لیکن آیت مبارکہ

اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔	اللہ کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔

اگر یہ آیت سنہ ۶ھ میں حدیبیہ کے زمانے میں نازل ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں فرضیت کے بارے میں نہیں بلکہ پورا کرنے کے لئے حکم ہے۔ یہ بھی ہے کہ آل عمران کی ابتدائی آیات وفود کے سال نازل ہوئی تھیں۔ اس وقت وفد نجران جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا، اور آپ نے ان سے ادائے جزیہ پر صلح کی تھی۔ اور جزیہ کا حکم تبوک والے سال سنہ ۹ھ میں نازل ہوا تھا۔ اسی وقت سورۂ آل عمران کی آیات نازل ہوئیں اور اسی وقت اہل کتاب نے مناظرہ اور مباہلہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں جب یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا	مشرکین ناپاک ہیں اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ آئیں۔

ان آیات کا نزول سنہ ۹ھ میں ہوا، اور حضرت صدیق اکبرؓ کو آپ نے اس کے اعلان کے لئے مکہ معظمہ بھیجا، اور ان کے بعد حضرت علیؓ کو بھیجا۔ یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے یہی بات بہت سے حضرات نے کہی ہے۔

حج کے لئے جناب رسول اللہ صلعم کا سفر

جب لوگوں نے یہ سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں، تو مدینہ منورہ کے آس پاس کے حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ اور بہت سے انسان (جن کی تعداد معلوم نہیں) اثنائے سفر میں ہر طرف سے آکر شریک ہو گئے۔ چنانچہ آپ کے گرد حد نظر تک انسانوں کا ہجوم تھا۔ آپ دن میں ظہر کے بعد مدینہ منورہ سے باہر تشریف لائے۔ ظہر کی نماز آپ نے مدینہ منورہ ہی میں چار رکعات ادا فرمائیں۔ اور نماز سے پہلے آپ نے خطبہ دیا، اور اس میں لوگوں کو احرام اور اس کے واجبات اور سنن تعلیم فرمائے۔ ابن حزم نے اس بارے میں تین طور پر دلائل بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ بات یقینی ہے وہ ذیقعدہ نہیں تھا دوسری بات یہ ہے کہ اس سال ذی الحجہ کا چاند جمعرات کو ہوا تھا تیسری بات یہ ہے کہ یوم عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا تھا پہلی بات کے متعلق بخاری شریف کی حدیث ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے سر میں تیل لگا کر اور کنگھی کر کے روانہ ہوئے، اور یہ ذی قعدہ کی ۲۵ تاریخ تھی۔

ابن حزم کہتے ہیں، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ عرفہ کے دن جمعہ تھا، اور ذی الحجہ کی ۹ تاریخ تھی اور چاند رات بلاشک جمعرات کو ہوئی تھی۔ لہٰذا ذیقعدہ کی آخری تاریخ کو بدھ کا دن تھا لہٰذا آپ کا نکلنا ۲۴ ذیقعدہ کو ہوا۔ لہٰذا اس دن جمعرات ہوئی۔ اور ہم نے جس چیز کو اختیار کیا، اور وہ پانچ دن یہ تھے یعنی ہفتہ، اتوار، پیر، منگل، بدھ۔ اور اسی قول کی بنیاد پر جس میں

یہ ہے کہ سات دن ذیقعدہ کے باقی رہے تھے۔ تو اس صورت میں یوم خروج شمار کیا جائیگا۔ اور ۵ دن باقی رہنے کی صورت میں یوم خروج کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ بہر حال جو بھی صورت ہو حدیث کے خلاف ہے۔ اور اگر رات کا اعتبار کیا جائے تو چھ راتیں باقی رہتی ہیں نہ کہ پانچ، اس طرح جمعرات کے دن، اور پانچ دن باقی رہنے میں تطابق برقرار نہیں رہے گا ہاں اگر ہفتہ کے دن کو یوم الخروج مانا جائے تو اس طرح پانچ دن باقی رہتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دن خطبہ میں احرام وغیرہ کے متعلق ارشاد فرمایا تھا وہ جمعہ کا دن تھا۔ کیونکہ آپ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے خطبہ کے لئے لوگوں کو کسی اور دن بلایا ہو یا جمع کیا ہو۔ علاوہ ازیں حضرت ابن عمرؓ نے جمعہ کے دن منبر پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کے بارے میں شہادت دی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ خطبہ میں ان باتوں کو بتلاتے تھے جو وقت اور حال کے موافق ہوتی تھیں، اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا۔ پھر یہ بھی نہیں ہے کہ ایک دو دن کے فرق کی وجہ سے آپ بلا ضرورت جمعہ ترک نہیں کیا کرتے تھے۔ اور اس پر ایک خلق کثیر کا اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو تعلیم دینے کے معاملہ میں بہت ہی زیادہ حریص واقع ہوئے تھے اور اس کے لئے جمعہ ہی کا دن مناسب تر ہے۔

ابن حزم کو جب حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہ رضؓ کا یہ قول معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذیقعدہ کے ۵ دن باقی تھے کہ روانہ ہوئے تو اس کی تاویل اس طرح کر دی کہ یہاں ذوالحلیفہ سے روانگی مراد ہے۔ کیونکہ مدینہ منورہ اور ذوالحلیفہ میں صرف ۴ میل کا فاصلہ ہے۔ قلت مسافت کی وجہ سے اس فاصلہ کا شمار نہیں ہو گا۔ اس طرح تمام احادیث مجتمع ہو جاتی ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے مدینہ منورہ سے خروج جمعہ کے دن ہوا ہے تو یہ غلط بات ہے۔ اس لئے کہ جمعہ کی چار رکعات نہیں ہوتی ہیں۔ اور حضرت انسؓ نے ذکر کیا

گیا ہے کہ آپ نے مدینہ منورہ میں ظہر کی چار رکعات پڑھی تھیں۔ ابن حزم نے اسکی تائید میں بخاری شریف کی ایک حدیث ذکر کی ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج فی سفر الا یوم الخمیس	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے لئے جب تشریف لے جاتے تو وہ جمعرات ہی کا دن ہوتا تھا۔

دوسری حدیث میں یہ ہے کہ آپ جمعرات کے دن سفر کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ لہذا اس سے جمعہ کے دن کا نکلنا باطل ہوگیا، اور ہفتہ کے دن کا بھی نکلنا غلط ہوگیا۔ کیونکہ یوم سبت (ہفتہ) کے دن آپ مدینہ منورہ سے باہر تھے اور ذی قعدہ کے چار دن باقی رہ گئے تھے اور اس کو کسی نے بھی اختیار نہیں کیا ہے۔

نیز یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے ایک رات ذوالحلیفہ میں قیام فرمایا تھا۔ اور ذوالحلیفہ سے اتوار کے دن کوچ فرمایا تھا۔ اور ایک رات ذی طویٰ میں بھی قیام فرمایا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ چار ذی الحجہ کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تھے۔ اس طرح کل مدت سفر سات دن ہوئی۔

میں کہتا ہوں کہ ہفتہ کے دن کو اگر مدینہ منورہ سے خروج مان لیا جائے تو بھی احادیث میں اختلاف اور تعارض باقی نہیں رہتا ہے۔ ابن حزم کے قول کو تسلیم کر لینے کی صورت میں کہ ذیقعدہ کے پانچ دن باقی رہے تھے اس طرح بھی ہفتہ کا دن ہوتا ہے ابن حزم کو مغالطہ ہوگیا جو انھوں نے ایسی بات کہہ دی۔ اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ ذیقعدہ کا مہینہ ناقص ہو یعنی ۲۹ دن کا ہو۔ اسی اعتبار سے تاریخ خروج کی خبر دی گئی ہو کیونکہ عرب اور مورخین کی عادت ہے۔ وہ جب کسی تاریخ کی خبر دیتے ہیں تو مہینہ کو پورا تسلیم کر کے کتنے باقی رہتے ہیں۔ کہتے ہیں پھر جب مہینہ پورا ہو جاتا ہے تب اسی اعتبار سے کہتے ہیں اس طرح تاریخ میں اختلاف باقی نہیں رہتا ہے۔ مثلاً ۲۵ تاریخ کو کہیں گے ۵ دن باقی

رہے۔ اگر مہینہ ۲۹ دن کا ہے تو بلاشک ۵ دن باقی نہیں رہتے ہیں۔ اس طرح یوم خروج کو شامل کر کے پانچ دن باقی رہتے ہیں۔

عربوں کی یہ بھی عادت ہے کہ جب تاریخ میں دن اور رات دونوں مذکور ہوتے ہیں تو رات کا اعتبار کرتے ہیں کیونکہ وہی مہینہ کا روز اول ہوتا ہے۔ اس سے مراد، دن ہی ہوتا ہے۔ اس جگہ جو وقت ذکر کیا جاتا ہے وہ رات کا لحاظ رکھتے ہوئے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ بات قرین قیاس ہے اور صحیح بھی ہے کہ ۵ دن باقی رہے ہوں اور جمعہ کا دن نہ ہو۔ اور حضرت کعبؓ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی اکثر عادت شریفہ جمعرات کے دن سفر کرنے کی تھی یہ نہیں کہ اس کے علاوہ سفر ہی نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ یہ بھی شک سے بالاتر ہے کہ آپ غزوات کے لئے بھی تشریف لے جاتے تھے۔ اس میں جمعرات کی قید نہیں ہے۔

جس قول میں یوم سبت (ہفتہ) کے دن کا خروج ہے اور یہ مذکور ہے کہ ذیقعدہ کے چار دن باقی رہ گئے تھے۔ یہ امر نہ دن کا اعتبار کرنے سے لازم آتا ہے اور نہ رات کا دوسری چیز کہ آپ نے ذوالحلیفہ میں رات کو قیام فرمایا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مدینہ منورہ سے ہفتہ کے دن سفر کیا اور سات دن سفر میں رہے اور یہ نہایت عجیب بات ہے۔ کیونکہ اگر آپ نے ہفتہ کے دن سفر شروع کیا تو مہینہ کے پانچ دن باقی رہے تھے اور مکہ معظمہ میں ۴ ذوالحجہ کو داخل ہوئے تھے۔ اس طرح مدینہ منورہ سے نکلنے اور مکہ معظمہ میں داخل ہونے میں ۹ دن لگے۔ اور یہ امر متعدد وجوہ سے دشوار نہیں ہے۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کے لئے جو راستہ آپ نے اختیار کیا وہ بہر حال ایک فاصلہ ہے اس میں پیدل بھی تھے اور اونٹ بھی تھے۔ عربی اونٹ کی رفتار پیدل سے زیادہ ہوتی ہے جبکہ ان پر کوئی خاص قسم کا بوجھ بھی نہ ہو۔ چنانچہ آپ نے ظہر کی نماز مدینہ منورہ میں پڑھی اور سر میں تیل لگایا۔ کنگھی کی، لباس تبدیل کیا۔ اس طرح آپ ظہر اور عصر کے درمیان

نکلے اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ میں ادا فرمائی، اور یہاں رات کو قیام فرمایا۔ مغرب، عشاء، اور فجر کی نمازیں یہیں ادا کیں۔ اور اگلے دن ظہر کی نماز بھی یہیں ادا کی۔ اس طرح یہاں آپ نے پانچ نمازیں پڑھیں۔ آپ کی ازواج مطہرات سب آپ کے ہمراہ تھیں آپ اس رات میں ان سب کے پاس تشریف لے گئے جب آپ نے احرام کا ارادہ کیا تو دوبارہ غسل کیا اور احرام باندھا۔ یہ غسل جماع کے غسل کے علاوہ تھا۔ ابن حزم نے اس غسل کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ اور بہت سے حضرات نے سہواً یا عمداً اس کا ذکر نہیں کیا۔ زید بن ثابتؓ نے فرمایا ہے:-

انہ رای النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم تجرد لاھلالہ واغتسل — انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احرام کے لئے ننگا دیکھا ہے کہ آپ نے غسل کیا۔

ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ دارقطنی نے حضرت عائشہؓ کی حدیث ذکر کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب احرام کا ارادہ کیا تو اپنا سر مبارک خطمی اور خوشبودار گھاس سے دھویا۔ اور مشک لگایا حتی کہ مشک کی سفیدی آپ کی مانگ اور داڑھی کے بالوں سے معلوم ہو رہی تھی۔ اور آپ نے غسل نہیں کیا پھر ازار باندھا اور چادر اوڑھی اور ظہر کی نماز دو رکعت ادا فرمائیں پھر اپنے مصلّے ہی پر حج اور عمرہ کے لئے تلبیہ کیا (حضرت عائشہؓ نے یہ بات ذکر نہیں کی کہ آپ نے احرام کی دو رکعت پڑھیں) نماز کے بعد احرام سے پہلے آپ نے اونٹ کے دو جوتوں کا قلادہ باندھا اور اونٹ کی کوہان کے دائیں طرف چیرا دیا، اور اس سے خون بہنے لگا۔

حضور صلعم کا قران

ہم نے جو یہ کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ نے قران کا احرام باندھا تھا۔ اس وجہ سے کہا ہے کہ اس باب میں بیس سے زیادہ احادیث ہیں۔

(۱) اس حدیث کو بخاری و مسلم نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں عمرہ اور حج کے ساتھ تمتع کیا چنانچہ آپ نے ذوالحلیفہ سے اپنی قربانی کا جانور ہانکا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا اور پھر حج کا احرام باندھا۔

۲ ۔ یہ حدیث بھی بخاری و مسلم نے عن عروۃ عن عائشہ روایت کی ہے۔ اور یہ حدیث بھی ابن عمر رض کی حدیث کی طرح ہے۔

۳ ۔ یہ حدیث امام مسلم نے قتیبہ کی سند سے حضرت ابن عمر رض سے روایت کی ہے۔ اس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ اور حج کا قران کیا اور دونوں کا طواف کیا۔ اس کے بعد کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے۔

۴ ۔ یہ حدیث ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رض سے روایت کی ہے اس میں ہے کہ حضرت ابن عمر رض سے دریافت کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی مرتبہ عمرہ کیا تو جواب دیا۔ دو مرتبہ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ ابن عمر کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج والے عمرہ کے علاوہ تین مرتبہ عمرہ کیا ہے۔ یہ قول اس کے خلاف نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کے درمیان قران کیا ہے اس لئے کہ حضرت ابن عمر کی مراد عمرہ سے عمرہ کاملہ منفردہ ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ دو عمرے ہیں۔ عمرۃ القضا اور عمرۂ جعرانہ۔ حضرت عائشہ رض نے ان دونوں عمروں کے علاوہ عمرۂ قران کو شمار کیا ہے اور وہ عمرہ جس سے وہ رہ گئیں تھیں، اس طرح چار عمرے ہوتے ہیں۔

۵ ۔ یہ حدیث سفیان ثوری نے حضرت جابر بن عبداللہ رض کی روایت کی ہے۔ اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کئے، دو ہجرت سے پہلے اور ایک ہجرت کے بعد اور اس کے ساتھ عمرہ بھی کیا۔ اس کو ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

۶ ۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے عن عکرمۃ عن ابن عباس رض روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے۔ عمرۃ الحدیبیہ۔ عمرۃ القضا

عمرۃ الجعرانہ، اور وہ عمرہ حج کے ساتھ کیا

۷۔ یہ حدیث امام بخاری نے اپنی جامع میں حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت کی ہے، اس میں ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وادی عقیق میں سنا آپ نے ارشاد فرمایا، آج کی رات میرے رب کے پاس سے فرستادہ آیا۔ اور کہا اس وادیٔ مبارک میں نماز پڑھ، اور کہو، عمرۃ فی حجۃ۔

۸۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے حضرت براء بن عازبؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو جب یمن کا امیر مقرر کیا تو میں ان کے ساتھ تھا۔ جب حضرت علیؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یمن سے حاضر ہوئے حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ میں نے حضرت فاطمہ رضؓ کو رنگین کپڑے پہنے دیکھا، اور دیکھا کہ قیام گاہ نہایت صاف ستھری بنا رکھی ہے۔ حضرت فاطمہ نے مجھ سے فرمایا۔ یہ کیا؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے تمام صحابہؓ کو حلال ہو جانے کا امر فرما دیا ہے (اور آپ ابھی احرام باندھے ہوئے ہیں) میں نے جواب دیا۔ میں نے وہی احرام باندھا ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہے۔ اس کے بعد میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو آپ نے فرمایا، کیسا احرام باندھا ہے؟ میں نے عرض کیا جو آپ کا احرام ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا، میں تو ھدی کے جانور ساتھ لایا ہوں اور قران کیا ہے۔

۹۔ یہ حدیث امام نسائی رحہ نے روایت کی ہے۔ اس میں ہے کہ مروان بن حکم نے کہا میں حضرت عثمانؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ تو میں نے حضرت علیؓ کے تلبیہ کی آواز سنی کہ وہ حج اور عمرہ کا تلبیہ کہہ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا، کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں کیا۔ کہا۔ ہاں میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں کا تلبیہ سنا ہے۔

۱۰۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ اور وصال ہونے تک اس سے منع نہیں کیا۔

۱۱۔ حضرت ابو قتادہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ باوجودیکہ آپ جانتے تھے کہ اس کے بعد کوئی حج نہیں کریں گے۔ اس حدیث کی بہت سی صحیح سندیں ہیں۔

۱۲۔ اس حدیث کو امام احمد نے سراقہ بن مالک سے روایت کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

۔ اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے قیامت تک کے لئے عمرہ کو حج میں داخل کر دیا۔ اور جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں قران کیا تھا۔ اس کے اسناد ثقہ ہیں۔

۱۲۔ اس حدیث کو امام احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ اور اسی حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ ہے۔

۱۴۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں قران کیا

۱۵۔ اس حدیث کو بزور نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ باوجودیکہ آپ جانتے تھے کہ اس سال کے بعد کوئی حج نہیں کریں گے۔ کہا گیا ہے کہ زید بن عطا نے خطا کی ہے دوسرے لوگوں نے جواب دیا کہ بلا دلیل کے ان کو خطا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

۱۶۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ نے حج اور عمرہ کا قران کیا۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں حجاج

بن ارطاۃ ہے۔ بہر حال یہ حدیث درجہ حسن سے گری ہوئی نہیں ہے

۱۷۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا، آل محمد! حج اور عمرہ کا احرام باندھو!

۱۸۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت حفصہ فرماتی ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ اور لوگ تو احرام کھول چکے ہیں آپ نے احرام کیوں نہیں کھولا۔ تو آپ نے فرمایا، میں نے اپنی ھدی کے قلادہ باندھا ہے۔ میں حج کے ساتھ ہی حلال ہوں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے حج اور عمرہ دونوں ساتھ ادا کئے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں عمرہ کے احرام سے حج کے ساتھ ساتھ باہر آتے ہیں۔

۱۹۔ اس حدیث کو نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ نوفل بن حارث نے کہا کہ میں نے سعد بن ابی وقاص اور ضحاک بن قیس سے حضرت معاویہ کے حج کے زمانے میں سنا۔ وہ کہہ رہے تھے حج اور عمرہ ایک ساتھ وہی کر سکتا ہے جو اللہ کے امر سے جاہل ہو۔ تو سعد نے جواب دیا یہ جو آپ نے کہا ہے بری بات ہے۔ کیونکہ جناب رسول اللہ نے ایسا ہی کیا ہے اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ ایسا ہی کیا ہے۔ ... ... ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اس حدیث میں تمتع بالعمرۃ سے مراد قران ہے۔ قران پاک کی زبان یہی ہے اور حضرات صحابہ رضی قرآن پاک کے نزول اور اس کے معنی سے زیادہ واقف کار ہیں۔ یہی مراد حضرت ابن عمرؓ نے لی ہے اور یہی معنی حضرت عائشہ رضی نے بیان فرمائے ہیں۔ عمران بن حصین نے کہا ہے:۔

تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتمتعنا معہ	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا اور ہم نے آپ کے ساتھ تمتع کیا۔

مطرف نے کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ اور

اس سے منع نہیں کیا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ سعید بن مسیّب نے کہا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ عسفان میں تھے۔ حضرت عثمان تمتع سے منع فرماتے تھے تو حضرت علیؓ نے فرمایا، جس چیز کو جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ آپ اس سے منع فرماتے ہیں؟ بخاری شریف کی روایت میں اسقدر اضافہ اور ہے جب حضرت علیؓ نے یہ دیکھا تو دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھا۔ بخاری شریف میں ہی مروان بن حکم کی روایت میں اسقدر اضافہ اور ہے کہ حضرت علیؓ نے احرام باندھنے کے بعد ارشاد فرمایا

ماکنت ادع سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقول احد	میں کسی کے کہنے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ترک نہ کروں گا

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس نے حج اور عمرہ کو جمع کیا وہ متمتع ہو گیا۔ یہ وہی فعل ہے جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ اور حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے اس لئے کہ حضرت عثمانؓ نے اس سے انکار نہیں کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اگر وہ موافق نہ ہوتے تو انکار کر دیتے۔ پھر اسی واقعہ میں ہے کہ حضرت علیؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت اور اقتدا، کرتے ہوئے احرام باندھا۔ جس سے اشارہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہوا۔ یہ دلیل بیسویں دلیل تھی۔

۲۱ - اس حدیث کو امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے۔ اس میں ہے حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حجۃ الوداع کے لئے چلے جناب رسول اللہ صلی اللہ نے ارشاد فرمایا۔

من کان معہ ھدی فلیھلل بالحج مع العمرۃ ثم لا یحل حتی یحل منھما جمیعاً	جس کے ساتھ ھدی کا جانور ہو وہ حج کے ساتھ عمرہ کا بھی احرام باندھے اور اس وقت تک حلال نہ ہو جب تک دونوں کو ادا نہ کرلے

یہ معلوم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ھدی کے جانور تھے۔ بہر حال یہاں تک تمام احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں اور جو ذکر کریں گے، ان میں قران کے لئے دلائل موجود ہیں اور سلف وخلف کی ایک بڑی جماعت کا یہی ارشاد ہے کہ جس نے ھدی کے جانور کو ہانکا۔ اس پر قران کرنا واجب ہے اور جو ہمراہ جانور نہیں لے گیا، وہ تنہا عمرہ کے ساتھ تمتع ہو سکتا ہے۔ اس جماعت میں حضرت ابن عباسؓ ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ جو فعل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور حضرات صحابہ رضؓ نے کیا، اس سے عدول جائز نہیں ہے۔ آپ نے قران کیا اور ھدی کے جانور کو ہانکا ہے۔ اور یہی امر فرمایا ہے لہٰذا ایسا کرنا دوسروں پر بھی واجب ہے یہی قول سب سے زیادہ صحیح ہے بمقابلہ اس کے جنھوں نے اس کو حرام کہا ہے اور اس کے دلائل ہم عنقریب بیان کریں گے۔

۲۲۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں بروایت حضرت انسؓ ہے۔ اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مدینہ منورہ میں ظہر کی چار رکعات پڑھائیں اور العصر ذوالحلیفہ میں دو رکعت پڑھائیں۔ اور رات کو یہاں قیام کیا۔ صبح کو سواری پر سوار ہوئے اور حج و عمرہ کا احرام باندھا۔ اور لوگوں نے بھی حج و عمرہ کا احرام باندھا

۲۳۔ بخاری و مسلم میں بکر بن عبداللہ کی روایت سے حضرت انسؓ کی حدیث شریف اس طرح ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج اور عمرہ کا تلبیہ کہتے سنا۔ بکر بن عبداللہ کہتے ہیں ہیں نے اس کا ذکر حضرت ابن عمرؓ سے کیا تو انھوں نے فرمایا۔ تنہا حج کا تلبیہ کہا تھا۔ اس کے بعد میں پھر حضرت انسؓ سے ملا تو پھر انھوں نے فرمایا کیا وہ ہمیں ابھی بچہ ہی خیال کرتے ہیں۔ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو لبیک عمرۃ وحجاً کہتے سنا ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت ابن عمر رضؓ کی عمر میں ایک سال یا ایک سال سے کچھ زیادہ کا فرق تھا۔

۴۴۔ مسلم شریف میں عبد العزیز، ابن صہیب، حمید کی روایت ہے انھوں نے بیان کیا ہے کہ ہم نے حضرت انس رضؓ سے سنا کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ لبیک عمرۃً وحجاً۔ اسی کو ابو یوسف قاضی نے اور امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ اسی کو حسن بصری نے بھی روایت کیا ہے (اس جگہ اس حدیث کی متعدد سند ذکر کردی گئی ہیں جن کو بخوف طوالت ذکر نہیں کیا گیا) اس کے بعد علاّمہ نے تحریر فرمایا ہے

بہترین بات یہ ہے کہ اس باب کی تمام احادیث متفق ہیں ان میں اختلاف نہیں مگر بہت ذرا سا، اور اس سے فرق نہیں آتا کیونکہ حضرات صحابہ رضؓ نے تمتع کیا اور تمتع سے ان کے نزدیک مراد قران ہے۔ ان سے افراد[1] بھی منقول ہے اور تمتع بھی منقول ہے تمتع کے بارے میں بخاری و مسلم میں وہی حدیث ہے (جس میں حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ) کا واقعہ مذکور ہے۔ اس سے اس قدر ظاہر ہو رہا ہے کہ جس نے حج اور عمرہ ایک ساتھ کیا وہ متمتع ہو گیا۔ اس جگہ یہ اختلاف ہے کہ قران ہمارے حق میں بھی افضل ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت علی رضؓ اور حضرت عثمان رضؓ کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ متمتع ہے۔ اور بات یہ ہے کہ تمتع سے مراد صحابہ رضؓ کے نزدیک قران ہی ہے

بخاری و مسلم میں مطرف کی حدیث ہے جو انھوں نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کی ہے۔ اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کیا اور اس کے بارے میں قرآن شریف میں حرمت نہیں ہے۔ ان ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ کیا حضرت عمران بن حصین رضؓ سابقین اولین میں سے جلیل القدر صحابی ہیں۔ انھوں نے حج اور عمرہ کے جمع کرنے کی اور قران کی خبر دی ہے۔ اور قارن صحابہ رضؓ کے نزدیک متمتع ہوتا ہے اسی وجہ سے اس پر ہدی واجب ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں موجود ہے۔

---

[1] تنہا افعال حج کرنے کو حج مفرد یا افراد کہتے ہیں

فمن تمتع بالعمرۃ الی — جس نے حج اور عمرے کے ساتھ تمتع کیا۔ اس

فما استیسر من الھدی — پر ھدی ہے جو آسانی سے مل جائے۔

ایسے ہی حضرت عمرؓ کی حدیث ہے (گذر چکی) یہ تمام خلفائے راشدین اور حضرت عمران بن حصین ان سب نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے قران کیا۔ اور اس کو یہ حضرات تمتع کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ایسے ہی حضرت انسؓ کی حدیث اور بکر بن عبداللہ کی روایت میں جو تنہا حج کا ذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ثقہ راوی اثبت ہیں (یعنی زیادہ ثابت کرنے والے ہیں) ایسے ہی سالم اور نافع دونوں صاحب روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا۔ لہذا بکر نے حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں غلطی کی ہے۔ اور ان کو سہو ہو گیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ نے تنہا حج کیا ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جب یہ حضرات تنہا حج کا نام لیتے ہیں تو اعمال حج مراد لیتے ہیں تو جن صحابہؓ نے وہ روایات کی ہیں جن میں تنہا حج کا ذکر ہے اس سے مراد یہی ہے جیسا کہ نافع نے حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں کہا ہے۔

اھللنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالحج مفردا — ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تنہا حج کا احرام باندھا۔

لہذا اگر اس روایت کو پیش کیا جائے گا کہ سند کے اعتبار اس سے زیادہ ثابت روایت تمتع کی موجود ہے۔ اور کہا جائیگا پہلے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا احرام باندھا۔ اسی طرح زہری نے سالم سے روایت کیا ہے۔ یا یہ کہا جائیگا۔ حضرت نے یہ خیال کیا ہو گا کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام نہیں کھولا تو وہ سمجھے کہ شاید آپ حج کا احرام باندھے ہوئے ہیں جیسا کہ انھوں نے بیان فرما دیا ہے کہ آپ نے رجب میں عمرہ کیا۔ بہر حال یہ حضرت ابن عمرؓ کا نسیان ہے اور امام زہری کی روایت کا یہ معاملہ ہے کہ انھوں نے دوسری روایت میں بیان فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ نے تمتع کیا۔ علاوہ ازیں

زہری نے عروۃ عن عائشہ رض مثل سالم کی روایت کے بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے یہ حدیث زمین پر سب سے زیادہ صحیح ہے۔ اور حضرت عائشہ رض کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے ہیں اور چوتھا عمرہ حج کے ساتھ کیا ہے۔ اور اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ آپ نے حج کے بعد کوئی عمرہ نہیں کیا۔ پس یہ ثابت ہو گیا کہ آپ نے تمتع کیا اور تمتع سے مراد قران ہے۔

حضرت ابن عمر رض سے یہ بھی ثابت ہے کہ انھوں نے قران کیا اور فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس کو بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ تین حضرات نے مفرد بالحج کو نقل کیا ہے وہ یہ ہیں، حضرت عائشہ رض، حضرت ابن عمر رض، حضرت جابر بن عبد اللہ اور تین نے تمتع کو نقل کیا ہے۔ اور حضرت عائشہ رض کی حدیث تمتع کے بارے میں بھی ہے۔ بہر حال تمتع کی احادیث متواتر ہیں ان کو اکابر صحابہ رض نے روایت کیا ہے جن کی تعداد دس سے زیادہ ہے۔ جو بھی حضرات صحابہ رض کے الفاظ میں غور کریگا اور احادیث کو آپس میں ملا کر دیکھا اس کے سامنے تفسیر آجائے گی اور اس کے سامنے سے اختلاف کی اندھیری دور ہو جائے گی۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ نے پہلے حج کیا اور پھر تنعیم سے عمرہ کیا۔ یہ ایسی بات ہے جو حضرات صحابہ رض میں سے کسی نے نہیں کہی اور نہ ائمہ اربعہ میں سے کسی نے کہی .. .. اور یہ کہا جائے جیسا کہ سلف اور خلف میں سے ایک جماعت نے کہا ہے آپ نے حج مفرد کیا اس کے ساتھ عمرہ نہیں کیا۔ یہ بھی وہم ہے۔ اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آپ نے قران کیا اور اس طرح کیا کہ پہلے حج کے لئے ایک طواف اور ایک سعی کی اور پھر عمرہ کے لئے ایک طواف ایک سعی علیحدہ کی۔ تو یہ قول بھی احادیث سے مردود ہے۔ اور یہ کہا جائے کہ دونوں نسک کے درمیان قران کیا اس طرح کہ دونوں کے لئے طواف اور دونوں کے لئے سعی کی۔ تو احادیث سے اس کی

تائید ہوتی ہے۔

عمرے کے بارے میں مذاہب

ایک قول یہ ہے کہ آپ نے رجب میں عمرہ کیا، یہ غلط ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ نے شوال میں عمرہ کیا یہ بھی وہم ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض روایات غلط ہیں لیکن سیاق حدیث سے اسقدر معلوم ہوتا ہے کہ تین عمرے ہیں۔ ایک عمرہ شوال میں اور دو ذیقعدہ میں کئے ہیں تیسرا قول یہ ہے کہ آپ نے تنعیم سے عمرہ کیا ہے، اور حج کے بعد کیا ہے۔ یہ قول کسی اہل علم کا نہیں ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ آپ نے حج کے ساتھ عمرہ نہیں کیا لیکن صحیح ترین سنت شریفہ سے اس کی تردید ہو چکی ہے۔

حج کے بارے میں اقوال

آپ کے حج کے بارے میں پانچ قول ہیں:۔

(۱) یہ کہ آپ نے حج مفرد کیا (۲) یہ کہ آپ نے حج تمتع کیا اور اس کا احرام کھولنے کے بعد حج کا احرام باندھا۔ یہ قول قاطبی اور ابو داؤد کا ہے۔ (۳) یہ کہ آپ نے تمتع کیا اور سوق ھدی کی وجہ سے احرام نہیں کھولا اور آپ قارن نہیں تھے یہ قول ابو محمد مغنی کا ہے (۴) یہ کہ آپ نے قران کیا اس طرح کہ دو طواف اور دو سعی کیں (۵) یہ کہ آپ نے حج مفرد کیا اور اس کے بعد عمرہ تنعیم سے کیا۔

آپ کے احرام کے بارے میں اقوال

اس میں بھی پانچ قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ آپ نے تنہا عمرہ کا احرام باندھا (۲) یہ کہ آپ نے تنہا حج کا احرام باندھا (۳) یہ کہ حج کا احرام باندھا اور پھر اسی پر عمرہ کو داخل کر لیا (۴) یہ کہ عمرہ کا احرام باندھا اور پھر اس پر حج کا احرام باندھا۔ (۵) یہ کہ آپ نے احرام باندھا اور کسی چیز کو معین نہیں کیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے حج اور عمرہ کا ایک ساتھ احرام باندھا۔ اور دونوں سے ایک ساتھ حلال ہوئے۔ اسی پر احادیث متواترہ دلالت کر رہی ہیں۔

مذکورہ اقوال کے اعذار

کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں عمرہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث متفق علیہ ہے لیکن اس قول کو حضرت عائشہؓ نے بذات خود غلط قرار دیدیا تھا۔ چنانچہ مذکور ہے مجاہد کہتے ہیں کہ میں اور عروہ بن زبیر مسجد میں حاضر ہوئے۔ دیکھا تو حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے قریب حضرت ابن عمرؓ تشریف رکھتے ہیں۔ اور کچھ حضرات مسجد میں چاشت کی نماز ادا کر رہے تھے ہم نے ابن عمرؓ سے ان کے نماز کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ تو کہا بدعت ہے پھر سوال ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے عمرے کئے۔ تو کہا چار اور ایک رجب میں کیا۔ ہم بجائے اس کے کہ اس قول کی خود ہی تردید کرتے ہم نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا جس میں شریک نہ تھے۔ ایسے ہی حضرت انسؓ نے اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے۔ غرض کہ آپ کے کل عمرے ذی قعدہ میں ہوئے۔

شوال میں عمرہ

جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ آپ نے شوال میں عمرہ کیا ان لوگوں کا عذر یہ ہے کہ امام مالکؒ نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین عمرے کئے ان میں سے ایک عمرہ شوال میں کیا اور دو ذی قعدہ میں کئے یہ حدیث مرسل ہے اور غلط ہے۔ یہ غلطی یا تو ہشام سے ہوئی ہے یا عروہ سے ہوئی ہے اور یہ اسی قسم کی غلطی ہے جیسا کہ ابن عمرؓ سے ہوئی ہے۔ ابو داؤد نے حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے اس کا رفع صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے جو روایت امام مالکؒ سے مروی ہے وہ مسند میں نہیں ہے۔ اس کے باطل ہونے پر صراحۃً یہ دلیل ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی قعدہ کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ نہیں کیا۔ اور یہی صواب ہے اس لئے کہ عمرہ حدیبیہ اور عمرۃ القضا اور عمرۃ القران ذی قعدہ میں کئے ہیں۔ اور عمرہ جعرانہ بھی ابتدائی ذی قعدہ میں کیا ہے۔ اس بارے میں وجہ اشتباہ یہ ہے کہ آپ دشمن کے تعاقب میں مکہ معظمہ

سے شوال کے مہینے میں نکلے اور اس سے فارغ ہو کر اور مال غنیمت تقسیم کر کے رات کو مکہ معظمہ میں عمرہ کے لئے داخل ہوئے اور رات ہی کو واپس آ گئے۔ اس وجہ سے یہ عمرہ لوگوں سے پوشیدہ رہا۔ یہی کبھی نے کہا ہے۔ واللہ اعلم

تنعیم سے عمرہ کے بارے میں

جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حج کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنعیم سے عمرہ کیا ان کا عذر مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے کس بنا پر کہا ہے، ان لوگوں نے اس گمان پر کہا ہو کہ جو حج مفرد کرتے ہیں اور آفاقی[1] ہوتے ہیں وہ حج کے بعد عمرہ کے لئے تنعیم جاتے ہیں اور عمرہ کرتے ہیں ایسا ہی انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خیال کر لیا ہوگا۔

کیا آپ نے حج کے ساتھ عمرہ نہیں کیا

جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آپ نے حج کے ساتھ عمرہ بالکل نہیں کیا، ان کا عذر یہ ہے کہ جن حضرات نے یہ سنا کہ آپ نے حج مفرد ادا کیا اور حج کے بعد عمرہ نہیں کیا کیونکہ آپ پہلے عمرہ کر چکے تھے۔ اس قول کی تردید احادیث مشہورہ متواترہ سے ہو رہی ہے۔ جیسا کہ بیس وجوہات اوپر گذر چکی ہیں اور جیسا کہ حضرت حفصہ نے کہا تھا

"لوگوں کو کیا ہو گیا کہ انھوں نے احرام کھول دیا اور آپ نے نہیں کھولا؟"

سراقہ بن مالک نے کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہے۔ ایسے ہی حضرت ابن عمر رض، حضرت عائشہ۔ حضرت عمران بن حصین رض، حضرت ابن عباس رض نے فرمایا ہے اور حضرت انس رض، حضرت ابن عباس رض اور حضرت عائشہ رض نے صراحت سے فرمایا ہے کہ آپ نے حج کے ساتھ عمرہ کیا ہے اور یہ چار عمروں میں سے ایک ہے۔

---

[1] آفاقی وہ لوگ کہلاتے ہیں جو میقات سے باہر کے رہنے والے ہیں۔

آپ نے عمرہ کیا اور حلال ہو گئے

یہ قول قاضی ابو یعلی کا ہے ان کا عذر وہ ہے جو حضرت ابن عمرؓ حضرت عائشہؓ، حضرت عمران بن حصین سے صحیح طور پر مروی ہے کہ آپ نے تمتع کیا ہے۔ اس میں احتمال ہے کہ آپ نے عمرہ کیا اور اس کے بعد حلال ہو کر پھر حج کیا ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ حلال نہ ہوئے ہوں۔ حضرت معاویہؓ نے خبر دی ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ کے سر کے بال مروہ پر مونڈے تھے۔" یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ اس میں دلالت ہے کہ آپ عمرہ سے حلال ہو گئے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا حجۃ الوداع ہی میں ہوا ہوگا۔ اس لئے حضرت معاویہؓ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں اور فتح مکہ کے زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم محرم نہیں تھے۔

یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ آپ نے ایسا عمرہ جعرانہ میں کیا ہو؟ اس کی دو وجہ ہوسکتی ہیں ایک تو یہ ہے کہ بعض صحیح احادیث میں یہ واقعہ حج ہی کا بیان کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ نسائی میں اسناد صحیح سے یہ واقعہ مروی ہے کہ یہ عشرہ ذی الحجہ میں ہوا۔ ان حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تخصیص تھی کہ سوق ھدی کے باوجود حلال ہو جائیں نہ کہ حضرات صحابہؓ کے لئے بھی یہی تخصیص تھی۔ اس قول کی تردید ہمارے شیخ ابن تیمیہ نے کی ہے۔ اور کہا ہے کہ جن لوگوں نے احادیث میں غور کیا ہے وہ اس قول کی تردید کریں گے۔

صفت حج

بعض لوگوں کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صفت حج میں اختلاف ہے۔ ان کے اعذار بھی مختلف ہیں بعض لوگوں کو وہم ہو گیا ہے کہ آپ نے حج مفرد کیا اور اس میں عمرہ نہیں۔ ان کا عذر حضرت عائشہ کی وہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم میں ہے۔ فرماتی ہیں ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے ساتھ حجۃ الوداع میں چلے۔ ہم میں سے بعض نے عمرہ کا احرام باندھا۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے بھی صرف حج کا احرام باندھا تھا۔

ان حضرات نے کہا ہے کہ یہ تقسیم صراحۃً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مفرد کو بیان کرتی ہے، امام مسلم نے حضرت حفصہ کی روایت یوں ذکر کی ہے کہ آپ نے "حج مفرد" کیا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا حج کا احرام باندھا۔ ... ... مسلم میں حضرت جابر کی روایت اس طرح ہے:-

ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور ہم نے حج کے علاوہ کسی دوسری چیز کی نیت نہیں کی اور ہم عمرہ کو جانتے بھی نہ تھے۔

صحیح بخاری میں عروۃ بن زبیر کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بارے میں خبر دی کہ جب آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے وضو کیا اور پھر بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے بھی ایسے ہی حج کیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے بھی ایسا ہی کیا پھر حضرت عثمانؓ نے بھی ایسا ہی کیا پھر معاویہ نے پھر عبداللہ بن عمر نے پھر میں نے زبیر بن عوام کے ساتھ حج کیا، تو انھوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ غرضکہ میں نے مہاجرین اور انصار کو دیکھا ہے وہ ایسا ہی کرتے تھے یعنی عمرہ نہیں کیا تھا۔ اور میں نے اپنی والدہ اور خالہ کو دیکھا ہے کہ وہ جب مکہ معظمہ آتیں تو ایسا ہی کرتی تھیں اور میری والدہ نے مجھ سے کہا ہے کہ فلاں فلاں جب آتے تو صرف عمرہ کرکے حلال ہو جاتے تھے۔ (ابوداؤد میں بھی حضرت عائشہؓ کی مندرجہ بالا حدیث ہے) غرضکہ ان دونوں حدیثوں سے یہی ثابت ہے کہ آپ نے حج مفرد کیا۔ بہرحال ان قائلین کا عذر ظاہر ہے، لیکن جو کچھ ان حضرات نے بیان کیا ہے اس کے بارے میں ان حضرات کا کوئی عذر نہیں ہے جو اقوال اور احادیث اوپر گذر چکے ہیں (اس جگہ علامہ نے ان بہت سی احادیث کا اعادہ کیا ہے جو اوپر مذکور ہو چکی ہیں)، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات نے ان احادیث کو سنا ہی نہ ہوگا اور ان کے بارے میں یہ کہہ دینا زیادہ

مناسب ہے بجائے اس کے کہ ان لوگوں کو کذب کی طرف منسوب کیا جائے جنھوں نے کہا ہے سمعت کذا وکذا۔ ہمارے نزدیک ان حضرات کی تاویل یہ ہے کہ مفرد بالحج سے مراد تنہا افعال حج ہیں۔

جن حضرات نے حضرت عائشہ رضؓ سے مفرد بالحج کو روایت کیا ہے وہ ۲ ہیں، عروہ اور قاسم اور قران کو حضرت عائشہ رضؓ سے مجاہد، عروہ، ابوالاسود نے روایت کیا ہے عروہ سے افراد بھی مروی ہے اور زہری نے عروہ سے قران بھی روایت کیا ہے۔ ان دونوں روایتوں کو اگر ساقط کر دیا جائے تو حضرت اسود کی روایت بے غبار باقی رہتی ہے۔ اور اگر مفرد بالحج کی مراد افراد اعمال لیا جائے تو سب روایات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابن عمر رضؓ کے قول "مفرد بالحج" کے تین معنی بیان کئے ہیں (۱) یہ کہ افراد اعمال مراد ہے (۲) احرام مفردہ مراد ہے (۳) آپ نے صرف ایک حج کیا ہے اور اس کے علاوہ نہیں کیا بخلاف عمرہ کے وہ چار کئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان احادیث صحیحہ کو کذب کی طرف منسوب کرنا اور دلالت اصلیہ کے علاوہ ان کے اور کوئی معنٰی بیان کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

ابن ماجہ کی وہ روایت کہ جس میں یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مفرد حج کیا۔ اس کی تین سند ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ عمدہ سند وہ ہے جو دراوردی نے عن جعفر بن محمد روایت کی ہے اور یہ حدیث حجۃ الوداع کی طویل حدیث کے بمقابلہ بہت مختصر ہے۔

دوسری سند اس میں مطرف بن مصعب ہیں۔ مطرف کے بارے میں ابن حزم نے کہا ہے وہ مجہول ہیں۔ میں کہتا ہوں مطرف مجہول نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے بھانجے مالک سے امام بخاری نے روایت کی ہے۔ بشر بن موسیٰ اور ایک جماعت اور ابو حاتم نے کہا ہے وہ صادق ہیں، لیکن مضطرب الحدیث ہیں اس کے باوجود وہ مجھے اسماعیل بن ادیس سے

زیادہ محبوب ہیں۔ عدی نے کہا ہے مطرف منکر احادیث بیان کرتے ہیں۔ ابو محمد نے ایک نسخہ میں مطرف بن مصعب لکھا دیکھا تو ان کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے مطرف ابو مصعب بن عبداللہ بن مطرف مجہول ہیں

علامہ ذہبی سے بھی ان کے بارے میں غلطی ہوگئی کہ ان کا شمار ضعفاء میں کر دیا ہے چنانچہ انھوں نے فرمایا ہے مطرف بن مصعب مدنی عن ابن ابی ذئب منکر الحدیث ہیں۔ میں کہتا ہوں ابن ابی ذئب سے روایت کرنے والے اور دراوردی، مالک جس کے بارے میں فرماتے ہیں وہ مطرف ابو مصعب مدنی ہیں۔ وہ بھی منکر الحدیث نہیں ہیں۔ لوگوں کو ابن عدی کے قول سے مغالطہ ہوگیا ہے۔

حضرت جابر رض کی حدیث کی تیسری سند میں محمد بن عبدالواہب ہیں ان کا حال معلوم نہیں اگر یہ طائف کے رہنے والے ہیں تو ثقہ ہیں اور ابن معین نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اور امام احمد نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور ابن حزم نے ساقط الاعتبار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر وہ اور کوئی ہے تو میں نہیں جانتا کون ہے؟ میں کہتا ہوں وہ طائف ہی کے باشندہ ہیں کوئی غیر نہیں ہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ اگر یہ حدیث حضرت جابر رض سے صحیح طور پر مروی ہے تو اس کا حکم وہی ہے جو حضرت عائشہ رض کی مرویات کا حکم ہے (اس جگہ علامہ کی عبارت میں پھر تکرار واقع ہوا ہے اس کے بعد ہے) ہم سفیان ثوری کی روایت حضرت جابر بن عبداللہ سے پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ اس میں ہے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرن فی حجۃ الوداع — جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج میں قران کیا۔

امام زکریا ساجی نے عن عبداللہ بن زیاد کی سند سے حضرت سفیان ثوری رح سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ اس حدیث اور "اھل بالحج" اور "افرد بالحج" اور "لبی بالحج" میں تناقض نہیں ہے جیسا گذر چکا ہے۔

وجوہات قران

بہرحال قران والی احادیث کو اس وجہ سے ترجیح حاصل ہے (۱) یہ کہ روایات کثیر ہیں (۲) ان کے اسناد بہت ہیں (۳) ان احادیث میں سمعت کا لفظ موجود ہے اور بعض نے اپنے ہی بارے میں خبر دی ہے کہ اس نے ایسا کیا۔ بعض نے امر رب کا ذکر کیا ہے۔ یہ چیزیں مفرد بالحج کے بارے میں مروی نہیں ہیں چوتھی وجہ وہ ہے کہ آپ نے چار عمرے کئے (۵) یہ وجہ نہایت واضح ہے اس اس میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے بخلاف افراد کی احادیث کے (۶) یہ کہ قران والی روایات میں زیادتی ہے جس سے افراد والی روایات خاموش ہیں اور اصولی طور پر مثبت کو فوقیت ہوتی ہے (۷) یہ کہ افراد کے راوی صرف چار ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ابن عمر رضؓ، حضرت جابر رضؓ، حضرت ابن عباس رضؓ۔ ان چار کے مقابلہ میں اگر چار قران والے راویوں کی روایات کو ساقط کر دیا جائے۔ تو ان کے علاوہ اور دوسرے راویوں کی روایات باقی رہتی ہیں اور ترجیح دینے کو اختیار کیا جائے تو ان ..... صحابہؓ کی روایات کو اختیار کرنا واجب ہے کہ جن میں اضطراب نہیں ہے۔ جیسے حضرت براء بن عازب رضؓ حضرت انس رضؓ، حضرت عمر بن خطاب رضؓ حضرت عمران بن حصین رضؓ، حضرت حفصہ رضؓ وغیرہ (۸) یہ کہ قران ایک ایسا نسک ہے کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے امر فرمایا ہے (۹) یہ نسک صرف ھدی ہانکنے والے ہی کے لئے مخصوص ہے (۱۰) یہ وہ نسک ہے کہ جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل بیت کو بھی دیا ہے (۱۱) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

دخلت العمرۃ فی الحج الی یوم القیامۃ — قیامت تک کے لئے عمرہ کو حج میں داخل کر دیا گیا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ عمرہ حج کا جزو داخل ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے اور حج ہی کی طرح ادا ہوتا ہے (حدیہ ہے کہ اس کو حج اصغر کہا جاتا ہے) (۱۲) یہ کہ حضرت عمر رضؓ نے صبیح بن معبد سے فرمایا تھا جب انہوں نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا، تو

زید بن صوفان یا سلمان بن ربیع نے ان کو منع کیا تھا تو حضرت عمر رضہ نے فرمایا تھا۔

هدیت لسنة نبیك محمد صلی اللہ علیہ وسلم — تجھے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ہدایت ہوئی۔

اس روایت کی تائید حضرت عمر رضہ کی دوسری روایت سے بھی ہو رہی ہے وہ یہ ہے:۔

ان الوحی جاء من اللہ بالاهلال بهما جمیعا۔ — اللہ تعالیٰ کی وحی حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھنے کے لئے آئی ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ قران سنت ہے (۱۳) یہ کہ قران کرنے والا ایک ہی احرام سے دو رکن ادا کرتا ہو (جس میں زیادہ مشقت ہے) (۱۴) یہ نسک هدی ہانکنے والے کے لئے ہے اور یہ یقیناً اس سے زیادہ افضل ہے جو بلا سوق هدی ہو۔ واللہ اعلم اور یہ بھی بات ہے کہ جو لوگ هدی لے جاتے ہیں ان کے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ وہ حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھیں۔ اور یہ خبر حضرت براء بن عازب رضہ کی متفق علیہ حدیث سے ثابت ہے (۱۵) یہ ثابت ہے کہ تمتع تنہا حج سے چند وجہ سے افضل ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کرنیوالے کو درمیان میں حلال ہو جانے کا امر فرمایا ہے۔ یہ بھی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر افسوس کیا ہے جو تمتع بھی نہ کرے۔ آپ نے فرمایا ہے:۔

اگر میں پہلے سے احرام باندھے ہوئے نہ ہوتا تو
تمتع کرتا، کیونکہ میں هدی کے جانور لایا ہوں۔

یہ بھی وجہ ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو بھی تمتع کرنے کا حکم دیا ہے جو هدی ساتھ نہ لائے ہوں یہ بھی ہے کہ حج قران تو وہ ہے جو آپ نے اور آپ کے صحابہ رضہ نے کیا ہے جو هدی کے جانور اپنے ساتھ لے گئے تھے، البتہ تمتع کے لئے ان لوگوں کو بھی حکم دیا ہے جو هدی کے جانور ساتھ نہ لے گئے تھے، اس کے علاوہ اور دوسری وجوہات بھی ہیں۔

تمتع کرنے والے کے لئے افضل یہ ہے کہ مکہ معظمہ سے ھدی کا جانور خرید لے بلکہ یہ قول بھی ہے "وہ ھدی ہی نہیں جو حل اور حرم کے درمیان میں نہ ہو"[لہ]۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ وہ قارن جو ھدی کا جانور ساتھ نہ لے گیا ہو اس متمتع سے افضل ہے جو ھدی کا جانور نہیں لایا ہے۔ تمتع کرنے والا حل کے پاس سے ھدی کو ہانکنا شروع کرتا ہے۔ لہٰذا مفرد حج کو جس میں ھدی نہیں ہوتی ہے اُس کو کس طرح افضل قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور قران کرنے والا میقات ہی سے ھدی کا جانور ہانکتا ہے۔

حج تمتع بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تمتع کیا تھا۔ آپ افعال عمرہ کر کے احرام سے خارج ہو گئے تھے اور پھر ۸ ذی الحجہ کو آپ نے حج کا احرام باندھا تھا۔ ان حضرات کے نزدیک حضرت معاویہؓ کی حدیث ہے جو گذر چکی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ پر سر کے بال اتروائے تھے اس حدیث کی تغلیط بہت سے حضرات نے کی ہے۔ اور کہا ہے کہ حضرت معاویہ کو اس بارے میں ویسا ہی وہم ہو گیا جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کو وہم ہو گیا تھا کہ جناب رسول اللہ صلعم نے حج اور عمرہ کا تلبیہ نہیں کیا جیسا کہ ۲۳ میں گزرا۔

لہ اس حدیث میں اجمال ہے تفصیل یہ ہے کہ تمتع اور قران کرنے والے پر واجب ہے کہ وہ منیٰ میں یوم النحر میں شکریہ کے طور پر قربانی کرتا ہے اگر قربانی کا جانور میسر نہ آئے تو دس روزے رکھنے پڑتے ہیں۔ تمتع اور قران کے بارے میں اس قدر تفصیل اور ہے کہ جو لوگ میقات ہی سے قربانی کا جانور اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں، ان کے لئے حلال ہونا نہیں ہے کہ عمرہ کر کے احرام کھولیں۔ ان کے احرام کا تعلق ھدی کے جانور سے ہے وہ جب قربانی سے فارغ ہوں گے اسی وقت احرام سے باہر آئیں گے۔ تمتع کرنے والے پر بھی چونکہ قربانی کرنا واجب ہے اس لئے وہ اپنے جانور کو یہاں سے خرید لے۔ اسکے احرام کا تعلق اس جانور سے ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ جب تمتع کرنیوالے کے ساتھ میقات سے جانور نہیں ہے تو لا محالہ۔ وہ اپنا جانور حل اور حرم کے درمیان ہی سے خریدیگا۔ اسی کی طرف اشارہ کیا ہے واللہ اعلم۔

احادیث کثیرہ مشہورہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یوم نحر تک آپ اپنے احرام سے حلال نہیں ہوئے تھے چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا تھا

لولا ان الھدی معی لاحللت — اگر میرے ساتھ ھدی نہ ہوتی تو میں حلال ہو جاتا

دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے

انی سقت الھدی وقرنت فلا احل حتی انحر — میں ھدی لایا ہوں اور قران کیا ہے اس لئے یوم نحر تک حلال نہ ہونگا۔

یہ خبر آپ نے اپنی ذات مقدس کے بارے میں دی ہے جس میں وہم کی گذر ہی نہیں ہو سکتی بخلاف دوسری احادیث کے خصوصاً وہ احادیث جو آپ کی ذات مقدس کے بارے میں خلاف واقع امر کو تبلا رہی ہیں۔ بلکہ احادیث کی ایک کثیر تعداد یہ تبلا رہی ہے کہ نہ آپ نے بالوں کو کٹوایا اور نہ منڈوایا۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت معاویہ نے عمرۂ جعرانہ میں سر کے بال کاٹے ہوں۔ اور بھول گئے ہوں اور یہ یاد رہا ہو کہ انھوں نے یہ عمل عشرہ ذی الحجہ میں کیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاید وہ بال اتنے ہوں جو مونڈنے والے نے چھوڑ دئے ہوں گے۔ اور یہ بال حضرت معاویہؓ نے حضرات صحابہ رضؓ کے درمیان تقسیم کر دیئے تھے چنانچہ ایک جانب کے بال حضرت ابو طلحہ کے ہاتھ آئے تھے اور دوسری جانب کے بال حضرات صحابہ نے آپس میں تقسیم کر لئے تھے۔ یہ بھی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا اور مروہ کے درمیان ایک سعی کے علاوہ دوسری سعی نہیں کی تھی۔ یہ سعی وہی تھی جو پہلی مرتبہ کی تھی۔ طوافِ رخصت کے بعد آپ نے سعی نہیں کی تھی

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ کی طرف اس حدیث کی سند میں غلطی ہوئی ہے اور یہ غلطی حسن بن علی سے ہوئی ہے چنانچہ راوی نے کہا ہے عن معمر عن ابن طاؤس حالانکہ سند یہ ہے عن ہشام بن حجیر عن ابن طاؤس۔ میں کہتا ہوں حضرت معاویہؓ کی حدیث بخاری شریف میں ہے۔

"میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال قینچی سے کاٹے"

اس سے زیادہ نہیں ہے۔مسلم شریف میں لفظ "مردۃ" کی زیادتی اور ہے جس روایت میں عشرۂ ذی الحجہ کا ذکر ہے وہ حدیث معلول ہے یا حضرت معاویہ کو وہم ہو گیا تھا۔قیس بن سعد نے کہا ہے۔یہ روایت عن عطار عن ابن عباس رضؓ ہے۔بہت سے علماء نے اسکا انکار کیا ہے۔قیس کہتے ہیں کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ واقعہ عشرہ ذی الحجہ میں پیش نہیں آیا۔بلکہ حضرت معاویہ کو اس حدیث میں وہم ہو گیا ہے۔کیونکہ اس حدیث کو ابوداؤد نے عن قتادہ روایت کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرات صحابہؓ سے کہا، کیا آپ حضرات جانتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں چیز سے منع کیا تھا؟ اور سمور کے چمڑے پر بیٹھنے سے منع کیا تھا؟ جواب دیا ہاں۔پھر کہا کیا آپ جانتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قران سے منع کیا تھا۔جواب دیا ایسا نہیں ہوا۔ حضرت معاویہ نے کہا، منع کیا تھا، آپ حضرات بھول گئے" میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حضرت معاویہ کو وہم ہوا۔یا (نعوذباللہ) وہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کبھی منع نہیں کیا" اور رابو شیخ، وہ شیخ ہیں جو اس حدیث سے استدلال نہیں کرتے اگرچہ اس کو قتادہ اور یحیٰی بن ابی کثیر کیوں نہ روایت کریں

حج تمتع کا دوسرا طریقہ

صاحب المغنی وغیرہ نے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تمتع کیا اور رسوق ھدی کی وجہ سے درمیان میں حلال نہیں ہوئے۔ان کا عذر حضرت عائشہ اور رابن عباسؓ کا یہ قول ہے

تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا

اور حضرت حفصہ کا یہ قول

ما شان الناس حلوا الم تحل من عمرتک	کیا وجہ کہ لوگ عمرہ سے حلال ہو چکے ہیں اور آپ حلال نہیں ہوئے

اور حضرت سعد کا قول گذر چکا ہے، اور حضرت ابن عمرؓ کا قول جو انھوں نے

سائل کے جواب میں فرمایا تھا:۔

ارأیت ان کان ابی نہی عنہا و صنعہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امر ابی تتبع ام امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال الرجل بل امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تبلاتو سہی۔ اگر میرے والد نے اس سے منع کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا تو کیا میرے والد کا امر قابل اتباع ہے یا حضور کا امر قابل اتباع ہے۔ اس آدمی نے کہا حضور کا عمل قابل اتّباع ہے۔

ان حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ اگر ھدی نہ لاتے تو حلال ہو جاتے۔ یہ حضرات اس متمتع کو بھی قارن کہتے ہیں، حالانکہ قران اور تمتع میں فرق ہے۔ اول یہ کہ، قارن وہ ہے جو ارکان حج کی ادائیگی سے پہلے ہی احرام باندھ لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قارن کے اوپر ایک ہی سعی ہے یا تو اول میں کرے یا بعد طواف صدر کرے۔ اور تمتع کرنے والے کے اوپر دو سعی ہیں۔ امام احمد کا ارشاد ہے اس متمتع کے لئے بھی مثل قارن کے ایک ہی سعی کافی ہے، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف صدر کے بعد دوبارہ سعی نہیں کی۔ جب یہ بات ہے تو اس قول کی بنیاد پر بھی تمتع نہ ہوا بلکہ قران ہوا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ امام احمدؒ کی دوسری روایت کی بنا پر بھی تمتع ہی ہوا۔ اور اس قول کے حق میں حدیث صحیح موجود ہے جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے صفا اور مروہ کے درمیان پہلے طواف کے علاوہ نہیں کیا۔ حضرت طاؤس نے قسم کھا کر کہا ہے۔ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی نے بھی حج اور عمرہ کے لئے ایک طواف سے زیادہ نہیں کیا۔

اس قول کے قائلین نے کہا ہے یہ تمتع خاص تھا۔ حالانکہ سنت نبوی سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی مرتبہ سعی کی۔ حضرت

ابن عمرؓ نے ارشاد فرمایا ہے کہ :۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کا اور صفا و مروۃ کا ایک ہی مرتبہ طواف کیا اور اس سے زیادہ نہیں کیا۔ اور درمیان میں نہ بال منڈوائے اور نہ ترشوائے اور نہ احرام سے باہر آئے۔ یوم نحر جب ہوا تو آپ نے سر منڈوایا۔ اور حج و عمرہ کے لئے صرف ایک ہی مرتبہ طواف کیا۔

اس جگہ طواف اول سے مراد وہی طواف ہے جو صفا اور مروۃ کے درمیان کیا جاتا ہے دارقطنی نے بھی عطا اور نافع سے اور حضرت ابن عمرؓ اور حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ نے اپنے حج اور عمرہ کے لئے ایک ہی مرتبہ سعی اور طواف کیا، اور طواف صدر کے بعد کوئی طواف نہیں کیا۔

یہ روایت دو چیزوں میں سے ایک پر ضرور دلالت کرتی ہے۔ اول یہ ہے کہ آپ قارن تھے۔ یا ایسے متمتع تھے جس پر ایک ہی طواف اور سعی واجب ہوتی ہے لیکن قرانؓ والی احادیث جو گذر چکی ہیں ان سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کے جواب میں شعبہ کی سند سے حضرت عمران بن حصین کی روایت پیش کی جائے کہ " جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو طواف کئے اور دو سعی کیں۔ تو کہا جائے گا کہ یہ خبر معلول ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ محمد بن یحیٰ نے یہ حدیث اپنے حافظے سے بیان کی ہے ان کو اس کے متن میں وہم ہو گیا ہے۔

صحیح بات اس سند سے یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کیا ہے اور عنقریب وہ دلائل آرہے ہیں جن سے اس حدیث کا غلط ہونا ثابت ہو جائیگا۔ میرا خیال یہ ہے کہ شیخ ابو محمد کی رائے یہ ہے کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا تھا

کیونکہ امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ تمتع قران سے افضل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لئے افضل چیز ہی کو اختیار کیا ہے۔ اور متعدد وجوہات کی بنا پر انھوں نے کہا ہے کہ یہ تمتع خاص تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں باوجود اس کے امام احمدؒ نے فرمایا ہے" مجھے شک نہیں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ اور مروزی نے امام احمد سے روایت کیا ہے کہ جب ھدی کا جانور ساتھ لایا جائے تو قران ہی افضل ہوتا ہے اگر ھدی کا جانور ساتھ نہ لایا جائے تو تمتع افضل ہوتا ہے یہی طریقہ ہمارے شیخ ابن تیمیہ کا ہے

اس جگہ اس قدر اشکال اور باقی ہے کہ ھدی کے ساتھ قران کرنا افضل ہے یا ھدی نہ لائے اور تمتع کرے یہ افضل ہے؟ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں دو چیزوں میں تعارض ہے۔ ایک یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ ھدی لائے تھے۔ اور قران کیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لئے افضل ہی چیز کو اختیار کیا تھا؟ دوسری چیز یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔ اگر میں ھدی کے جانور نہ لاتا تو عمرہ کرتا" اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ ارشاد آپ نے احرام باندھنے کے وقت فرمایا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی خواہش کسی غیر افضل فعل کے لئے نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ ترجیح دینے کے قابل تمتع ہی ہے۔ اس جگہ قران کو ترجیح دینے والوں نے یہ کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افضل اور مفضول کی وجہ سے نہیں فرمایا تھا بلکہ حضرات صحابہؓ کے لئے یہ دشوار تھا کہ آپ تو محرم رہیں اور وہ اپنا احرام کھول دیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر ظاہر فرما دیا کہ میں تم لوگوں کی موافقت کو اختیار کرتا (لیکن عذر سوق ھدی کا ہے) اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تالیف قلوب کے لئے افضل کو چھوڑ کر مفضول کو بھی اختیار کر لیتے ہیں جیسا کہ آپ نے حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا تھا

لولا ان قومك حديثو عهد — اگر تیری قوم زمانہ جاہلیت سے قریب

بجاهلية لنقضت الكعبة وجعلت لها بابين — کی نہ ہوئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اس کے دو دروازے بنادیتا۔

اس میں تالیف قلوب کی وجہ سے اولیت کو ترک فرمایا ہے تو موجودہ حالت میں اولیت کی وجہ سے یہی اولی اور افضل ہوا، اسی طرح تمتع بلا ھدی کے، اس میں بھی دونوں چیزیں جمع ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس میں آپ کے لئے دونوں چیزوں کو جمع کر دیا ہے۔ یعنی فعل بھی اور تمنا بھی، اس لئے آپ کو دونوں اجر ملیں گے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نسک جس میں درمیان میں حلال ہونا بھی ہو اور ھدی کا جانور بھی ساتھ نہ ہو وہ اس سے افضل ہو جائے کہ جس میں درمیان میں حلال ہونا بھی نہ ہو اور ھدی کا جانور بھی ساتھ ہو؟ اور اگر کہا جائے کہ پہلی صورت میں تکرار احرام ہے۔ اور تجدید عبادت ہے اور قران میں تکرار احرام نہیں ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شعائر اللہ (سوق ھدی) والی عظمت موجود ہے جو تکرار احرام میں نہیں ہے پھر دوام احرام تکرار احرام کے برابر ہے لیکن سوق ھدی کا کوئی بدل نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے، تنہا حج افضل ہے یا یہ افضل ہے کہ حج اور پھر اس کے بعد عمرہ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معاذ اللہ ہم اس عبادت کو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لئے منتخب کیا ہے کسی کو افضل اور کسی کو غیر افضل نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اور بناہ بخدا اس سے بھی کہ ہم کسی نسک کے بارے میں یہ کہیں۔ کہ کوئی نسک جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے نہیں کیا۔ یہ اس سے افضل ہے کہ جو نسک آپ ہی کے امر سے صحابہؓ نے ادا کیا۔ اس حج کے برابر کوئی حج نہیں ہو سکتا، جس کو افضل خلق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کیا اور جو آپ کے امر سے ادا کیا گیا۔ جبکہ اس میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایسے سمندر موجود ہیں جو خشک ہی نہیں ہو سکتے۔

قران کا بیان

ایک قول یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کیا اور اس میں دو طواف اور دو سعی کیں، یہ قول فقہائے کوفہ کا ہے۔ ان حضرات کا عذر دار قطنی کی وہ روایت ہے جس کو اس نے عن مجاہد عن ابن عمرؓ روایت کیا ہے۔ اس میں ہے :-

طاف لهما طوافين وسعى لهما سعيين — آپ نے ان کے لئے دو طواف اور دو سعی کیں

اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے۔ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔ حضرت علیؓ نے بھی ایسے ہی کیا اور آخر میں ایسے ہی فرمایا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ آپ نے دو طواف اور دو سعی کیں۔ حضرت علقمہ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو طواف اور دو سعی کیں۔

اگر یہ سب روایات صحیح ہوں تو یہ عذر نہایت ہی حسین ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان روایات کا ایک حرف بھی صحیح نہیں ہے[1]۔ ابن عمرؓ کی حدیث کا یہ معاملہ ہے کہ

---

[1] اس جگہ علامہ نے حنفیہ کے مسلک کو غلط ثابت کرنے کے لئے کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے دو طواف اور دو سعی نہیں کیں، بلکہ ایک طواف اور ایک سعی کی تھی" پورا زور صرف کر دیا ہے۔ چنانچہ سطور ذیل میں علامہ نے بڑی قوت کے ساتھ راویوں پر جرح کی ہے" جو ہمارے نزدیک ناانصافی پر مبنی ہے۔ چنانچہ محدثین کی ایک بڑی جماعت نے حضرت علی رضہ، حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر رضہ کی طویل حدیث سے استدلال کیا ہے۔ علامہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں نہایت جزم کے ساتھ کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو طواف اور دو سعی کی ہیں۔ ایک سعی سوار ہو کر کی (باقی صفحہ ۱۶۸ پر)

اس میں حسن بن عمارۃ ہے۔ اور وہ متروک الحدیث ہیں حضرت علیؓ کی حدیث کو حفص بن ابی داؤد نے روایت کیا ہے۔ ان کے بارے میں امام احمد نے فرمایا ہے وہ متروک الحدیث ہیں۔ اور ابن خراش نے کہا ہے وہ جھوٹا ہے، حدیث وضع کرتا ہے اور اس میں محمد بن عبدالرحمن اور ابن ابی لیلیٰ بھی ہیں۔ وہ بھی ضعیف ہیں حضرت علیؓ کی دوسری حدیث کو عیسیٰ بن عبداللہ بن محمد بن عمرو بن علی نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے عیسیٰ کو مبارک بھی کہا جاتا ہے۔ اور وہ متروک الحدیث ہیں علقمہ والی حدیث میں ابو بردہ ہیں۔ دارقطنی نے ان کو ضعیف کہا ہے۔ اور اس سند میں اور دوسرے ضعیف بھی ہیں جیسے عبدالعزیز ان کے بارے میں یحییٰ نے کہا ہے وہ جھوٹے ہیں۔ اور حبیث ہیں۔ اور امام رازی اور امام نسائی نے کہا ہے متروک الحدیث ہیں عمران بن حصین کی حدیث کو، محمد بن یحییٰ ازدی نے روایت کیا ہے، اور انھوں نے صرف اپنے حافظہ سے بات کہی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امام احمد، ترمذی اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قرن بین حجۃ وعمرۃ اجزأ لھما طواف واحد	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے قران کیا، اس کے لئے ایک طواف ہی کافی ہے

ترمذی کی روایت میں ہے، اس کے لئے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے۔ اور بخاری و مسلم کی روایت میں حضرت عائشہؓ کی حدیث (جو گذر چکی ہے) اس میں بھی طواف واحد کا ذکر ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرما دیا تھا کہ تیرا طواف حج و عمرہ کے لئے کافی ہے۔ عبدالمالک نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے اسی قسم کی ایک حدیث روایت کی ہے وہ ثقہ ہیں۔ ائمہ حدیث ان کو میزان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کسی نے کلام نہیں کیا اور ان پر کسی نے جرح نہیں کی۔ البتہ حدیث شقع کی

صفحہ ۱۶۷ کا باقی، اور ایک سعی بدل کی (تالیف شیخ الحدیث) باقی صفحہ ۱۶۹ پر ملاحظہ ہو۔

امام ترمذی نے حضرت جابر رضؓ کی روایت میں بھی یہی روایت کیا ہے۔ اگر ترمذی کی اس روایت کو حجاج بن ارطاۃ کی وجہ سے مجروح قرار دیا جائے تو ان سے سفیان ثوری، شعبہ عبدالرزاق، ابن نمیر اور بہت سے لوگوں نے روایت کیا ہے۔ اور حجاج بن ارطاۃ پر زیادہ سے تدلیس کا عیب لگایا جاتا ہے۔ امام احمد نے ان کو حفاظ میں شمار کیا ہے۔ ابن معین نے ان کو غیر قوی کہا ہے اور کہا ہے کہ وہ تدلیس کرتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا ہے وہ جب حدثنا کہیں تو صادق ہیں۔

دارقطنی نے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت اسی طرح کی روایت کی ہے اس کی سند میں لیث بن ابی سلیم ہیں جن کی روایت کو اہل سنن نے لیا ہے اور امام مسلم نے بھی لیا ہے اور ابن معین نے کہا ہے "لا باس بہ"، عبدالوارث نے کہا ہے وہ علم کا برتن ہیں۔ امام احمد نے ان کو مضطرب الحدیث کہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے حضرات نے ان سے روایت کیا ہے۔ امام نسائی نے ان کو ضعیف کہا ہے۔ بہر حال ان کی حدیث درجہ حسن سے گری ہوئی نہیں ہے

بخاری و مسلم میں حضرت جابر رضؓ کی روایت حضرت عائشہ رضؓ کے بارے میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے تو اُن کو روتے ہوئے پایا۔ عذر دریافت کیا، تو کہا مجھے حیض آگیا ہے الخ۔ اس حدیث میں تین چیزیں ہیں ۱؎ یہ کہ قارن تھیں ۲؎ یہ کہ قارن کو صرف ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے ۳؎ ایسے عمرہ کی قضا واجب نہیں ہوتی ہے جس میں حیض آگیا ہو۔[۱]

صفحہ ۱۶۸ کا باقی۔ قارئین کرام برابر ملاحظہ فرما رہے ہوں گے علامہ اس مسلہ میں کس قدر مضطرب ہیں۔ اور کس قدر انھوں نے بیان میں انتشار سے کام لیا ہے۔ ہم علامہ کے انتشار کو بیان کرنے کے لئے آخر میں مستقل ایک باب کے تحت کہیں گے تاکہ حقیقت حال نہایت واضح طور پر سمجھ میں آجائے۔

۱؎ اس جگہ بھی علامہ نے اپنے مسلک کی رعایت کرتے ہوئے بات کہی ہے

حضرت عائشہ رضؓ نے اس واقعہ میں، طواف قدوم نہیں کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے طواف عرفات سے آنے کے بعد کیا تھا۔ اور جب یہ جائز ہے کہ طواف صدر میں سعی کر لینا کافی ہو جاتا ہے تو طواف قدوم میں سعی کر لینا بطریق اولیٰ جائز ہے۔ لیکن حضرت عائشہ رضؓ کو جب یہ عذر پیش آگیا اور وہ طواف اولیٰ نہ کر سکیں۔ لہٰذا جب عورتوں کو ایسا عذر پیش آجائے تو ان کو ایسے ہی کرنا چاہیئے جیسے حضرت عائشہ رضؓ نے کیا تھا، حج کو عمرہ پر داخل کر کے قارنہ ہو جائیں۔ اس طرح ان کو طواف صدر کی سعی کافی ہو جائے گی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے حضرت عائشہ رضؓ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

> حضرت عائشہ رضؓ کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دو طواف اور دو سعی نہیں کیں تھی کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "جن لوگوں نے حج اور عمرہ جمع کیا ہو وہ ایک طواف کریں۔ یہ حدیث متفق علیہ[۱] ہے

(اس جگہ علامہ نے قران کے بارے میں وہ احادیث پھر ذکر کر دی ہیں جن میں ایک طواف کا ذکر ہے اس کے بعد فرمایا ہے) جن حضرات صحابہ رضؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

---

[۱] ہم نے البدایہ والنہایہ کے حوالے سے ذکر کر دیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو طواف اور دو سعی کیں تھی۔ تفصیل آئندہ آئے گی۔

حج روایت کیا ہے انھوں نے روایت کیا ہے کہ سب لوگوں نے جب بیت اللہ کا طواف اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرلی تو حضور صلعم نے سب کو حلال ہوجانے کا حکم فرمایا۔ مگر ان لوگوں کو جو ھدی کا جانور لائے تھے ان کے لئے فرمایا کہ وہ یوم النحر میں حلال ہوں گے۔ ان میں سے کسی صحابیؓ نے کسی کے بارے میں یہ روایت نہیں کیا کہ دو طواف اور دو سعی کیں۔

جو روایت فقہار کوفہ نے حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودرضہ سے روایت کی ہے اس کے خلاف جعفر بن محمد نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے

ان القارن یکفیہ طواف واحد وسعی واحد	قارن کے لئے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے۔

اور جس روایت کو اہل عراق نے روایت کیا ہے وہ منقطع ہے اور اس کے رجال بھی مجہول اور مجروح ہیں۔ اور علمار نے اس پر طعن کیا ہے۔ چنانچہ ابن حزم نے کہا ہے جو قول بھی اس مسئلہ میں حضرات صحابہؓ کے متعلق نقل کیا گیا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے اور جو حدیث بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ کے متعلق اس بارے میں مروی ہے وہ موضوع ہے طاؤس نے قسم کھا کر کہا ہے کہ حضرات صحابہؓ نے ایک طواف سے زیادہ نہیں کیا ہے۔ ایسا ہی حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ سے ثابت ہے۔ یہ حضرات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ اس مسئلہ میں آثار بہت واضح ہیں کہ حضرات صحابہؓ نے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کی ہے۔ البتہ قران اور تمتع کے بارے میں حضرات علمار نے اختلاف کیا ہے کہ ان میں دو سعی ہیں یا ایک ہے۔ چنانچہ اس میں تین مذہب ہیں۔ امام احمدؒ وغیرہ کا قول ہے کہ ایک طواف اور ایک سعی ہے جیسا کہ ان کے بیٹے نے روایت کیا ہے۔

قلت لابی المتمتع کم یسعی	میں نے اپنے والد سے کہا تمتع

بین الصفا والمروۃ قال ان طاف طوافین فھو اجود وان طاف طوافاً واحدٍ فلا باس

صفا اور مروہ کے درمیان کتنی سعی کرے فرمایا اگر دو طواف کرے تو اچھا ہے اور اگر ایک کرے تو کچھ حرج نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں ایک قول ہمارے شیخ ابن تیمیہ کا گذر چکا ہے۔ واللہ اعلم

ایک قول یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج مفرد کیا۔ اور اس حج میں آپ نے تنعیم سے عمرہ کیا۔ اس مذہب والوں کے بارے میں مجھے کوئی دلیل معلوم نہیں کہ کس بنیاد پر کہتے ہیں۔

احرام کے بارے میں اختلاف

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ آپ نے تنہا عمرہ کا احرام باندھا تھا اور اسی کا تلبیہ کہا تھا۔

ان کا عذر یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا گیا کہ آپ متمتع ہیں۔ ان کے نزدیک متمتع وہ ہے کہ جو تنہا عمرہ کا احرام باندھے۔ اس کے بارے میں حضرت حفصہ کی حدیث گذر چکی ہے۔ باوجود اس کے اس سے بالکل یہ ظاہر نہیں ہے کہ آپ نے تنہا عمرہ کا احرام باندھا تھا، اور احادیث صحیحہ مشہورہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہے۔

حج مفرد کا بیان

کیا آپ نے حج مفرد کیا تھا؟ اس کے بارے میں کلام نہایت تفصیل سے گذر چکا ہے۔ یہ کسی سے منقول نہیں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا "لبیک بحج" کہا تھا۔ جن لوگوں نے ایسا نقل کیا ہے، ان کے خلاف صراحۃً روایات موجود ہیں۔

اور جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ آپ نے حج تو مفرد ہی کیا تھا لیکن بعد میں اس کے اوپر عمرہ کا احرام باندھ لیا تھا۔ کیونکہ اس طرح تمام احادیث جمع ہو جاتی ہیں۔ اور ایسی صحیح احادیث موجود ہیں کہ جن کی روشنی میں یہ کہنا آسان ہے کہ آپ نے ابتداءً حج کا احرام باندھا تھا۔ پھر حبیب خدا کا فرستادہ آپ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا

عمرۃ فی حجتہ" اس طرح آپ نے حج پر عمرہ کو داخل کر لیا۔ اس کے بعد آپ قارن ہو گئے۔ یہ چیز حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے ثابت ہے۔ یہ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ آپ ابتداءً احرام میں مفرد تھے پھر قارن ہو گئے۔

یہ کسی نے نہیں کہا کہ آپ نے احرام تو عمرہ کا باندھا تھا، لیکن اس کا تلبیہ نہیں کہا تھا بلکہ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آپ نے حج کا احرام باندھا اور اس کا تلبیہ بھی کہا۔ چنانچہ مروی ہے۔

خرجنا لانوی الا الحج — ہم حج ہی کی نیت سے نکلے تھے

اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے اولاً حج کا احرام باندھا تھا۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قران کی وحی آ گئی تو آپ نے حج اور عمرہ دونوں کا تلبیہ کیا۔ چنانچہ اس کو حضرت انسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے سنا اور صحیح فرمایا۔ اس طرح تمام احادیث میں اتفاق ہو جاتا ہے اور اضطراب ختم ہو جاتا ہے۔ اس قول کے قائل، حج پر عمرہ کو داخل کرنے کو جائز نہیں کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تخصیص تھی۔ دوسروں کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے تنہا حج کا احرام باندھا، اور حضرت انسؓ نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا اور یہ دونوں صاحب صادق ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ انھوں نے پہلے تو قران کا احرام باندھا تھا اور پھر تنہا حج کا احرام باندھا۔ ان چاروں حضرات نے جیسا سنا تھا ویسا ہی بیان کر دیا۔

حضرت عائشہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا اور دوسرے لوگوں نے بھی حج کا احرام باندھا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے حج مفرد کیا تھا اور اس کے بعد آپ قارن ہو گئے تھے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تخصیص کا دعویٰ کرنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ حضرت انسؓ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیدا ء میں ظہر کی نماز

ادا کی اور اس کے بعد بیدا کی پہاڑی پر چڑھے اور حج و عمرہ کا احرام باندھا حضرت عمر رضؓ کی روایت میں اسقدر اضافہ اور ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خدا کا فرستادہ آیا اور عرض کیا کہ آپ اس وادی مقدس میں نماز ادا کریں۔ اور کہیں "عمرۃ فی حجۃ"۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔

حضرت انس رضؓ نے ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ میں ظہر کی نماز پڑھی اور فرمایا "لبیک حجاً و عمرۃً"۔ بہرحال اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف موجود ہے۔ امام احمد سے اس بارے میں دو روایات موجود ہیں سب سے زیادہ مشہور روایت تو یہ ہے کہ عمرہ کو حج پر داخل کرنا جائز نہیں ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور آپ کے شاگرد جائز کہتے ہیں۔ ان کا اصول یہ ہے کہ قارن دو طواف کرے گا کیونکہ حج پر عمرہ کو داخل کر کے زیادتی عمل لازم ہو گئی ہے اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اس طرح قران کرنے میں صرف ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے۔

عمرہ پر حج کا احرام جن حضرت نے یہ کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا اور اس پر پھر حج کا احرام باندھا ان کا عذر حضرت ابن عمر رضؓ کا قول ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں عمرہ اور حج کے ساتھ تمتع کیا۔ آپ ذوالحلیفہ سے ھدی کے جانور ساتھ لے گئے تھے۔ متفق علیہ حدیث میں ہے

اھل بالعمرۃ ثم اھل بالحج	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ آپ نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا پھر اس پر حج کو داخل کر لیا تھا۔ اور اس کی تائید حضرت ابن عمر رضؓ کے عمل سے بھی ہو رہی ہے۔ انھوں نے حضرت زبیر رضؓ کے زمانہ میں عمرہ کا احرام باندھا اور کہا کہ میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے

اس عمرہ کے ساتھ اپنے اوپر حج کو بھی لازم کر لیا ہے" حضرت ابن عمرؓ نے "قدید" مقام سے ھدی بھی خرید لی تھی۔ اور پھر سفر کیا، وہ حج اور عمرہ دونوں کا تلبیہ کہتے تھے یہاں تک کہ مکہ میں داخل ہوئے۔ اور طواف کیا اور پھر صفا و مروہ پر سعی کی، اور اس پر کچھ زیادتی نہیں کی نہ سر منڈوایا اور نہ قربانی کی۔ جب یوم النحر آیا تو قربانی کی اور سر منڈوایا۔ ان کا خیال تھا کہ طواف اول حج اور عمرہ دونوں کا طواف ہے پھر فرمایا

هكذا فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے۔

بہر حال اس قول کے قائلین کا کہنا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ ابتدائے احرام میں متمتع تھے اور پھر قارن ہو گئے تھے ان حضرات کی دلیل پہلے قول والوں کی دلیل سے زیادہ قوی ہے جن کا کہنا ہے کہ حج پر عمرہ کو داخل کیا اور یہ بلا نزاع جائز ہے۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت عائشہ رضؓ کو امر فرمایا تھا کہ وہ حج پر عمرہ کو داخل کر لیں پس وہ قارنہ ہو گئیں۔

جہاں تک احادیث صحیحہ کا تعلق ہے ان سے اس قول کے قائلین کی تردید ہو رہی ہے چنانچہ حضرت انسؓ نے خبر دی ہے کہ انھوں نے ظہر کی نماز پڑھ کر حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث ہے کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حجۃ الوداع میں چلے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے جو عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ عمرہ کا احرام باندھے اور اگر میں ہدی کے جانور ساتھ نہ لاتا تو عمرہ کا احرام باندھتا (بہر حال) مسلمانوں میں سے بعض نے عمرہ کا احرام باندھا اور بعض نے حج کا۔ اور میں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اگر حضرت عائشہ رضؓ کی اس حدیث اور دوسری حدیث کو جمع کیا جائے "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا" اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ تنہا عمرہ کی نفی کر رہی ہیں۔ اور وہ قران والے عمرہ کی نفی

نہیں کر رہی ہیں اسی قران کا نام صحابہ رض نے تمتع رکھا تھا جیسا کہ گذر چکا ہے

یہ چیز تمہا حج کا احرام باندھنے کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ قران والا عمرہ حج کے ضمن میں ادا کیا جاتا ہے، اور اس کا جز ہوتا ہے۔ اور یہ بات حضرت عائشہ رض کے اس قول کے بھی منافی نہیں ہے کہ آپ نے تمہا حج کیا، کیونکہ جب اعمال عمرہ حج میں داخل ہو گئے تو وہ بالفعل حج ہی میں شمار ہونگے اور تلبیہ کے اعتبار سے بالقول حج میں شمار ہوں گے۔

یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عمر رض کی حدیث مذکور بالمعنی مروی ہے۔ اور یہ معنی اسی حدیث سے ماخوذ ہیں (جس میں حضرت ابن زبیر رض کے زمانے کا ذکر ہے) اس حدیث میں ایک ہی طواف پر اقتصار کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ روایت بالمعنی ہے اور یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ رض نے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی روایت کیا ہے۔ اور حضرت انس رض کی مذکورہ بالا حدیث میں بھی ایسا ہی ہے۔ اور رکھا ہے کہ خدا کی طرف سے وحی آئی تھی اور زہری کا قول بھی حضرت سالم کی روایت کے مطابق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام

بعض حضرات نے کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام مطلق تھا، اس میں کسی نسک کو معین نہیں کیا گیا تھا۔ ادا کرنے کے بعد جب آپ صفا اور مروہ کے درمیان تھے تب معین کیا تھا یہی ایک قول امام شافعی صاحب رح کا ہے۔ جس کے بارے میں "اختلاف الحدیث" میں صراحت ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے صحابہ رض کو فرما دیا تھا کہ جس کے پاس ھدی نہ ہوں وہ اپنے احرام کو عمرہ کا احرام قرار دیں

اس قول کے قائلین کا عذر وہ حدیث ہے جس کو حضرت عائشہ رض نے روایت کیا ہے کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حجۃ الوداع

میں نکلے الخ۔ طاؤس نے کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے نکلے اور حج وعمرہ میں سے آپ نے کسی چیز کا نام نہیں لیا، بلکہ حکم خداوند تعالیٰ کے حکم کے منتظر تھے چنانچہ جب آپ صفا و مروہ کے درمیان تھے تو اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا، اس کے بعد آپ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا "جس نے حج کا احرام باندھا ہوا ور اس کے ساتھ ھدی نہ ہو وہ اس کو عمرہ بنالے

حضرت جابر نے اپنی حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کو بیان کیا ہے (اس جگہ علامہ نے حضرت جابرؓ کی طویل حدیث کو نقل کیا ہے) حضرت جابرؓ نے فرمایا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ نہیں کیا۔ نہ آپ کے تلبیہ میں حج یا عمرہ کا ذکر تھا اور نہ قران کا"

(علامہ ابن قیم فرماتے ہیں) ان احادیث میں کسی نسک کے معین کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔ جہاں تک طاؤس کی روایت کا تعلق ہے وہ مرسل ہے۔ جو قوی مسند روایات کے مقابل نہیں پیش کی جاسکتی۔ اور اگر طاؤس کی روایت کو درست مان لیا جائے تو حکم خداوندی کا انتظار میقات تک کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، جیسا کہ گذر چکا ہے کہ خدا کا فرستادہ آیا اور اس نے کہا کہ آپ اس وادی مقدس میں نماز پڑھیں۔ لہٰذا جس حکم کا ذکر طاؤس نے کیا ہے وہ حکم قبل احرام نازل ہو چکا تھا۔ جس کی رو سے آپ کے لئے قران معین ہوگیا اور طاؤس نے کہا ہے کہ یہ حکم صفا و مروہ کے درمیان نازل ہوا ہے۔ وہ حکم فسخ تھا جس کا آپ نے اپنے صحابہ کو امر فرمایا تھا۔ آپ کے لئے حکم وادی میں نازل ہو چکا تھا۔

اور حضرت عائشہ رضؓ نے جو فرمایا ہے کہ ہم مدینہ منورہ سے چلے الخ اس کو قبل احرام پر محمول کیا جائیگا اور اگر بعد احرام پر محمول کیا جائے تو تمام روایات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا اور حضرت عائشہ رضؓ نے جو یہ ارشاد فرمایا ہے

"ہم تلبیہ کہتے تھے جس میں حج یا عمرہ کسی کا نام نہیں لیتے تھے!"

یہ چیز ابتدائے احرام کے بارے میں ہوسکتی ہے یہ نہیں ہے کہ اس پر استمرار رہا ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو سنا ہے۔ اور جنھوں نے آپ کے تلبیہ پر گواہی دی ہے۔ اس سے اس قول کی تردید ہو رہی ہے۔ اور اگر حضرت عائشہ رض کے اس قول کو صحیح مان لیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ حضرت عائشہ رض کو دیگر صحابہؓ کے احرام کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ حج کے معاملہ میں عورتوں کی روایت کے مقابلہ میں مردوں کی روایت زیادہ معتبر ہیں

جہاں تک حضرت جابرؓ کی روایت کا معاملہ ہے اس کے بارے میں یہ ہے کہ اس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ کی صفت کو بیان کیا گیا ہے، اس میں کسی احرام کی نفی نہیں ہے۔ بالفرض اگر یہ احادیث درست ہیں تو وہ احادیث جن سے اثبات ثابت ہو رہا ہے زیادہ قبول کے لائق ہیں۔

حضور کا حج

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطمی وغیرہ سے اپنے سر کو دھویا۔ اور جس جگہ آپ نے نماز پڑھی تھی وہیں تلبیہ کہا۔ اور اس کے بعد اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے تو پھر تلبیہ کہا۔ جب آپ بیداء کی پہاڑی پر پہونچے تو، حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں، قسم خدا کی آپ نے اپنے مصلی ہی پر احرام باندھ لیا تھا اور تلبیہ کہا تھا۔ اور تلبیہ میں کبھی آپ حج اور عمرہ کا نام لیتے تھے اور کبھی حج کا ہی، اس لئے کہ عمرہ حج کا جزو ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ آپ نے قِران کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمتع کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے حج مفرد کیا تھا۔

ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ واقعہ ظہر سے تھوڑا پہلے پیش آیا تھا۔ حالانکہ یہ ابن حزم کا وہم ہے کیونکہ محفوظ تر بات یہ ہے کہ یہ واقعہ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد کا ہے، کیونکہ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ واقعہ ظہر سے پہلے ہے۔ معلوم نہیں کہ ابن حزم نے یہ بات کہاں سے کہہ دی۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شجرہ کے پاس احرام باندھا تھا۔ اور حضرت انس رض نے کہا ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھی اور پھر سوار ہوئے۔ یہ دونوں روایتیں

بخاری و مسلم میں ہیں۔ اور جب دونوں روایتوں کو جمع کر لیا جاتا ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ظہر کے بعد احرام باندھا۔ اور تلبیہ کہا اور اسی تلبیہ کی آواز کو حضرات صحابہ رضؓ نے سُنا۔ اور آپ نے اپنے صحابہ رضؓ کو بھی امر فرمایا تھا کہ بلند آواز سے تلبیہ کہیں۔ اور آپ نے اپنا سفر کجاوہ پر بیٹھ کر کیا تھا نہ کہ محمل یا ہودہ میں بیٹھ کر۔

علماء کا اختلاف ہے کہ محرم کو محمل میں سوار ہونا جائز ہے یا نہیں۔ اس میں دو قول ہیں اور حضرت امام احمدؒ سے دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک روایت جائز ہونے کے بارے میں ہے اور یہی قول امام شافعیؒ کا ہے۔ اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا ہے۔ دوسرا قول عدم جواز کا ہے اور یہ امام مالکؒ نے فرمایا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ رضؓ کو تینوں نسک (افراد۔ قران تمتع) کے لئے اختیار دیدیا تھا کہ وہ جونسا بھی نسک چاہیں اختیار کریں۔ جب آپ مکہ مکرمہ سے قریب ہو گئے تو آپ نے صحابہ کو حکم دیدیا تھا کہ حج کو قران بنالیں اور پھر اُس کو واجب کر دیا تھا جب آپ مروہ پہاڑی پر تھے۔

ذی الحلیفہ میں جب آپ پہونچے تھے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اہلیہ محترمہ اسماء بنت عمیس کے یہاں بچہ پیدا ہوا جن کا نام محمد بن ابی بکر رکھا گیا۔ حضرت اسماء کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیدیا تھا کہ وہ غسل کریں اور پردہ کر کے سفر جاری رکھیں اور احرام باندھ لیں یہ قصہ سنن میں موجود ہے۔ اس سے تین چیزیں ثابت ہیں۔ ایک یہ ہے کہ محرم کو غسل کرنے کی اجازت ہے (۲) یہ کہ حائضہ اپنے احرام کے لئے غسل کر سکتی ہے (۳) یہ کہ حائضہ کا احرام صحیح ہوتا ہے۔

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ کہتے ہوئے سوار ہوئے۔ اور جو لوگ آپ کے ساتھ تھے وہ اس تلبیہ کو کم و بیش الفاظ میں کہتے رہے نہ آپ نے کسی کو انکار کیا اور نہ کسی کی تصویب فرمائی۔ جب آپ روحا میں پہونچے تو ایک شکار ہوا گورخر آپ کو

ملا آپ نے فرمایا اس کو رہنے دو ممکن ہے اس کا مالک آکر اس کو پالے پھر بعد میں اس کا مالک بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا اس گورخر کے بارے میں کیا رہا۔ تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ اس کو رفقاء سفر کے درمیان تقسیم کر دیں۔ اس واقعہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب کسی غیر محرم نے بذات خود شکار کیا ہو تو محرم کو اس کا کھانا جائز ہے۔ اس گدھے کا مالک محرم تھا یا نہیں، اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاید اس وقت تک ذوالحلیفہ نہ آئے ہوں گے۔ اس کی مثال ابو قتادہؓ کے قصہ میں بھی ملتی ہے۔

اس واقعہ میں یہ بھی دلیل ہے کہ ہبہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ زبان سے ہبہ کیا جائے (بلکہ ویسے ہی پیش کر دینے اور موہوب لہ کے قبضہ کر لینے سے بھی ہبہ پورا ہو جاتا ہے) اس واقعہ میں یہ بھی دلیل ہے کہ گوشت مع ہڈی کے اندازہ سے تقسیم کرنا جائز ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ شکار پر ملکیت اس وقت بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ جب ملکیت کے منافی کوئی چیز نہ پائی جائے اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ حمار وحشی کا کھانا جائز ہے۔ اور یہ بھی دلیل ہے کہ تقسیم کے معاملہ میں کسی کو وکیل بھی بنایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سے کوچ فرمایا اور آپ جب اثابہ میں روثیہ اور عرج کے درمیان پہونچے تو ایک ہرن تیر میں بندھا ہوا ملا۔ آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا یہاں اس طرح رہے کہ کوئی اس کو نہ دیکھ سکے اور سب گذر جائیں تب قافلہ سے آملے۔

اس ہرنی والے اور گورخر والے قصہ میں اس قدر فرق ہے، اس کو شکار کیا تھا، اور وہ حلال تھا، لیکن ہرنی کے بارے میں یہ تحقیق نہ تھی کہ اس کو کسی حلال نے شکار کیا ہے یا کسی محرم نے شکار کیا ہے۔ اسی احتیاط کی بنا پر اس کے پاس آدمی چھوڑا تھا تاکہ کوئی دوسرا نہ کھا سکے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محرم کا شکار حلال نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ عرج میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ کے پاس حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک ہی اونٹ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کا اونٹ ان کے غلام کے پاس تھا۔ چنانچہ غلام کے آنے تک آپ اسی جگہ رہے۔ غلام جب آیا تو اس نے خبر دی کہ اونٹ گم ہوگیا ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے غلام کو یہ کہہ کر مارنا شروع کیا "ایک ہی اونٹ تھا اور اسی کو تونے گم کردیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے جاتے تھے اور مسکراتے جاتے تھے اس محرم کو دیکھو یہ کیا کررہا ہے۔ ابوداؤد نے اسی واقعہ کی بناپر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے

کیا محرم اپنے غلام کو تادیب کرسکتا ہے؟

جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابواء میں پہونچے تو صعب بن جثامہ نے آپ کی خدمت میں گورخر کی ران پیش کی۔ مسلم کی روایت میں ہے "گورخر کا گوشت پیش کیا حمیدی نے سفیان سے روایت کیا ہے" کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گورخر کا گوشت پیش کیا۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ اس حالت میں پیش کیا کہ اس سے خون بہہ رہا تھا (گویا تازہ گوشت تھا) اور یہ بھی ہے کہ وہ مذبوحہ گورخر وہیں آکر ختم ہوا۔ یحیٰی بن سعید نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گورخر جحفہ میں پیش کیا گیا آپ نے بھی تناول فرمایا اور دوسرے لوگوں نے بھی کھایا۔ اگر یہ روایت محفوظ ہے تو اس کے اسناد صحیح ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں زندہ گورخر پیش کیا گیا تو اس کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کا گوشت قبول کیا

امام شافعی صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ اگر حضرت صعبؓ نے زندہ گورخر، خدمت اقدس میں پیش کیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محرم کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو ذبح کرے اور اگر گوشت پیش کیا تھا تو اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ نے یہ خیال کرتے ہوئے واپس کردیا ہوگا "ممکن ہے کہ اس کو آپ کی وجہ سے شکار کیا گیا ہو۔ حدیث جابرؓ میں اس کی وضاحت ہے۔ اور حدیث مالک جس میں زندہ گورخر کا ذکر ہے وہ اثبت ہے۔ میں

کہتا ہوں یحییٰ بن سعید کی حدیث غلط ہے کیونکہ واقعہ ایک ہی ہے اور تمام رواۃ کا اتفاق ہے کہ آپ نے گوشت کو نہیں کھایا۔ صرف اسی روایت میں کھانے کا ذکر ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ زندہ گورخر پیش کیا گیا۔ یا گوشت پیش کیا گیا۔ اس میں گوشت والی روایت تین وجہ سے زیادہ معتبر ہے (۱) یہ کہ اس کے راویوں نے واقعہ کو خوب محفوظ رکھا ہے حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس سے راوی کے حافظہ کا پتہ چل رہا ہے (۲) یہ کہ اس میں یہ صراحت ہے کہ وہ گورخر کا جز تھا۔ اور وہ گوشت ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا "اھدی لہ حمارا" اس سے تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ حمار بول کر، گوشت مراد لیا ہے اور اس کی نعت سے بھی تردید نہیں ہوتی ہے (۳) تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ یہ گوشت کا ٹکڑا تھا لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ کہاں کا ٹکڑا تھا؟ ران تھی یا کوئی اور جانب تھی؟ لیکن اس میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ ٹکڑا ایسا ہو کہ ران کے ساتھ سرین کا حصہ بھی آگیا ہوگا۔

ابن عیینہ نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا کہ یہ حمار تھا بلکہ انھوں نے بعد میں کہا کہ نہیں وہ گوشت تھا اور اس میں بھی تضاد نہیں ہے کہ آپ نے کھایا تھا، کیونکہ حضرت ابو قتادہ کا واقعہ حدیبیہ کے سال کا ہے اور یہ قصہ جس کو بہت سے راویوں نے ذکر کیا ہے حجۃ الوداع کا واقعہ ہے اور بہزی گورخر اور زید بن کعب سلمی البہزی کا واقعہ حجۃ الوداع میں پیش آیا تھا اس کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے لیکن تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ابو قتادہ والی روایت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے آپ کی وجہ سے شکار نہیں کیا تھا اور صعب والی حدیث کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ انھوں نے آپ کے لئے شکار کیا تھا۔ اس طرح اشکال دور ہو گیا اور اس کی تائید حضرت جابر رض کی روایت سے ہوتی ہے

صید البر لکم حلال ما لم تصیدوہ — خشکی کا وہ شکار تمہارے لئے حلال ہے جو

او یصاد لکم — نے نہ کیا ہو یا تمہارے لیے نہ کیا ہو۔

اگرچہ اس حدیث پر جرح کی گئی ہے کہ مطلب بن حنطب نے اس کو جابر رضہ سے روایت کیا ہے اور ان کا سماع ثابت نہیں ہے۔ نسائی نے کہا ہے کہ طبرانی نے حجۃ الوداع کے واقعہ میں بیان کیا ہے کہ حضرت ابو قتادہ رضہ نے راستہ میں شکار کیا تو وہ محرم نہیں تھے اسی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے لئے اس شکار کو اس وقت حلال قرار دیدیا تھا۔ آپ نے حضرات صحابہؓ سے دریافت فرمایا تھا

هل امره احد منكم بشيء — کیا تم سے کسی نے ان سے کہا تھا، یا

او اشار اليه — اشارہ کیا تھا۔

یہ دراصل مطلب بن حنطب کا وہم ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابو قتادہ کا واقعہ حدیبیہ کے زمانے کا ہے۔ بخاری و مسلم میں اسی طرح روایت کیا گیا ہے

جب آپ وادی عسفان میں پہونچے تو آپ نے حضرت ابوبکر رضہ سے دریافت کیا۔ یہ کون سی وادی ہے؟ جواب دیا یہ وادی عسفان ہے تب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ یہاں سے حضرت صالح اور حضرت ہود علیہما السلام گذرے تھے۔ وہ جبا پہنے ہوئے تھے اور بالوں کی چادریں اوڑھے ہوئے تھے اور تلبیہ کہتے تھے انھوں نے بیت اللہ کا حج کیا ہے اس کو امام احمدؒ نے بھی مسند میں ذکر کیا ہے۔

جب آپ سرف میں پہونچے تو حضرت عائشہ رضہ کو حیض آگیا اور وہ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس پہونچے۔ دیکھا تو وہ رو رہی تھیں آپ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے بتلایا کہ وجہ یہ ہے۔ تب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا " آدم کی بیٹیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ لازم کر دیا ہے اور فرمایا جس طرح حاجی کرتے رہیں تم بھی کرتی رہو، ہاں بیت اللہ کا طواف نہ کرنا۔

حضرت عائشہ رضہ کے قصہ میں علماء کو اختلاف ہے کہ وہ تمتع کر رہی تھیں یا حج مفرد؟

اگر وہ تمتع کررہی تھیں تو کیا انھوں نے عمرہ ترک کردیا تھا یا حج مفرد کی طرف کو احرام منتقل کردیا تھا۔ اور قارنہ ہوگئیں تھی؟ اور کیا وہ عمرہ جو انھوں نے تنعیم سے ادا کیا تھا، واجب تھا یا نہیں؟ اور اگر واجب نہیں تھا تو کیا وہ عمرۂ اسلام کا بدل تھا؟

حضرت عائشہ رض کے حیض آنے کے مقام میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ اس مسئلہ میں ہم اللہ تعالیٰ کی مدد سے بیان شافی کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رض کے قصہ میں فقہاء کا بھی اختلاف ہے (جیسا کہ حضرت عائشہ رض کے عمرہ کے بارے میں ابھی ذکر ہو چکا ہے) پہلا قول فقہاء کوفہ کا ہے ان میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا نام لیا جاتا ہے۔ دوسرا قول فقہاء حجاز کا ہے۔ ان میں امام شافعی اور امام مالک ہیں اور یہی مسلک اہل حدیث کا ہے اور ان ہی میں امام احمد کا نام لیا جاتا ہے۔ فقہاء کوفہ نے کہا ہے کہ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رض کی حدیث جو عروہ نے روایت کی ہے (جس میں ہے سر کھول دے اور بالوں میں کنگھی کرے)

اس حدیث کے بارے میں ان حضرات نے کہا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متمتعہ تھیں اور انھوں نے عمرہ کو چھوڑ کر حج کا احرام باندھا تھا، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا " اپنا عمرہ چھوڑ دے الخ اگر وہ احرام میں رہتیں تو ان کے لئے جائز نہیں تھا کہ وہ سر میں کنگھی کریں اور جو عمرہ انھوں نے تنعیم سے ادا کیا تھا اس کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا یہ عمرہ اس عمرے کی جگہ ہے۔ اگر پہلا عمرہ باقی تھا تو، یوں نہ فرماتے، بلکہ وہ عمرۂ مستقلہ ہوتا۔ جمہور نے کہا ہے کہ اگر عائشہ رض کے قصہ میں خوب غور کیا جائے اور تمام طرق کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ قارنہ تھیں اور پہلا عمرہ اُنھوں نے چھوڑا نہیں تھا۔ چنانچہ مسلم میں حضرت جابر رض کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رض نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جب ان کو سرف میں حیض آگیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ان سے دریافت کیا تو جواب میں کہا:-

"مجھے حیض آگیا ہے۔ لوگ حلال ہو چکے ہیں اور میں ابھی
حلال نہیں ہوئی اور نہ میں نے طواف کیا۔ اور لوگ ارکان
حج ادا کرنے لگے تب جناب رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا
تھا، یہ تقدیر الٰہی ہے جو آدم کی بیٹیوں کے لئے لازم ہے
لہٰذا غسل کر اور حج کا احرام باندھ لے، اور پاک ہونے
تک تمام جگہوں میں جاؤ۔ پاک ہونے کے بعد بیت اللہ کا
اور صفا و مروہ کا طواف کرو۔

اس وقت حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا حضور! میرے دل میں یہ بات ہے کہ میں جب تک ارکان حج ادا نہ کر لوں بیت اللہ کا طواف نہ کروں۔ آپ نے ارشاد فرمایا، عبدالرحمن کے ساتھ جا کر تنعیم سے عمرہ کر لو!

مسلم شریف میں طاؤس کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے عمرہ کا احرام باندھا تھا اور ابھی طواف نہیں کیا تھا کہ حیض آگیا، انھوں نے تمام مناسک ادا کئے۔ رخصت کے دن حضور صلعم نے ان سے ارشاد فرمایا تھا "تمہارا حج والا طواف اور سعی" عمرہ کے لئے بھی ہو گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ حج اور عمرے کے احرام میں تھیں نہ کہ تنہا حج کے احرام میں۔ اور اس روایت میں صراحت ہے کہ قارن کے لئے ایک طواف اور سعی کافی ہے اور یہ بھی صراحت ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے عمرہ کا احرام نہیں چھوڑا تھا بلکہ وہ اپنے احرام میں باقی تھیں اور بعض حدیث کے الفاظ میں صراحت ہے۔ "اپنے عمرہ میں باقی رہو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ عطا کرے گا" یہ ارشاد اور پہلے ارشاد "کہ اپنا عمرہ چھوڑ دے" کے خلاف نہیں ہے اس لئے کہ اگر ترک کرانا مقصود ہوتا تو یہ نہ فرماتے۔ "تیرے حج اور عمرہ دونوں کے لئے یہ طواف کافی ہے"، اس سے اعمال عمرہ کو چھوڑنا مراد ہے نہ کہ احرام عمرہ کو، یہ بات بہت سے لوگوں سے پوشیدہ رہی ہے۔ اس وجہ سے

اس بارے میں چار قول ہو گئے ہیں:۔

ایک قول یہ ہے کہ اس حدیث میں عمرہ کے ترک پر دلیل ہے۔ یہ مسلک حنفیہ کا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ محرمہ کے لئے سر میں کنگھی کرنا جائز ہے۔ اور کتاب وسنت اور اجماع اُمت سے اس کی ممانعت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ قول ابن حزم وغیرہ کا ہے تیسرا قول یہ ہے کہ اس حدیث کے راوی صرف عروہ ہی ہیں۔ انھوں نے تمام روایات کے خلاف یہ روایت بیان کی ہے۔ اور قاسم اور اسود، طاؤس نے حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث روایت کی ہے۔ ان میں سے کسی نے ان الفاظ کو بیان نہیں کیا ہے۔ بلکہ حماد نے عروہ کی روایت ذکر کی ہے اور اس حدیث میں کہا ہے کہ بہت سے راویوں نے یہی ذکر کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا تھا "اپنا عمرہ چھوڑ دے اور سر میں کنگھی کر لے اس سے صاف ظاہر ہے کہ عروہ نے یہ اضافہ حضرت عائشہ رضؓ سے نہیں سنا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ حدیث میں "دعی عمرتک" یعنی اپنا عمرہ چھوڑ دینے سے مراد یہ ہے کہ اس وقت عمرہ رہنے دو، اس سے باہر نہ آؤ (جب حیض آنا بند ہو جائیگا تب پورا کر لینا) یہاں ترک مراد نہیں ہے اور اُس کی دو وجہ ہیں (۱) آپ نے ارشاد فرمایا کہ تیرا طواف اور سعی حج اور عمرہ دونوں کے لئے کافی ہے" (۲) آپ نے ارشاد فرمایا اپنے عمرہ میں باقی رہو"

لہذا حدیث کا یہ مطلب مراد لینا، ترک اور رفض والے معنی سے زیادہ بہتر ہے۔ امام اثرم نے اپنی سنن میں حضرت اسودؓ والی روایت ذکر کی ہے، اس میں ہے کہ میں نے حضرت عائشہ سے دریافت کیا، "کیا آپ نے حج کے بعد عمرہ کیا تھا؟ تو فرمایا قسم خدا کی عمرہ بیت اللہ کی زیارت ہی کا تو نام ہے" امام احمد نے فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ کی اس آہ وزاری کے بعد کہ لوگ دو دو نسک ادا کر چکے ہیں میں نے ابھی ایک بھی ادا نہیں کیا ہے"، حضرت عبدالرحمٰنؓ کو ان کے ساتھ حل تک بھیج کر عمرہ کرا دیا تھا۔

حضرت عائشہ رضؓ کا احرام

حضرت عائشہ کے احرام کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں (۱) یہ کہ وہ عمرۂ مفردہ کا احرام تھا اور یہی صحیح ہے۔ اس کے متعلق ہم احادیث صحیحہ ذکر کر چکے ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ ہم مدینہ منورہ سے چلے۔

فکنت انا ممن اھل بعمرۃ۔ میں وہ تھی جس نے عمرہ کا احرام باندھا تھا

اور جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "دعی عمرتک" یہ آپ نے سرف میں جو مکہ معظمہ کے قریب ہے، فرمایا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کا احرام، عمرہ کا احرام تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے پہلے حج کا احرام باندھا تھا۔ جیسا کہ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ قاسم بن محمد، اسود بن یزید، نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ حج کا احرام تھا نہ کہ عمرہ کا۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا ہے کہ ہم مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور حج کے علاوہ ہم کسی چیز کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ علامہ عبدالبر نے کہا ہے "عروہ وغیرہ نے غلطی کی ہے جو یہ کہہ دیا ہے کہ "میں نے عمرہ ہی کا احرام باندھا تھا" اسماعیل بن اسحٰق نے کہا ہے۔ اسود اور قاسم کا اس پر اتفاق ہے اور وہ روایات جو عروہ سے مروی ہیں ان کے بارے میں کہا ہے کہ عروہ نے غلطی کی ہے۔ حضرت عروہ کو شبہ ہو گیا، چونکہ حضرت عائشہ رضؓ کے لئے بیت اللہ کا طواف کئے بغیر ممکن نہ تھا کہ وہ حلال ہو جائیں اس لئے معلوم ہوا کہ وہ عمرہ تھا۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا تھا

ان تترک الطواف وتمضی علی الحج یہ کہ طواف چھوڑ دے۔ اور حج کرے۔

اس سے راویوں کو وہم ہو گیا کہ حضرت عائشہ معتمرہ تھیں جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک کرا دیا تھا اور حج شروع کرا دیا تھا۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ حضرت جابر رضؓ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ معتمرہ تھیں علماء نے کہا ہے کہ حضرت عروہ کو جو غلط فہمی ہوئی وہ اس سے ہوئی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرما دیا تھا "سر کھول لے

اور کنگھی کرلے اور عمرہ چھوڑ کر حج کا احرام باندھ لے۔

حماد بن زید نے حضرت عروہؓ سے بھی یوں ہی روایت کیا ہے جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت عروہؒ نے حضرت عائشہ رضؓ سے براہ راست ایسا نہیں سنا تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ بے انتہا تعجب کی بات ہے نصوص صریحہ کے ہوتے ہوئے یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ مفردہ تھیں، زیادہ سے زیادہ حضرت عائشہ رضؓ کے اس قول سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ہم جناب رسول اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے اور ہم حج کے علاوہ کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

قسم خدا کی انتہائی تعجب ہے، کیا متمتع کے بارے میں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ حج کے علاوہ کسی دوسری چیز کے لئے نکلا ہے بلکہ وہ حج کے لئے متمتع ہو کر نکلا ہے جیسا کہ جنابت کا غسل کرنے والا ابتداً وضو کرتا ہے کیا وہ کہے گا میں وضو کے لئے نکلا ہوں۔ ایسے ہی حضرت عائشہ رضؓ نے بالکل سچ فرمایا ہے اور حضرت عائشہ رضؓ کا کلام آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے۔

حضرت جابر رضؓ کی روایت بخاری و مسلم میں ہے۔ انھوں نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا "ہم نے عمرہ کا احرام باندھا" ایسے ہی طاؤس کی روایت مسلم میں ہے۔ اور ایسے ہی مجاہد نے روایت کیا ہے۔ پس اگر یہ سب روایات آپس میں متعارض ہو جائیں (تو ان تابعین کے مقابلہ میں) حضرات صحابہ رضؓ کی روایات کو اولیت حاصل رہیگی

اس سے زیادہ تعجب اس پر ہے کہ ان علماء کرام نے حضرت ابن عمر رضؓ کی روایت اس طرح نقل کردی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کے ساتھ حج کا تمتع کیا۔ اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ چونکہ آپ کے صحابہ نے آپ کے امر سے تمتع کیا تو کیوں نہ حضرت عائشہ رضؓ کے قول کی تاویل بھی اسی طرح کرلی جائے کہ ان کے قول "منا" سے مراد جنس صحابہ ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضؓ کا یہ قول "فعلنا" ایسا ہی ہے جیسا کہ "خرجنا" ہے اور "سافرنا"

ہے۔ وغیرہ ذالک۔ لہٰذا یہ قطعی طور پر متعین ہے کہ اگر یہ روایات غلط نہیں ہیں تو ان کو احادیث صریحہ اور صحیحہ پر محمول کیا جائے گا۔ اس طرح حضرت عروہ کو بھی غلطی کے ساتھ منسوب نہیں کیا جائے گا جبکہ وہ حضرت عائشہ رضہ کے اقوال کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضہ سے براہ راست سننے والے ہیں۔

حضرت عروۃ کا حماد والی روایت میں یہ کہنا کہ بہت سے حضرات نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضہ سے فرمایا تھا "اپنا عمرہ چھوڑ دے۔ الخ۔ یہ قول بھی تعلیل کا محتاج ہے اور وہ یہ ہے کہ حماد بن زید اس روایت میں منفرد ہیں بلکہ ایک بڑی جماعت نے حضرت عروۃ سے متصلاً روایت کیا ہے لہذا تعارض کی صورت میں اکثریت کی روایت کو شرف قبول حاصل رہے گا۔

قسم خدا کی، اس شخص کی کس طرح تغلیط کی جا سکتی ہے جو حضرت عائشہ رضہ کی احادیث کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔ اور چاروں راویوں یعنی حضرت عروہ، جابر رضہ، طاؤس اور مجاہد نے حضرت عائشہ رضہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے عمرہ کا احرام باندھا پس اگر قاسم، عروۃ اسود کی روایات ان چاروں کی روایت کے خلاف ہے تو اکثریت کی وجہ سے ان چاروں کی روایت کو قبول کرنا اولی ہے اور جبکہ ان میں جابرؓ اور عروۃ جیسے حضرات بھی موجود ہیں تو پھر کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔

یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضہ کو طواف کے ترک کرنے اور حج کرنے کا امر فرمایا تو اس سے ان حضرات کو یہ خیال ہو گیا کہ وہ معتمرہ تھیں۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضہ کو عمرہ کے ترک کرنے کا اور صرف حج کرنے کا امر فرما دیا تھا، کیونکہ آپ نے "استمری" اس پر قائم رہو کا لفظ نہیں فرمایا تھا۔ راوی کو کیسا مغالطہ ہو گیا ہے کہ اس نے کتاب وسنت اور اجماع کا خیال کئے بغیر کہ محرم کو کنگھی کرنا جائز نہیں ہے۔ اپنی رائے کی تردید کے خوف سے کیسی روایت کر دی۔

صورت حال یہ ہے کہ اگر محرم کو بالوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کو کنگھی وغیرہ کرنے کی ممانعت نہیں ہے اور اگر ہو تو کرنا جائز نہیں ہے یہ مسئلہ محل نزاع ہے۔ اور اس مسئلہ میں اختلاف رکھنے والوں کے لئے کتاب و سنت اور اجماع اُمت ہی سب سے بڑی دلیل ہے اُس کو ملاحظہ فرمائیں

حضرت عائشہؓ کا عمرہ

جو عمرہ حضرت عائشہ رضؓ نے تنعیم سے کیا تھا، اس میں علماء کے چار مسلک ہیں (۱) یہ عمرہ حضرت عائشہ رضؓ کا دل خوش کرنے کے لئے ایک قسم کی زیادتی تھی، اُن کا طواف اور سعی، ان کے حج اور عمرہ کے لئے تھا۔ پہلے وہ متمتعہ تھیں پھر انھوں نے عمرہ پر حج کو داخل کر کے قران کیا۔ یہ سب سے زیادہ صحیح قول ہے احادیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں یہی مسلک امام شافعی امام احمد وغیرہ کا ہے۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ جب ان کو حیض آگیا تو ان کو حکم دیدیا گیا تھا کہ وہ عمرہ ترک کر دیں اور حج مفردہ کریں جب وہ حج سے فارغ ہو گئیں تو پھر عمرہ کیا اور یہ قضا تھا۔ اور یہ امام ابو حنیفہ رحؒ کا مسلک ہے۔ اس قول کی بناء پر یہ عمرہ واجب تھا، اور پہلے قول کی بناء پر یہ عمرہ جائز تھا۔ اس طرح ان دونوں مسلک کی رو سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ ہر وہ عورت جس کو وقوف عرفہ سے قبل حیض آجائے اس کو چاہئے کہ وہ یا تو عمرہ پر حج کو داخل کر لے یا عمرہ سے حج کی طرف منتقل ہو جائے اور مفردہ ہو جائے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ رضؓ قارنہ ہو گئیں اور حیض کی وجہ سے عمرہ کی ادائیگی ان سے نہ ہو سکی تو انھوں نے ایسا کیا۔ یہ امام احمد کا دوسرا قول ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ انھوں نے شروع سے ہی حج مفردہ کا احرام باندھا تھا اور حیض کی وجہ سے طواف قدوم ادا نہ کر سکیں تھیں۔ اسی وجہ سے اس عمرہ کی قضا کی تھی۔ یہ مسلک قاضی اسماعیل بن اسمٰعیل بن اسحٰق وغیرہ مالکیہ کا ہے۔ یہ مسلک سب مسلکوں سے زیادہ کمزور ہے

حضرت عائشہ رضؓ کی اس حدیث سے مناسک حج کے بہت سے عظیم احکامات حاصل

ہوئے ہیں (۱) قارن کے لئے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے (۲) حائضہ سے طواف قدوم ساقط ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت صفیہ کی حدیث سے رخصتی طواف کا سقوط ثابت ہے (۳) حائضہ کے لئے جائز ہے کہ وہ عمرہ پر حج کو داخل کرے جیسا کہ طاہرہ کے لئے جائز ہے (۴) حائضہ ارکان حج ادا کرے گی البتہ طواف کرنے کی اس کو اجازت نہیں ہے (۵) تنعیم حل میں شمار ہوتا ہے نہ کہ حدود حرم میں (۶) ایک ہی سال میں دو عمرے کرنا جائز ہیں (۷) تمتع کرنے والے کے حق میں یہ جائز ہے کہ وہ عمرہ پر حج کا احرام باندھ لے (۸) مکہ میں رہتے ہوئے بھی عمرہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ غیر مکی کے لئے مستحب یہی ہے کہ وہ باہر سے عمرہ کرے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے مکہ سے عمرہ نہیں کیا بلکہ حضرت عائشہ رضؓ کا عمرہ ثابت ہے۔

دوسرا اختلاف حضرت عائشہ رضؓ کے عمرہ کے سلسلہ میں دوسرا اختلاف یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کا یہ عمرہ، عمرۃ الاسلام کا قائم مقام ہو گیا۔ اس میں فقہاء کے دو قول ہیں۔ اور امام احمدؒ کی اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ جس عمرہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز رکھا ہے وہ عمرۂ تمتع ہے جس کا احرام میقات سے باندھا جاتا ہے۔ دوسرا عمرہ، عمرۂ مفردہ ہے جس کے لئے مستقل سفر کیا جاتا ہے، جیسا کہ عمرۂ حدیبیہ تھا۔ ان دو عمروں کے علاوہ اور کوئی تیسرا عمرہ نہیں ہے جو جائز ہو لیکن حضرت عائشہ رضؓ کا تنعیم سے عمرہ کرنا یہ محض زیادتی تھی۔ ورنہ ان کے لئے صرف عمرۂ قران کافی تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قران والا عمرہ، عمرۂ اسلام یا عمرۂ واجبہ کا قائم مقام ہو جاتا ہے (اس جگہ علامہ نے پھر ان احادیث کا اعادہ کیا ہے جو بہت مرتبہ مذکور ہو چکی ہیں۔)

تیسرا اختلاف حضرت عائشہ رضؓ کو جس جگہ حیض آنا شروع ہوا تھا، اس جگہ کا نام سرف ہی ہے البتہ طہر کی جگہ میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ عرفہ ہے۔ چنانچہ مجاہد نے روایت کیا ہے کہ وہ یوم عرفہ کو حائضہ تھیں۔ علامہ ابن حزم نے کہا ہے کہ اس حدیث کے دو معنی ہیں، ایک یہ ہے کہ انھوں نے وقوف عرفہ کی وجہ سے غسل کیا تھا۔ غالباً اسی وجہ

سے انھوں نے فرمایا تھا:

تطھرت بعرفت۔ — میں عرفات میں پاک ہوئی

قاسم نے ذکر کیا ہے کہ وہ یوم نحر میں پاک ہوئیں، چنانچہ مسلم میں حدیث موجود ہے قاسم اور عروۃ کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ عرفات میں حائضہ تھیں۔ اور یہ دونوں صاحب حضرت عائشہ رضؓ سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ ابوداوٗد نے اپنی سنن میں روایت ذکر کی ہے:۔

فلما کانت لیلۃ البطحا طھرت عائشۃ رضؓ — جب بطحا کی رات ہوئی تو حضرت عائشہ رضؓ پاک ہوئیں۔

اس حدیث کے اسناد صحیح ہیں۔ علامہ ابن حزم نے فرمایا ہے یہ حدیث منکر ہے کیونکہ بطحا کی رات یوم نحر سے چار راتیں گذار کر آئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضؓ سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس حدیث کو حماد بن سلمہ نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس پر یہ لفظ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حماد بن زید کی حدیث کو حماد بن سلمہ کی حدیث کے مقابلہ میں فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ حماد بن سلمہ سے زیادہ حافظ ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس حدیث میں حضرت عائشہ رضؓ نے خود اپنے بارے میں خبر دی ہے۔ تیسرے امام زہری نے عروۃ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا ہے:۔

فلم ازل حائضاً حتی کان یوم عرفۃ۔ — میں یوم عرفہ تک حائضہ رہی۔

اسی حدیث کو قاسم اور مجاہد نے ذکر کیا ہے۔ اور ان سے روایت کیا ہے کہ وہ عرفہ میں طاہرہ ہوئیں اور قاسم نے کہا ہے کہ یوم نحر میں طاہرہ ہوئیں۔ واللہ اعلم۔

جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرف میں پہونچے تو آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا جس کے پاس ہدی نہ ہو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ عمرہ کر لے اور جس کے پاس

ھدی ہو وہ عمرہ نہ کرے، اس کی حیثیت اختیار والی پوزیشن سے بہتر ہے۔

جب آپ مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے تو ہر اس شخص کو حکم دیا کہ جس کے پاس ھدی نہ تھی کہ عمرہ کرلے۔ اور احرام کھول دے اور جس کے پاس ھدی تھی وہ اپنے احرام پر قائم رہے سراقہ بن مالکؓ نے اس عمرہ کے بارے میں سوال کیا۔ کیا یہ بات اسی سال ہے یا ہمیشہ کے لیے یہ حکم ہے آپ نے ارشاد فرمایا ہمیشہ کے لیے یہی حکم ہے۔

ان العمرۃ قد دخلت فی الحج الی یوم القیامۃ — قیامت تک کے لئے عمرہ کو حج میں داخل کر دیا گیا۔

چودہ[۱۴] حضرات صحابہؓ نے آپ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فسخ حج الی العمرہ کا امر فرمایا تھا۔ ان سب کی احادیث صحیح ہیں۔ یہ چودہ حضرات یہ ہیں، حضرت عائشہ رضؓ، حضرت حفصہ رضؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضؓ، حضرت جابر بن عبد اللہ رضؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ حضرت براء بن عازبؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت ابن عباسؓ، حضرت سبرۃ بن معبد جہنیؓ حضرت سراقہ بن مالکؓ، اور ہم ان احادیث کی طرف اشارہ کریں گے اس جگہ علامہ نے ان تمام صحابہ رضؓ کی احادیث کا پھر اعادہ کیا ہے۔ تکرار کی وجہ سے ان کو ذکر نہیں کیا جا رہا ہے، اس کے بعد علامہ نے فرمایا، ان احادیث کو کبار تابعین نے روایت کیا، اور یہ ایسی نقل ہے کہ جس کی وجہ سے شک باقی نہیں رہتا ہے بلکہ یقین کرنا واجب ہو جاتا ہے، لہذا کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کا انکار کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا یہی مذہب ہے اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو موسیٰ رضؓ کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام اہل سنت اور امام الحدیث حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہی مسلک ہے۔ لیکن عبد اللہ بن حسن عنبری قاضی البصرۃ اور اہل ظاہر اور ان لوگوں کا مذہب جنھوں نے ان احادیث کے خلاف کیا ہے دوسرا ہے اور ان کے نزدیک

کچھ اعذار ہیں۔

پہلا عذر یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے دوسرا عذر یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہ رضؓ کے لئے خاص تھا تیسرا عذر معارضہ کا ہے ہم ان تمام اعذار کو ایک ایک کر کے بیان کریں گے اور ان کے جوابات دیں گے۔

پہلا عذر اس میں چار چیزوں کی ضرورت ہے اور ان حضرات نے ایک چیز بھی ایسی بیان نہیں کی جو نصوص کے معارض ہو۔ فسخ کا دعوی کرنے والوں نے ابوداؤد کی یہ روایت پیش کی ہے کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ارشاد فرمایا تھا:

اے لوگو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے متعہ کو حلال قرار دیا تھا پھر اس کو حرام قرار دیدیا

(اس کو بزار نے بھی روایت کیا ہے)

نہایت ہی تعجب کی بات ہے کہ یہ لوگ ایک مضبوط پہاڑ کے مقابلہ میں ایسی روایت لائے ہیں کہ جس کی نہ سند درست ہے اور نہ متن ہی درست ہے۔ رہا سند کا معاملہ اُس سے حجت قائم نہیں ہوسکتی اور متن کا معاملہ یہ ہے کہ اس جگہ متعہ سے مراد، عورتوں کے ساتھ متعہ کرنا ہے جس کو پہلے حلال قرار دیا تھا اور پھر بعد میں حرام قرار دیا۔ متعہ حج مراد نہیں ہے بلکہ وہ تو واجب ہے اور افضل نسک میں سے ہے یا کم از کم مستحب ضرور ہے یا جائز ہے اس کی حرمت کے بارے میں اُمت میں سے کسی کا قول نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بہت سے حضرات نے نقل کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا تھا:۔

اگر میں نے حج کیا تو تمتع کروں گا، اگر میں نے حج کیا تو تمتع کروں گا۔

اُس کو اثرم نے اپنی سنن میں اور عبد الرزاق نے اپنے مصنف میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ

سالم بن عبداللہ سے دریافت کیا گیا حضرت عمر رض نے تمتع سے منع فرمایا تھا۔ کہا نہیں جب نافع سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے منع کر دیا۔ حضرت ابن عباس رض نے بھی منع کیا ہے۔ ابن حزم نے اس جگہ کہا ہے کہ حضرت عمر رض سے اس بارے میں رجوع ثابت ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ جو چیز حضرت عمر رض کے نزدیک ثابت شدہ ہو۔ ان کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ انھوں نے رجوع کر لیا تھا کیونکہ حضرت عمر رض کی موجودگی ہی میں یہ واقعہ پیش آیا تھا جب سراقہ بن مالک رض نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ، کیا یہ حکم اس سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔ یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس سے فسخ کا دعویٰ باطل ہو گیا۔

دوسرا عذر اس کے بارے میں چند طرح پر استدلال کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ عبداللہ بن زبیر حمیدی نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے کہ:۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خاص کر ہمارے لئے ہی فسخ کیا تھا۔

لم یکن لاحد بعدنا ۔ یہ حکم ہمارے بعد کسی کے لئے نہیں تھا بلکہ یہ رخصت ہمارے لئے ہی تھی کہ ہم میں سے کوئی حج کو عمرہ برباد کرے۔

بزار نے یزید بن شریک سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت ابوذر رض سے دریافت کیا کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس بارے میں رخصت دیدی تھی یعنی متعہ کی

بزار نے دوسری روایت، حرث بن سوید کی نقل کی ہے کہ حضرت ابوذر رض نے ارشاد فرمایا:

والمتعۃ رخصۃ اعطاناھا ۔ حج میں تمتع رخصت ہے جس کو ہمیں جناب رسول اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیا۔

ابوداؤد نے سلیم بن اسود سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوذر رض نے ارشاد فرمایا:۔

"جس نے حج کیا پھر اُس کو فسخ کر کے عمرہ کیا، یہ کوئی چیز
نہیں ہے، کیونکہ یہ ان ہی لوگوں کے لئے تھا جو جناب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

مسلم میں حضرت ابوذر رض کی روایت یوں ہے کہ "حج میں تمتع صرف اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص ہے اور دوسرے الفاظ میں "خاص ہمارے لئے تھا۔" ایک روایت میں اس طرح بھی ہے:

لا تصلح المتعتان متعۃ النساء و متعۃ الحج الا خاصۃ لنا — دو متعہ بجز ہمارے کسی کے لئے نہیں ایک متعۃ النساء اور ایک متعۃ الحج

سنن نسائی میں سند صحیح سے حضرت ابوذر رض سے روایت ہے متعۃ الحج ہمارے علاوہ کسی کے لئے نہیں یہ صرف اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رخصت ہے اور سنن نسائی اور ابوداؤد میں بلال بن حارث کی حدیث ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ فسخ الحج الی العمرۃ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں ؟ کیا یہ ہمارے لئے ہی خاص ہے یا سب انسانوں کے لئے ہے ؟ تب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

بل لنا خاصۃ — نہیں بلکہ ہمارے لئے ہی خاص ہے

اس کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ سنن ابوداؤد میں ابراہیم تیمی کی سند سے مروی ہے کہ حضرت عثمان رض سے متعہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا "یہ ہمارے لئے تھا تم لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ بہرحال روایات کا یہ وہ مجموعہ ہے جس سے استدلال کیا گیا ہے کہ تمتع صرف حضرات صحابہ رض کے لئے ہی مخصوص تھا۔

دوسرے فریق نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ ان آثار سے منشا ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ آثار باطل ہیں، جس کی طرف ان کو منسوب کیا گیا ہے یہ نسبت صحیح نہیں ہے اور یہ آثار

نصوص کے معارض نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کا رفع ایسے شخص نے کیا ہے کہ جن کو حجۃ نہیں بنایا جا سکتا۔ چہ جائیکہ ان کو نصوص پر مقدم کیا جائے۔

امام احمد بن حنبل نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت ابوذر رضؓ کا یہ فرمانا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فسخ الحج الی العمرہ کا حکم دیا تھا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر رضؓ کی رائے ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ارشاد فرمایا ہے اور یہ حکم پوری اُمت کے لئے ہے۔ لہذا ان دونوں کا قول حضرت ابوذر کی رائے کے معارض ہوا تو نصوص صریحہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں دعویٰ اختصاص باطل ہے۔ کیونکہ وہ عمرہ جس کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، یہ وہ عمرہ تھا جو ہمیشہ کے لئے منسوخ ہوا تھا، یہ کسی زمانہ کے لئے مخصوص نہیں تھا" بہرحال حضرت ابوذر رضؓ کی مرویات میں سند کے اعتبار سے یہ سب سے زیادہ صحیح ہے اور اختیار کرنے کے لائق ہے۔

جب یہ چیز ظاہر ہوگئی کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کے امر اور آپ کے فعل میں اختلاف ہے۔ لہذا علماء میں سے بعض نے یہ کہہ دیا کہ یہ منسوخ ہے اور بعض نے یہ کہہ دیا کہ یہ مخصوص ہے اور بعض نے یہ کہہ دیا کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے خصوصیت یا منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ اصولاً خلاف ہے۔ لہذا اس قول کو قبول نہیں کیا جائیگا۔ اور جن لوگوں نے اس کی بقاء اور عمومیت کا دعویٰ کیا ہے، تو اس تنازع کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کیا جائے گا چنانچہ حضرت ابوذر اور حضرت عثمانؓ کے قول سے منسوخ اور خاص ہونے کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی ہے اور اس کا حکم عام ہے۔

عبداللہ بن احمدؒ نے کہا ہے کہ میرے والد صاحب نے فرمایا ہے۔ اگر حج کا احرام باندھے

والے نے بیت اللہ اور صفا و مروہ کا طواف بھی کر لیا ہے اس کو حق ہے کہ حج کا احرام توڑ کر عمرہ کا احرام باندھے اور متمتع کے بارے میں فرمایا۔ یہ آخر الامرین میں سے ہے اور منسوخ نہیں ہے، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

اجعلوا حجکم عمرۃ۔ اپنے حج کو عمرہ کر لو۔

عبداللہ نے کہا میں نے اپنے والد صاحب سے عرض کیا۔ حضرت بلال بن حرث کی حدیث سے تو منسوخیت معلوم ہوتی ہے؟ فرمایا، میں یہ نہیں کہوں گا، ان کی یہ حدیث کسی کو معلوم نہیں ہے اور اسناد بھی اس حدیث کے معروف نہیں ہیں۔

میں کہتا ہوں، امام احمدؒ کے قول سے جب یہ ثابت ہے تو ان کے قول سے خصوصیت ثابت کرنا محال ہے۔ لہٰذا ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ بلال بن حرث کی حدیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے اور غلط ہے۔ بلال بن حرث کی حدیث کو ثقہ راویوں کی حدیث سے مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں یہ حدیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وجہ سے بھی ثابت نہیں ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ وہ تمام عمر اس بارے میں حضرات صحابہ کی موجودگی میں مناظرہ کرتے رہے۔ چنانچہ کسی صحابی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ خصوصیت ہے۔ اور اگر ایسا ہوتا تو ظاہر ہوتا۔

اب رہا حضرت عثمانؓ کے ارشاد کا معاملہ، اس کے بارے میں بھی یہی عرض کیا جائے گا کہ اس کا حال بھی وہی ہے جو حضرت ابو ذرؓ کی روایت کا حال ہے نیز اس میں تین احتمال ہیں ۱۔ صحابہؓ کے ساتھ اختصاص کا جواز ۲۔ اختصاص کا وجوب۔ یہی ہمارے شیخ نے کہا ہے انھوں نے فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے حضرات صحابہؓ پر فسخ کرنا واجب ہو گیا تھا اور امت کے لئے صرف جواز اور استحباب کا معاملہ رہا، لیکن چونکہ حضرت ابن عباسؓ نے اس سے اختلاف کیا

ہے اور کہا ہے کہ یہ وجوب اُمت کے لئے قیامت تک کے لئے ہے لیکن میرا میلان طبع اپنے شیخ کے قول کی طرف ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بعد یہ کسی کو حق نہیں ہے میں نے جب ان تینوں احتمالات کو دیکھا تو پھر احادیث کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ مسلم میں حضرت ابوذرؓ کی حدیث موجود ہے (جو گذر چکی ہے) اُس کو مسلمانوں میں سے کسی نے اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اس کے جواز پر اتفاق ہے کہ یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے۔ اثرم نے کہا ہے کہ امام احمد نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم فرمائے۔ کتاب اللہ میں تو یوں موجود ہے۔

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ جس نے حج اور عمرہ کے ساتھ تمتع کیا

اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول فاسد ہے، بلکہ عمران بن حصین رضؓ کی حدیث بخاری و مسلم میں ہے کہ "ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمتع کیا مسلم شریف کے الفاظ یہ ہیں:-

قرآن پاک کی آیت متعہ۔ حج تمتع کے بارے میں نازل ہوئی اور
اس کا ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا، اس کے
بعد کوئی آیت ممانعت والی نازل نہ ہوئی اور جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیں منع نہیں فرمایا۔

اور یہ روایت گذر چکی ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے صاحبزادے سے دریافت کیا کہ آپ کے والد صاحب منع فرماتے ہیں تو جواب دیا میرے والد کا امر اتباع کے قابل ہے یا خدا کا امر اتباع کے قابل ہے"۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو لوگ معارضہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضؓ کا ارشاد پیش کرتے ہیں مجھے خوف ہے کہ کہیں ان پر آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ ارشاد فرمایا ہے۔ بہرحال یہ علماء کا جواب ہے۔ حضرت ابوذر اور حضرت عثمان جناب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے زیادہ عالم نہیں ہیں۔ حضور ہی کے ارشاد سے اس کا حکم قیامت تک کے لئے ثابت ہے۔ اور یہ حضرت علیؓ سعد بن وقاص، ابن عباسؓ اور بہت سے صحابہؓ سے ثابت ہے۔

جب حضرت عمرؓ نے منع کیا تھا تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ان سے دریافت کیا تھا۔ امیر المومنین! آپ نے یہ کیا ارشاد فرمادیا، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰؓ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں یہی فتویٰ دیا کرتے تھے کہ یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے اور حضرت عمرؓ کا اس بارے میں رجوع بھی ثابت ہے۔ واللہ اعلم

تیسرا عذر تیسرا عذر احادیث کا معارضہ ہے۔ ایک حدیث تو مسلم شریف میں عروہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حجۃ الوداع میں مدینہ منورہ سے چلے۔ اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "جس نے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور ھدی نہ لایا ہو وہ حلال ہو جائے۔ اور جو ھدی لایا ہو وہ یوم نحر میں حلال ہو اور جو حج کا احرام باندھے ہوئے ہو وہ اس کو پورا کرے۔

دوسری حدیث عن مالک عن اسود عن عروہ عن عائشہؓ بھی مسلم شریف میں ہے (اور اس کے معنی بھی یہی ہیں) ایک حدیث ابن شیبہ نے روایت کی ہے۔ اس میں حضرت عائشہؓ نے ارشاد فرمایا۔ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے اور ہم میں تین قسم کے آدمی تھے۔ الخ (اس جگہ علامہ نے پھر ان تمام احادیث کا اعادہ کر دیا ہے جس کو بہت مرتبہ بیان کر چکے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا ہے)۔

حضرت عائشہؓ کی تمام روایات آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ البتہ بعض راویوں نے زیادتی کی ہے اور بعض نے اختصار سے کام لیا ہے اور بعض نے روایت

بالمعنی کی ہے۔ قدر مشترک احادیث میں یہ ہے کہ حج کے اتمام کا امر فرمایا ہے۔ اگر یہ احادیث محفوظ ہیں تو یہی کہا جائیگا کہ یہ امر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا تھا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

امام بخاری نے حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کی روایت یوں ذکر کی ہے وہ فرماتی ہیں جب ہم حجون پہونچے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ پڑاؤ کیا۔ اس وقت ہمارے پاس ساز و سامان بہت کم تھا۔ لہذا میں نے اور میری بہن عائشہ رضؓ نے عمرہ کا احرام باندھا اور زبیر اور فلاں فلاں نے بھی عمرہ کا احرام باندھا۔ جب ہم بیت اللہ کا طواف کر چکے تو ہم حلال ہو گئے۔ اور اس کے بعد پھر حج کی عشا کو، حج کا احرام باندھا۔

یہ اتنی واضح بات ہے کہ جن لوگوں کو ذرا بھی علم حدیث سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت اسماء کا یہ ارشاد کہ "میں نے اور میری بہن نے عمرہ کا احرام باندھا" اہل نقل میں اس بارے میں اختلاف نہیں ہے اور ان میں سے کسی نے نہیں کہا کہ حضرت عائشہ رضؓ نے شروع ہی سے عمرہ کا احرام باندھا تھا اور اسی وجہ سے بعد میں تنعیم سے عمرہ کیا تھا۔

دوسری بات اسی حدیث میں یہ ہے کہ "بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد ہم حلال ہو گئے اور اس کے بعد حج کی عشاء کو حج کا احرام باندھا"۔ یہ بھی باطل ہے کیونکہ حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، ان سب نے روایت کیا ہے کہ حلال ہونے کا معاملہ دخول مکہ کے وقت پیش آیا۔ اور حج کا احرام یوم ترویہ کو باندھا۔ اور اس میں تین دن کا فاصلہ تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث نہ منکر ہے اور نہ باطل ہے۔ اس کے راوی ابو محمد نے اپنی فہم سے بات کہہ دی ہے۔ کیونکہ طواف بیت کے بارے میں حضرت اسماء نے جو خبر دی ہے وہ اپنے بارے میں اور ان کے بارے میں خبر دی

ہے جن کو حیض نہیں آیا تھا۔ یہ خبر حضرت عائشہؓ کے بارے میں نہیں ہے۔ ... ...
... ... بلکہ حضرت عائشہؓ حیض آنے کے وقت تک اپنے احرام پر باقی رہیں پھر اس پر حج کا احرام باندھ لیا اور قارنہ ہو گئیں۔ اور حضرت اسماءؓ کی حدیث حج کی عشار میں یوم ترویہ یہی مراد ہے۔

لیکن اسود نے حضرت عروۃؓ سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ اور مہاجرینؓ انصار کے بارے میں جو روایت کی ہے اس کا سب سے اچھا جواب حضرت ابن عباسؓ نے دیا ہے چنانچہ اعمش نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے ارشاد فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا۔ عروۃ نے کہا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے منع فرمایا ہے۔ جواب دیا جو لوگ ایسا کہتے ہیں مجھے ان کے بارے میں اندیشہ ہے۔ میں کہتا ہوں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے یوں فرمایا ہے (اس جگہ علامہ نے چند سند سے اس مناظرہ کو روایت کیا ہے) اس کے بعد علامہ نے فرمایا۔

اس کا ایک جواب ہمارے شیخ نے دیا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے تمتع سے منع نہیں فرمایا تھا بلکہ فرمایا تھا کہ حج اور عمرہ کو پورا کرو اور اُن کے درمیان کچھ فاصلہ رکھو! حضرت عمرؓ نے لوگوں کے لئے افضل چیز کو اختیار کیا ہے۔ یعنی دونوں چیزوں کو علیحدہ علیحدہ ادا کرنا، یہ صورت قران اور تمتع دونوں سے افضل ہے کہ ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ سفر کیا جائے۔ اور اسی کے بارے میں امام احمد، امام ابوحنیفہ، امام شافعیؒ، اور امام مالک کی تصریحات موجود ہیں۔ اسی مفرد حج کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ اسی کے بارے میں حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا ہے چنانچہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں کا ارشاد یہی ہے اس آیۃ مبارکہ کے بارے میں فرمایا:

اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ — اللہ کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو

فرمایا، اس جگہ اتمام سے مراد دونوں کو علیحدہ علیحدہ اس طرح پورا کرنا چاہیے کہ

مستقل سفر کیا جائے، چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضے ارشاد فرمایا تھا۔

اجرک علی قدر نصبک — تیرا ثواب تیری محنت کے بقدر ہے

لہٰذا حج کرنے والا جب اپنے گھر واپس ہو جائے تو پھر عمرہ کے لئے دوبارہ سفر کرے۔ یہ صورت کمال درجہ کی ہے اور دوسری تمام صورتوں سے افضل ہے۔ اسی کو حضرت عمرؓ نے لوگوں کے لئے اختیار کیا تھا، لہٰذا جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حضرت عمر رضنے منع کیا تھا انھوں نے غلطی کی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے ابراہیم نخعی کی سند سے، اسود بن یزید کی روایت نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضہ کے پاس عرفات میں، شام کے وقت بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی حضرت عمر رضہ کے پاس آیا۔ اس کے بالوں سے خوشبو آرہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، کیا تو محرم ہے؟ اس نے کہا ہاں، پھر فرمایا، تیری ہیئت تو محرم جیسی نہیں ہے۔ اس نے کہا میں نے تمتع کیا ہے اور میرے ساتھ میرے اہل ہیں۔ میں نے آج ہی احرام باندھا ہے۔ تب حضرت عمر رضہ نے فرمایا، ان ایام میں تمتع نہ کیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حضرت عمر رضہ کی رائے تھی۔ ابن حزم نے کہا ہے، یہ بھی خوب ہے؟ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھنے سے پہلے اپنی تمام ازواج کے پاس گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبل احرام وطی کرنا مباح ہے۔ واللہ اعلم

دوسرا مسلک جو لوگ فسخ حج الی العمرۃ کو منع کرتے ہیں انھوں نے دو طریقے بیان کئے ہیں۔ ہم ان دونوں طریقوں کو اور ان کے فساد کو بیان کرتے ہیں

پہلا طریقہ یہ ہے جس کے بارے میں اُنھوں نے بیان کیا ہے جبکہ حضرات صحابہ اور تابعین کا جواز فسخ کے بارے میں اختلاف ہے تو عبادات میں اکثر اہل علم کے نزدیک یہ

ہے کہ وہ کام نہ کریں۔ اسی میں عبادت کی حفاظت ہے اور دوسرا طریقہ یہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فسخ عمرہ کو جائز قرار دیا، تو غرض ... اس سے یہ تھی کہ اشہر حج میں عمرہ کرنا جائز ہے کیونکہ کفار مکہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو برا جانتے تھے۔ بہر حال یہ دونوں طریقے باطل ہیں۔

پہلا طریقہ تو اس وجہ سے باطل ہے کہ احتیاط کا معاملہ تو اس وقت ہے جب سنت موجود نہ ہو، لیکن جب سنت ظاہر ہے تو احتیاط سنت کے اتباع میں ہے اور اگر اختلاف سے بچنے کی وجہ سے احتیاط کو اختیار کیا جاتا ہے تب بھی اتباع سنت میں احتیاط ہے اور احتیاط کی دو قسم ہیں۔ ایک تو علماء کے اختلاف سے بچنے کے لئے۔ اور ان دونوں احتیاط میں ترجیح ظاہر ہے کہ سنت کو ہے۔ علاوہ ازیں اس مسئلہ میں احتیاط ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اس میں علماء کے تین قول ہیں (۱) حرام (۲) واجب (۳) مستحب اور یہ ظاہر ہے کہ ان تینوں اقوال کی موجودگی میں کس کس چیز سے احتیاط برتی جائیگی؟

دوسرے طریقہ کا باطل ہونا چند وجہ سے ہے ۱؎ یہ کہ اس سے قبل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین عمرے حج کے مہینوں (ذی قعدہ) میں کئے تھے جیسا کہ گذر چکا ہے لہذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو حج کے مہینوں میں عمروں کا جواز معلوم نہیں تھا ۲؎ یہ کہ بخاری و مسلم میں روایت موجود ہے کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے میقات پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو امر فرما دیا تھا کہ جس کا جی چاہے عمرہ کا احرام باندھے اور جس کا جی چاہے حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھے، اور اس وقت تمام مسلمان موجود تھے۔ لہذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان کو حج کے مہینوں میں عمرہ کا جواز معلوم نہیں تھا ۳؎ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا تھا کہ جو ھدی نہ لایا ہو وہ حلال ہو جائے اور جو ھدی لایا وہ اس وقت تک حلال نہ ہو جب تک ھدی منی میں پہونچ کر یوم نحر میں ذبح نہ کر دی جائے۔ اس طرح ان دونوں احرام میں آپ نے فرق کر دیا ہے۔ اور

ظاہر ہو گیا کہ ہدی کا ساتھ ہونا، احرام سے باہر آنے کو منع کرتا ہے لیکن اس مسلک والوں نے جو علت بیان کی ہے اُس میں عمومیت ہے کسی احرام کی کوئی تخصیص نہیں ہے

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے مہینوں میں جو عمرہ کرنے کا حکم دیا تھا اس سے مقصود مشرکین کی مخالفت تھی۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہے کہ فسخ حج الی العمرۃ افضل ہے اور یہ افضلیت قیامت تک کے لئے ہوئی۔ کیونکہ جو مناسک بھی آپ نے مشرکین کی مخالفت میں ادا کئے ہیں اُمت کے لئے بھی آپ کی اتباع ضروری ہے۔

مشرکین کی یہ عادت تھی کہ وہ عرفات سے قبل غروب شمس کوچ کر دیتے تھے اور مزدلفہ سے سورج نکلنے تک نہیں چلتے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور ارشاد فرمایا:

خالف ھدینا ھدی المشرکین فلم — ہماری سیرت مشرکین کی سیرت کے خلاف ہے
نفیض من عرفۃ حتی غربت الشمس — اور ہم غروب شمس تک عرفات سے کوچ نہیں کرینگے

یہ یا تو رکن ہے جیسا کہ امام مالکؒ نے فرمایا ہے یا واجب ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہ اور امام احمد نے فرمایا ہے اور امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور مزدلفہ سے سورج نکلنے سے قبل کوچ کرنا با تفاق مسنون ہے۔ ایسے ہی قریش عرفات میں وقوف نہیں کیا کرتے تھے اس لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

ثم افیضوا من حیث افاض الناس۔ — تم بھی وہیں سے کوچ کرو جہاں سے لوگ کرتے ہیں

یہ مخالفت مشرکین باجماع مسلمین ارکان حج میں سے ہے۔ بہر حال جن امور میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی مخالفت کی ہے وہ واجب ہیں یا مستحب ہیں مکروہ نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ حرام ہوں۔ لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ان نسک کے ادا کرنے کا حکم دیا جن میں مخالفت کرنا چاہیے تھی؟

پانچویں وجہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ عمرہ حج میں قیامت تک کے لئے داخل ہے۔ حالانکہ صحابہؓ نے صراحۃً فسخ عمرہ کے بارے میں دریافت کیا تھا جیساکہ آپ نے مروہ پہاڑی پر پہنچ کر فرمایا تھا اور "دخلت العمرۃ فی الحج" یہ الفاظ دو مرتبہ ارشاد فرمائے، اور فرمایا ہمیشہ کے لئے ہمیشہ کے لئے۔

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۴ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ تشریف لائے اور ہمیں احرام کھول دینے کا حکم دیا، حالانکہ عرفات کی حاضری کے لئے صرف پانچ دن باقی تھے۔ احرام کھولنے کے بعد ہمیں اپنی عورتوں کے پاس جانے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد حضرت سراقہ بن مالکؓ نے سوال کیا تھا، تب آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

اس پر بعض علماء نے اعتراضات بھی کئے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ سقوط فرض سے مراد اسی سال کا سقوط نہیں تھا بلکہ ہمیشہ کے لئے سقوط مراد تھا۔ یہ اعتراض باطل ہے کیونکہ ابدیت کا حکم کسی مخصوص جماعت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ عام مسلمانوں کے لئے تھا، اور اگر یہ کہا جائے کہ سوال میں تکرار وجوب مراد ہے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ سوال تنہا عمرہ کے بارے میں نہیں بلکہ حج اور عمرہ دونوں کے بارے میں تھا، کیونکہ حضرات صحابہؓ نے عرض کیا تھا۔

عمرتنا هذه لعامنا هذا ام للابد — ہمارا یہ عمرہ اسی سال کیلئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے

اگر حضرات صحابہؓ کی مراد ہر سال کے لئے تکرار وجوب تھا تو جس طرح حج کے بارے میں سوال کیا تھا اسی طرح یہاں بھی دریافت کرتے اور ان کو وہی جواب ملتا جو حج کے بارے میں ملا تھا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب مرحمت فرمایا تھا۔

مجھے اسی پر چھوڑ دو جس پر میں نے تمہیں چھوڑا ہے، اگر میں ہاں

کہہ دوں تو ہر سال واجب ہوگا۔

یہ سوال و جواب عدم تخصیص پر دلالت کرتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سائل نے اس تمتع کے بارے میں دریافت کیا تھا جس میں حج

کا احرام فسخ کرکے عمرہ کا باندھا جائے اور پھر تمتع کیا جائے نہ کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کے بارے میں، کیونکہ سائل نے اس ارشاد کے بعد جس کے پاس ھدی نہ ہو الخ،، تب یہ سوال کیا تھا کہ یہ حکم اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے۔ تب ارشاد ہوا تھا کہ یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے۔ اللہ کی توفیق سے یہ اختصاص کا دعویٰ باطل ہوا۔

۶ - چھٹی دلیل یہ ہے کہ جو علت اس قول کے قائلین نے ذکر کی ہے وہ علّت حدیث شریف میں موجود نہیں ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ اگر یہ باطل ہے تو ان حضرات کا دعویٰ باطل ہے اور اگر صحیح ہے تو حضرات صحابہؓ کے ساتھ اس کی خصوصیت کسی سے ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ چیز دوام معلول کو چاہتی ہے۔ جیسا کہ رمل کرنا اس وجہ سے مشروع ہوا تھا تاکہ مشرکین آپ کی اور آپ کے صحابہؓ کی قوت کا مشاہدہ کریں۔ اور یہ قیامت تک کے لئے ہے لہٰذا اس اعتبار سے بھی اختصاص کا دعویٰ باطل ہوا۔

۷ - اگر یہ کہا جائے کہ حضرات صحابہؓ کو فسخ عمرہ الی الحج کا حج کے مہینوں میں جو از جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تین عمرے کرنے کے بعد بھی نہ معلوم ہو سکا تھا تو یہ جہل محض ہے۔ حضرات صحابہؓ پر ایک قسم کا اعتراض ہے۔ نعوذ باللہ منہا

۸ - جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ آپؐ نے فسخ احرام حج کا امر اس وجہ سے فرمایا تھا کہ یہ حرام تھا اور آپ کو اباحت کی تعلیم دینی تھی اور یہ تعلیم بغیر اس حرام کے ارتکاب کے دی نہیں جا سکتی تھی، اور اگر یہ کہا جائے کہ جب امر فرمایا تھا اس وقت فسخ احرام، حرام نہیں تھا، تو یہ کہا جائیگا کہ واجب تھا یا مستحب تھا جیسا کہ بہت سے حضرات نے کہا ہے۔ اور جن لوگوں نے حرام کہا ہے ان کے نزدیک اس استحباب یا وجوب کے خلاف کون سی دلیل ہو سکتی ہے جس سے اجماع اُمّت اور نصوص کی تردید ہو جائے؟

۹ - جس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ’’اگر

میں ھدی نہ لایا ہوتا تو اس کو عمرہ بنا لیتا" تو اس کا کیا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وقت معلوم ہوا تھا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا جائز ہے جس کے فوت ہونے پر آپ نے افسوس کیا؟ بلکہ یہ امر محال ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ (کیونکہ اس سے پیشتر آپ ذی قعدہ میں عمرہ کر چکے تھے

۱۰۔ دسویں وجہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فسخ حج الی العمرۃ کا حکم اُن ہی لوگوں کو دیا تھا جو لوگ مفرد تھے، قران کر رہے تھے اور ھدی ساتھ نہیں لائے تھے۔ اور قارن کے بارے میں یہ ظاہر ہے کہ اس کا یہ عمرہ حج کے مہینوں میں ہی ہوتا ہے لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس قران کے فسخ کا حکم دیدیا، اور محض یہ تبانے کے لئے تاکہ عمرہ کا جواز معلوم ہو جائے؟ حالانکہ قارن خود عمرہ کے ساتھ حج ادا کرتا ہے

۱۱ فسخ حج الی العمرۃ اصولاً اور قیاساً جائز ہے، کیونکہ اگر نصوص نہ ہوں تو قیاس سے کام لیا جاتا ہے اور یہاں نصوص قیاس کے مطابق ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بیان فرمایا ہے کہ قران ادا کرنے کی صورت میں قیاس یہ ہے کہ محرم نے اپنے ذمہ زائد امور کی ادائیگی لازم کر لی ہے اور ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ زیادتی اس پر لازم ہے۔ مثلاً اگر کسی نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا اور پھر حج کا تو بلا خوف یہ جائز ہے اور اگر کسی نے پہلے حج کا احرام باندھا اور پھر اس پر عمرہ کا احرام داخل کر لیا تو جمہور کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اس کو جائز فرماتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک قارن کے لئے دو طواف اور دو سعی ہیں۔ یہی قیاس امام احمدؒ کے نزدیک ہے۔ لہٰذا محرم بالحج نے حج کا احرام باندھ کر اپنے ذمہ صرف حج کی ادائیگی لازم کی تھی لیکن جب وہ تمتع ہو گیا تو اس پر عمرہ کی ادائیگی بھی لازم ہو گئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ متمتع افضل ہے تو اس عمرہ کی ادائیگی مستحب ہے۔ ۔البتہ اس جگہ اُن لوگوں کے لئے مشکل پیش آئے گی جو اُس کو مستحب نہیں کہتے ہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ محض تنہا عمرہ کی ادائیگی کے لئے فسخ جائز نہیں ہے اور اس میں

کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ہاں وہ فسخ حج جائز ہے جس کے ساتھ عمرہ ہو، رہا متمتع کا معاملہ وہ اس کے زیر بحث نہیں آتا کیونکہ متمتع تو شروع ہی سے حج کرنے والا ہوتا ہے، جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرما دیا ہے کہ "عمرہ حج میں قیامت تک کے لئے داخل ہے"۔ اسی وجہ سے اس کا احرام باندھنے کے بعد فوراً ہی تین روزے رکھے جاتے ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ وہ اُسی وقت سے حج میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں حج کا احرام بعد میں باندھا جاتا ہے تو اس کی نظیر شریعت میں موجود ہے۔ جیسا کہ جنبی ابتداء میں وضو کرتا ہے اور پھر غسل کرتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے ہی کیا کرتے تھے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں سے فرمایا تھا جنھوں نے آپ کی صاحبزادی رضؓ کو غسل میت دیا تھا۔ "داہنی طرف اور وضو کے مقامات سے ابتداء کرو!" اور وضو کے اعضاء جزء ہیں غسل کے اعضاء کے"۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ تین وجہ سے باطل ہے (۱) یہ کمتر درجہ ہے (۲) پہلا درجہ کامل درجہ تھا، کیونکہ اس صورت میں ھدی کی ضرورت پیش آئے گی جو جبر نقصان ہے لہذا جس نسک میں جبر نقصان نہیں ہے وہ افضل ہے (۳) یہ کہ عمرہ کو حج پر داخل کرنا جائز نہیں ہے تو یہ عدم جواز ہمیشہ کے لئے ہے نہ کہ وقت معین کے لئے۔

ان تینوں وجوہ کا جواب دو طریقہ سے دیا گیا ہے، جن میں ایک طریقہ مجمل ہے اور دوسرا مفصل ہے۔ مجمل جواب یہ ہے کہ یہ اعتراضات محض سنت پر ہیں۔ اور سنت کا خلاف رائے سے کرنا باطل ہے اور مفصل جواب یہ ہے کہ فسخ حج الی العمرۃ قیاس کے مطابق ہے لہذا اس کو پورا کرنا واجب ہے، جیسا کہ تمتع کے لئے حکم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تمنا بھی کی تھی اور اپنے صحابہ رضؓ کو امر بھی فرمایا تھا۔ اور کتاب اللہ میں بھی اس کی صراحت ہے۔ اور اُمت کا اس کے استحباب پر اجماع ہے۔ غور کیا جائے کہ وہ حج تمتع افضل ہو سکتا ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے آپ کے ساتھ ادا کیا گیا یا وہ افضل ہو سکتا

ہے جس کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے:۔

رہا جبرِ نقصان کا معاملہ وہ بھی باطل ہے (۱) کیونکہ تمتع میں ھدی عبادت مقصودہ ہے اور وہ دم شکر ہے نہ کہ جبرِ نقصان، جیساکہ مقیم کے لیئے قربانی عبادت مقصودہ ہے اور یہ دن بمنزلہ بقرہ عید کے ہے، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب دریافت کیا گیا کہ کون سا حج افضل ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔

العج والثج — آواز بلند کرنا اور خون بہانا

یعنی تلبیہ کی آواز بلند کرنا اور قربانی کرنا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اس کو دم جبر کہا جائے تو اس کا کھانا جائز نہ ہونا چاہیئے۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تناول فرمایا ہے جیساکہ بخاری و مسلم کی روایت میں موجود ہے کہ آپ نے اپنی ھدی کا گوشت کھایا اور اپنی ازواج مطہرات کو بھی کھلایا اور وہ سب متمتعہ تھیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے بھی ارشاد فرمایا ہے:۔

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ۔ — اس میں سے تم بھی کھاؤ اور فقیر کو بھی کھلاؤ

اور یہ حکم دم تمتع اور دم قران کو شامل ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی ھدی کے جانوروں میں سے تھوڑا تھوڑا گوشت لیکر ہانڈی میں پکا کر تناول فرمایا تھا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جبرِ نقصان کا سبب چونکہ فعل حرام ہے اور حرام کا ارتکاب کسی عذر کی وجہ ہی سے مباح ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں دو حال سے خالی نہیں کہ تمتع یا واجب ہے یا حرام ہے۔ حالانکہ نص قطعی سے تمتع کا واجب ہونا ثابت ہے اور مامور بہ ہے اس اعتبار سے بھی یہ دعویٰ باطل ہوا۔

رہا ھدی کا معاملہ وہ دو سفر کا بدل ہے (یعنی ایک سفر حج کے لیئے اور ایک سفر عمرہ کے لیئے) لہذا جو آدمی حج کے مہینوں میں تمتع کرنا چاہے اس کے لیئے یہی افضل ہے کہ دونوں نسک ایک ہی سفر میں ادا کرے۔ اس کے بعد معلوم ہونا چاہیئے کہ بدل کبھی واجب

ہوتا ہے جیسا کہ جمعہ، ظہر کا بدل ہے اور جیسا کہ تیمم وضو کا بدل ہے۔ لہٰذا جب بدل کی حیثیت یہ ہے کہ وہ کبھی واجب ہوتا ہے تو اس کا مستحب ہونا بطریق اولیٰ ثابت ہوا۔

رہا یہ معاملہ کہ تمتع کی صورت میں درمیان میں حلال ہونا لازم آتا ہے تو بعض مناسک ایسے ہیں جو بلا احرام کے بھی ادا ہوتے ہیں، جیسا کہ طواف رخصت اور طواف زیارت جو کہ رکن ہے بلا احرام کے ادا ہوتا ہے۔ ایسے ہی رمی جمار منیٰ کے قیام میں بلا احرام کے کی جاتی ہے ایسے ہی صوم رمضان کا معاملہ ہے، دن میں روزہ اور رات کو افطار رہتا ہے اور یہ حالت روزہ کو عبادت ہونے سے خارج نہیں کرتی، امام مالک صاحبؒ نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ پورے مہینے کے روزوں کے لئے ایک ہی نیت کافی ہے۔ کیونکہ یہ عبادت واحدہ ہے

وادیٔ ذی طویٰ

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذی طویٰ میں اترے۔ یہ ایک مشہور جگہ ہے جو اب، آبار زاہر کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں آپ نے شب یکشنبہ گذاری اور یہاں صبح کی نماز ادا کی اور یہاں غسل کیا، اس کے بعد آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں دن میں ثنیۃ العلیا کی جانب سے داخل ہوئے۔ آپ نے جب عمرہ کیا تھا اس کے نیچے کی طرف سے داخل ہوئے تھے بہرحال مسجد حرام میں آپ چاشت کے وقت داخل ہوئے۔ طبرانی نے ذکر کیا ہے کہ آپ باب عبد مناف سے داخل ہوئے تھے۔ اس کا نام آج کل باب بنی شیبہ ہے۔ امام احمد نے روایت کیا ہے کہ جب آپ کسی بلند مقام پر چڑھتے تو بیت اللہ کی طرف چہرۂ انور کر کے دُعا مانگتے تھے۔ اور طبرانی نے روایت کیا ہے کہ جب آپ کی نظر بیت اللہ پر پڑتی تو یہ دعا مانگتے

اللّٰھُمَّ زِدْ بَیْتَکَ ھٰذَا تَشْرِیْفًا وَتَعْظِیْمًا وَتَکْرِیْمًا وَمَھَابَۃً	اے اللہ اپنے اس گھر کی عظمت اور شرافت کرامت اور ہیبت کو زیادہ کر

آپ سے مروی ہے کہ بیت اللہ کے دیکھنے کے وقت آپ دونوں ہاتھوں کو

بلند کر لیتے تھے

اللّٰھم انت السلام ومنک السلام حینا ربنا بالسلام اللّٰھم زد ھذا البیت تشریفا و تعظیما و ھیبۃ الخ

اے اللہ تو سلامتی والا ہے اور تجھ ہی سے سلامتی ہے ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ اور اس گھر کی عظمت، شرافت اور ہیبت کو زیادہ کر۔

یہ روایت مرسل ہے لیکن اس کو سعید بن مسیب نے حضرت عمر بن خطابؓ سے سنا ہے بہرحال آپ جب مسجد میں داخل ہوئے تو سیدھے بیت اللہ کی طرف تشریف لے گئے۔ اور آپ نے یہاں تحیۃ المسجد ادا نہیں کی، کیونکہ مسجد حرام کی تحیۃ المسجد بیت اللہ کا طواف ہے۔

جب آپ حجر اسود کے مقابل ہوئے تو اُس کو بوسہ دیا، اس وقت آپ کے ساتھ کسی نے ازدحام نہیں کیا اور نہ کوئی آپ سے آگے بڑھا، اس وقت نہ آپ نے ہاتھ اٹھائے اور نہ کہا کہ "میں ان سات چکر (طواف) کی نیت کرتا ہوں"، اور نہ آپ نے تکبیر کہی جیسا کہ نماز کے لئے کہتے ہیں یہ بدعت ہے۔ بہرحال اس کے بعد آپ نے طواف شروع کیا۔ اس طرح کہ بیت اللہ آپ کی بائیں طرف تھا اور آپ نے دائیں جانب کو ہو کر طواف شروع کر دیا آپ نے بیت اللہ کے دروازے کے پاس یا اس کی پشت کی جانب یا رکن یمانی کے پاس دعا نہیں مانگی اور نہ طواف کرنے کا کوئی خاص ذکر آپ سے مروی ہے، البتہ آپ جب دونوں رکن کے درمیان تھے تو آپ سے یہ سنا گیا۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اسی طواف کے ابتدائی تین چکروں میں آپ نے رمل کیا ہے۔ اور جو احرام کی چادر اوڑھے ہوئے تھے اس کا اضطباع کیا ہے جب بھی آپ حجر اسود کے سامنے ہوتے تو اپنی محجن سے اشارہ کرتے اور پھر اس کو چومتے محجن ایسی لاٹھی ہوتی ہے جس کا سر مڑا ہوا ہوتا ہے (جیسا کہ موجودہ زمانہ میں بید یا چھڑی ہوتی ہے)۔

دارقطنی نے روایت کیا ہے آپ نے رکن یمانی کا بوسہ لیا ہے اور اُس پر اپنا رخسار مبارک رکھا ہے۔ لیکن اس روایت میں عبداللہ بن مسلم ہیں۔ امام احمد نے ان کو صالح الحدیث کہا

اور دوسرے حضرات نے ان کو ضعیف کہا ہے، لیکن اس جگہ رکن یمانی سے مراد حجر اسود ہے جیسا کہ رکن یمانی اور دوسرے رکن کو ملا کر یمانیان کہا جاتا ہے، اور دروازہ کے پاس جو رکن ہے اور دوسرے رکن کو ملا کر عراقیاں کہا جاتا ہے۔ اور دو رکن کو شامیان کہا جاتا ہے۔۔۔

... ... اور دوسرے رکن کو غربیان کہا جاتا ہے لیکن آپ سے اس قدر ضرور ثابت ہے کہ آپ نے حجر اسود کا بوسہ لیا، اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے اپنے دست مبارک سے چھوا، اور پھر ہاتھوں کو بوسہ دیا ہے۔ اور محجن کے ذریعہ سے بھی بوسہ لیا بہر حال یہ تین طریقے ہیں۔ آپ سے ثابت ہے کہ آپ بیت اللہ سے چمٹ کر روئے طبرانی نے سند جید سے روایت کیا ہے:۔

اذا استلم الرکن الیمانی قال بسم اللہ واللہ اکبر۔ | جب آپ نے رکن یمانی کا بوسہ لیا تو بسم اللہ و اللہ اکبر، فرمایا۔

آپ جب بھی حجر اسود کے پاس آتے تو اللہ اکبر فرماتے۔ ابو داؤد طیالسی نے ذکر کیا ہے کہ میں نے جعفر بن عبد اللہ کو دیکھا ہے کہ انھوں نے حجر اسود کا بوسہ لیا اور اس پر پیشانی کو رکھا اور انھوں نے فرمایا کہ میں نے عبد اللہ بن عباس کو ایسا کرتے دیکھا ہے اور انھوں نے فرمایا میں نے عمر بن خطاب کو ایسا کرتے دیکھا ہے اور انھوں نے فرمایا، میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ اور بیہقی نے بھی حضرت ابن عباس کے بارے میں ایسے ہی روایت کیا ہے۔ امام شافعی صاحبؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ رکن یمانی کو بوسہ دینے سے گریز نہ کرنا چاہیئے بلکہ جہاں جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوسہ دیا ہے وہاں بوسہ دینا چاہیئے اور جہاں آپ رکے ہیں وہاں رک جانا چاہیئے۔

طواف قدوم کے بعد

جب آپ طواف سے فارغ ہوئے تو آپ نے پڑھا

وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى | مقام ابراہیم کو مصلی بناؤ۔

چنانچہ آپ نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر دو رکعت ادا فرمائیں۔ اور اسی میں سورۂ فاتحہ کے بعد، سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص کی قرأت فرمائی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد پھر آپ نے حجر اسود کا بوسہ لیا اور پھر آپ صفا پہاڑی پر اس کے قریبی دروازے سے تشریف لے گئے اور یہاں یہ آیت مبارکہ پڑھی۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ الآیۃ اور آپ نے صفا پہاڑی سے سعی شروع فرمائی۔ جب آپ کی نظر بیت اللہ پر پڑی تو تکبیر و تہلیل فرمائی، اور فرمایا:-

لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔ لہ الملک و لہ

الحمد وھو علی کل شیءٍ قدیر، لا الٰہ الا اللہ وحدہ

انجز وعدہ و نصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ

اس کے بعد آپ نے دعا مانگی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے اس جگہ سورۂ بقرہ نازل ہوئی تھی، اس کے بعد یہاں سے آپ مروہ کی طرف چلے اور وادی میں پہونچے تو دوڑ کر چلے۔ اس جگہ کو میلین اخضرین کہا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وادی کی اصل وضع میں آج بھی تغیر نہیں ہوا ہے۔ حضرت جابرؓ سے بھی مسلم شریف یونہی مروی ہے اور یہ طواف آپ نے پیدل کیا تھا لیکن مسلم نے بروایت ابن زبیرؓ حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں بیت اللہ کا طواف سواری پر کیا ہے تاکہ سب لوگ دیکھ لیں، اور صفا و مروہ کی سعی بھی سوار ہو کر کی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ آپ نے اور آپ کے صحابہ رضؓ نے صفا اور مروہ کے درمیان ایک سعی سے زیادہ سوار ہو کر نہیں کی۔

علامہ ابن حزم نے فرمایا ہے، ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں ہے، لیکن میرے نزدیک دونوں حدیثوں کے جمع ہونے کی ایک دوسری صورت اور بھی ہے وہ یہ کہ پہلے تو آپ نے پیدل سعی کی اور اس کے بعد سوار ہو گئے۔ چنانچہ

مسلم شریف کی حدیث میں ہے۔ ابوطفیل کہتے ہیں:۔

میں نے ابن عباسؓ سے دریافت کیا۔ صفا و مروہ کے طواف کے بارے میں ارشاد فرمایئے! کیا سوار ہو کر مسنون ہے ؟ آپ کی قوم کا خیال ہے کہ سنت ہے، تو عباسؓ نے فرمایا، وہ سچ کہتے ہیں، اور جھوٹ بھی کہتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے ؟۔ فرمایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے لوگوں کا ہجوم زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ کہتے تھے "یہ محمدؐ ہیں"۔ چنانچہ گھروں میں رہنے والی عورتیں بھی نکل آئی تھیں۔ اور آپ لوگوں کو سامنے سے بھگاتے بھی نہیں تھے۔ جب زیادہ ہجوم ہو گیا تو آپ سوار ہو گئے اور پیدل طواف کرنا افضل ہے۔

طوافِ قدوم طواف قدوم کے بارے میں اختلاف ہے، کیا آپ نے سوار ہو کر کیا یا پیدل کیا۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں سوار ہو کر طواف کیا اور اسی طرح حجر اسود کو بوسہ دیا آپ کو برا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو تکلیف پہونچے"۔ ابو داؤد میں روایت ہے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں جب آپ تشریف لائے تو کچھ مزاج مبارک ناساز تھا تو آپ نے سوار ہو کر طواف کیا اور محجن کے ذریعہ سے حجر اسود کو بوسہ دیا۔ جب آپ فارغ ہوئے تو اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور نماز ادا کی۔ ابوطفیل کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کے گرد سواری پر طواف کرتے دیکھا ہے اور آپ نے اپنی محجن سے حجر اسود کو بوسہ دیا امام مسلم نے بھی اس کو روایت کیا ہے، لیکن اس میں اونٹ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بیہقی کے نزدیک اس کے اسناد مسلم ہیں لیکن انھوں نے بھی اونٹ کا نام نہیں لیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ طواف قدوم کا واقعہ ہے یا طواف افاضہ کا معاملہ ہے۔ واللہ اعلم۔ کیونکہ حضرت

جابرؓ نے رمل کو نقل کیا ہے، اور یہ پہلے ابتدائی تین طواف میں ہوتا ہے، اور پیدل ہی ہوتا ہے امام شافعی صاحبؒ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ یہ طواف پیدل تھا کیونکہ حضرت جابرؓ نے رمل کو حکایت کیا ہے۔ البتہ سوار ہو کر طواف کا واقعہ یوم نحر کا واقعہ ہے۔

امام شافعیؒ نے بروایت ابن عیینہ روایت کیا ہے کہ آپ نے تمام صحابہ کو منع فرما دیا تھا کہ وہ طواف افاضہ میں نہ آئیں، کیونکہ یہ طواف آپ نے اپنی ازواج مطہراتؓ کے ساتھ رات کو کیا تھا اور محجن سے بوسہ دیا تھا، میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث مرسل ہے اور حضرت جابرؓ کی صحیح حدیث کے خلاف ہے۔ کیونکہ انھوں نے طواف افاضہ یوم نحر میں دن کے وقت روایت کیا ہے اور ایسے ہی حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے روایت کیا ہے اور اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

رہی حضرت ابن عباسؓ کی وہ روایت جس میں طبیعت کی ناسازی کا ذکر ہے وہ کسی عمرے کا واقعہ ہوگا کیونکہ طواف قدوم میں تو آپ نے رمل کیا تھا، یا یہ کہا جائے جیسا کہ ابن حزم نے کہا ہے کہ آپ نے رمل اونٹ پر بیٹھ کر ہی کیا تھا لیکن کسی صحیح روایت میں یہ نہیں ہے کہ آپ طواف قدوم میں سوار تھے۔ ابن حزم سے بڑی فاش غلطی یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے یہ کہہ دیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مروہ کے درمیان سات چکر سعی کی اور اونٹ پر بیٹھ کر پہلے تین چکروں میں آپ دوڑ کر چلے اور بعد کے چکروں میں پیدل چلے، اس کو کسی نے بھی روایت نہیں کیا یہ اُن کا وہم ہے۔ یہ واقعہ تو بیت اللہ کے طواف کا ہے جس کو انھوں نے صفا و مروہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ چنانچہ ابن حزم نے بخاری کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

> جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف لائے تو اولاً آپ نے رکن کو بوسہ دیا اور پھر پہلے تین طواف میں اُچک کر چلے اور چار میں پیدل چلے، اور طواف کر کے آپ سواری سے اُترے اور مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی، پھر صفا و مروہ پر گئے اور یہاں سات چکر سعی کی الخ

اس حدیث کو علامہ نے متفق علیہ قرار دیا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا کسی نے نہیں کہا ہے

میں نے اپنے شیخ سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا۔ یہ ابن حزم کی غلطی ہے انھوں نے حج نہیں کیا ان کو اشتباہ ہوگیا ہے اور چودہ چکر کو سعی قرار دیا ہے۔ حالانکہ صفا سے مروہ تک ایک چکر شمار ہوتا ہے۔ نہ کسی نے ایسا روایت کیا ہے اور نہ کسی مشہور امام کا ایسا قول ہے۔ اگرچہ بعض متاخرین نے یہ بات کہہ دی ہے اور اس قول کا باطل ہونا اس سے ثابت ہے کہ آپ کی سعی مروہ پر ختم ہوئی تھی۔ ورنہ اس قول کے اعتبار سے صفا پر ختم ہونا چاہیے تھی۔

بہرحال جب مروہ پہاڑی پر پہونچے تو بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور یہاں تکبیر و تہلیل کی اور ویسے ہی کیا جیسا کہ صفا پر کیا تھا۔ جب آپ کی سعی مروہ پر پوری ہوگئی تو آپ نے ہر اس آدمی کو امر فرمایا جس کے پاس ہدی نہ تھی کہ حلال ہو جائے۔ ان کے لئے خوشبو اور عورتوں اور سلا ہوا کپڑا پہننے کو حلال قرار دیدیا، اور یہ حکم یوم ترویہ تک تھا، اور آپ حلال نہیں ہوئے تھے کیونکہ آپ اپنے ہمراہ ہدی لائے تھے۔ اسی وقت آپ نے فرمایا تھا، اگر میں ھدی نہ لاتا تو میں بھی حلال ہو جاتا، جن لوگوں نے یہ روایت کیا ہے کہ آپ بھی حلال ہو گئے تھے، غلط ہے اسی جگہ آپ نے سر منڈوانے والوں کے لئے مغفرت کی تین مرتبہ دعا کی اور بال کٹوانے والوں کے لئے ایک مرتبہ مغفرت کی دعا کی۔ اسی جگہ سراقہ بن مالک نے آپ سے سوال کیا تھا

حضرت ابو بکر صدیق رض، حضرت عمر رض، حضرت علی رض، حضرت طلحہ رض، حضرت زبیر رض ھدی ساتھ لانے کی وجہ سے حلال نہیں ہوئے تھے۔ اور ازواج مطہرات حلال ہوگئی تھیں وہ بعد میں قارنہ ہوگئیں۔ مگر حضرت عائشہ رض حیض آنے کی وجہ سے حلال نہ ہوئی تھیں اور حضرت فاطمہ رض بھی حلال ہوگئی تھیں، کیونکہ ان کے ساتھ ھدی نہ تھی، اور حضرت علی رض حلال نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کے پاس ھدی کا جانور تھا۔ حضرت علی رض نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر دیا تھا کہ میں نے وہی احرام باندھا ہے جو آپ نے احرام باندھا ہے

وقوف عرفہ اور خطبہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مکہ معظمہ میں قیام کے زمانہ میں یوم ترویہ تک وہیں نماز ادا کرتے رہے جہاں آپ مسلمانوں کے ساتھ مقیم تھے اور آپ مکہ معظمہ کی اوپر کی جانب مقیم ہوئے تھے، یہاں آپ نے چار دن قیام فرمایا اور نمازیں قصر کیا (یعنی اتوار، پیر، منگل، بدھ) جمعرات کے دن اشراق کے بعد آپ مسلمانوں کے ساتھ منی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جو لوگ احرام کھول چکے تھے انھوں نے حج کا احرام باندھا اور مسجد حرام میں داخل ہو کر احرام نہیں باندھا بلکہ جہاں مقیم تھے وہیں احرام باندھا اور یہاں سے کوچ کردیا کہ مکہ معظمہ ان کی پشت کی جانب تھا

جب آپ منیٰ پہونچے تو یہاں ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھیں اور یہیں رات گذاری اور یہ شب جمعہ تھی۔ جب سورج نکل آیا تو آپ نے عرفات کی طرف کوچ فرمایا۔ اور وہ راستہ اختیار کیا جو موجودہ راستہ کے داہنی جانب ہے جس کو "طریق ضب" کہا جاتا ہے۔ آپ کے صحابہ تکبیر بھی کہتے تھے اور تلبیہ بھی کہتے تھے اور آپ سنتے تھے لیکن کسی کو روک ٹوک نہیں فرماتے تھے۔

آپ کے پہونچنے سے پہلے آپ کے صحابہؓ نے آپ کے لئے کمبلوں کا ایک ڈیرہ بنا دیا تھا، آپ وہاں اُترے، یہ جگہ نمرہ تھی جو پہلے قریہ تھا، اب نہیں ہے عرفات کی شرقی جانب ہے۔ جب سورج ڈھل گیا تو آپ نے اپنی ناقہ قصویٰ کے لئے امر فرمایا۔ اور اس پر سوار ہو کر بطن وادی میں تشریف لائے۔ یہ جگہ ارض عرنہ میں ہے اور اونٹنی پر بیٹھ کر آپ نے خطبہ دیا۔ اس میں اسلام کے اصول بیان فرمائے اور اصول شرک کو منہدم فرمایا اور ان محرمات کو بیان فرمایا جن پر تمام ملتوں کا اتفاق ہے۔ مثلاً جان، مال، عزت اور فرمایا

امور الجاھلیۃ تحت قدمی — جاہلیت کی چیزیں میرے قدموں کے نیچے ہیں۔

اسی خطبہ میں زمانہ جاہلیت کے سود کو ختم فرمایا اور اُس کو باطل قرار دیا۔ عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا اور اُن کا جو حق مردوں پر ہے اور جو حق مردوں کا اُن پر ہے بیان فرمایا، اور فرمایا عورتوں کے لئے دستور کے مطابق نان و نفقہ اور کپڑا واجب ہے اور اس کی کوئی مقدار بیان نہیں فرمائی

مردوں کے لئے آپ نے بقدر ضرورت تادیب کرنے کو مباح قرار دیا، اگر وہ اپنے گھروں میں ایسے لوگوں کو داخل کریں جن کو ان کے شوہر پسند نہیں کرتے ہیں۔ اُمت کو آپ نے کتاب وسنت کے مضبوطی سے تھامنے کی وصیت فرمائی اور فرمایا جب تک اُس کو تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے اور اس کے بارے میں ان سے سوال بھی ہوگا، لوگوں سے آپ نے گواہی طلب کی کہ کیا میں تبلیغ رسالت کر چکا، سب لوگوں نے بہ اتفاق یک زبان ہو کر عرض کیا۔

نشھد انک قد بلغت وادیت — ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔

اس کے بعد آپ نے آسمان کی طرف اُنگلی اٹھائی اور خدا کو گواہ بنایا۔ اور دو مرتبہ کہا۔ اور فرمایا ہر موجود غائب کو پہنچا دے۔ ابن حزم نے فرمایا ہے اس وقت ام فضل بنت حارث نے آپ کی خدمت میں دودھ کا پیالہ بھیجا۔ اس کو آپ نے لوگوں کے سامنے اونٹ پر بیٹھے ہوئے نوش فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے بلال رض کو امر فرمایا اور نماز کی اقامت کہی گئی۔

یہ علامہ کا وہم ہے کیونکہ دودھ کے نوش فرمانے کا واقعہ، اس وقت کا ذکر کیا ہے جب آپ عرفات تشریف لے جا رہے تھے اور آپ نے وقوف فرمایا تھا صحیحین میں حضرت میمونہ رض کی روایت اس طرح ہے وہ فرماتی ہیں کہ لوگوں کو شک تھا کہ آپ روزے سے ہیں یا نہیں؟ تب آپ کی خدمت میں دودھ پیش کیا گیا اور آپ موقف میں تھے اور آپ نے وہیں دودھ نوش فرمایا۔

جہاں تک خطبہ کا مقام ہے وہ موقف نہیں ہے بلکہ وہ عُرَنہ ہے۔ آپ نمرہ میں اُترے اور عرنہ میں خطبہ دیا تھا، اور آپ نے ایک ہی خطبہ دیا تھا دو نہیں دیئے تھے جب خطبہ ختم فرما چکے تو حضرت بلال رض کو امر فرمایا۔ انھوں نے پہلے اذان دی اور پھر اقامت کہی۔ اور آپ نے دو رکعت ظہر کی سِرّاً ادا کیں اور یہ دن جمعہ کا تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسافر پر جمعہ نہیں ہے۔ پھر اقامت کہی گئی اور آپ نے عصر کی دو رکعت ادا کیں۔ آپ کے ساتھ اہل مکہ بھی تھے، انھوں نے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قصر[1] کیا، اور دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[1] حنفیہ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ اگر مسافر امام کے پیچھے کوئی مقیم نماز پڑھے تو اس کو تمام کرنا چاہیے۔ (باقی ص۲۲۰ پر)

وسلم نے ان کو اتمام کا امر نہیں فرمایا تھا، جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفر مایا تھا۔

اتموا صلاتکم فانا قوم سفر — تم اپنی نماز پوری کرو ہم سافر ہیں۔

ان حضرات نے بہت واضح غلطی کی ہے۔ کیونکہ یہ ارشاد تو فتح مکہ کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا، جب وہ لوگ اپنے ہی شہر میں تھے اس وجہ سے علماء کا سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اہل مکہ عرفات میں پہونچ کر قصر بھی کریں گے اور جمع صلوٰۃ بھی کریں گے جیساکہ انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا۔ اس میں انتہائی واضح دلیل ہے کہ سفر کے لئے کوئی تحدید نہیں ہے۔ اور نہ دنوں کی تعداد ہے کہ اس مقدار پر قصر کیا جائے گا۔ اور مناسک حج کی وجہ سے قصر نہیں ہوتا، بلکہ قصر کے بارے میں تو خود اللہ تعالیٰ نے سفر کو علت قرار دیدیا ہے اور وہی مقتضی سنت ہے، لیکن جن لوگوں نے تحدید کی ہے ان کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے۔

جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو موقف میں تشریف لائے اور پہاڑی کے دامن میں پتھروں کے پاس کھڑے ہوگئے۔ اس طرح کہ آپ قبلہ رو تھے اور جبل مشاۃ آپ کے سامنے تھا، اور اس وقت بھی آپ اونٹ پر تھے۔ اس وقت آپ نے دعا شروع کی اور غروب شمس تک تضرع وزاری فرماتے رہے۔

لوگوں کو آپ نے منع فرمادیا تھا کہ وہ وادی عرنہ میں نہ کھڑے ہوں کیونکہ وہ موقف نہیں ہے بلکہ اس جگہ وقوف کریں عرفات پورا موقف ہے۔ آپ نے لوگوں کو فرمایا اپنے مشاعر پر رہیں اور عرفات میں وقوف کریں یہی وراثت ابراہیمؑ ہے۔ اس وقت آپ کی خدمت میں نجد سے کچھ حضرات آئے اور انھوں نے حج کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا

الحج یوم عرفۃ من ادرك قبل صلوٰۃ الصبح فقد ادرك الحج و — حج یوم عرفہ ہے لہٰذا جس نے صبح کی نماز سے پہلے اس کو پالیا اس کا حج ہوگیا اور منیٰ کے دن،

صفحہ ۲۱۹ کا باقی:۔ اس جگہ علامہ نے حنفیہ کے مسلک پر اعتراض کیا ہے اس کا جواب مستقل حاشیہ کے تحت آئے گا

ایام منی ثلاثۃ ایام التشریق فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ۔ ومن تاخر فلا اثم علیہ۔

تین دن تشریق کے ہیں جس نے اس سے جلدی کی اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی اس پر کوئی گناہ نہیں۔

عرفات کی دعا

اور آپ اپنی دعا میں سینہ مبارک تک ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے جیسا کہ کوئی مسکین کھانا مانگتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا، بہترین دعا یوم عرفہ کی ہے۔ آپ کی عرفات کی دعا کے بارے میں روایت ہے۔

اللھم لک الحمد کالذی نقول وخیرا مما نقول اللھم لک صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی والیک مآبی ولک ربی تراثی اللھم انی اعوذبک من عذاب القبر ووسوسۃ الصدر وشتات الامر اللھم انی اعوذبک من شر ما تجیئ بہ الریح۔

امام ترمذی نے آپ کی دعا کے بارے میں یہ بھی روایت کیا ہے

اللھم انک تسمع کلامی وتری مکانی (الی قولہ) لا تجعلنی بدعائک ربی شقیا وکن بی رؤفا رحیما [1]

امام احمد اور طبرانی نے حضرت شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عرفہ میں اکثر وبیشتر دعا میں یہ فرمایا لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الملک ولہ الحمد بیدہ الخیر وھو علی کل شیئ قدیر

امام بیہقی نے حضرت علیؓ کی روایت ذکر کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میری عرفات میں دعا وہی ہے جو مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے عرفات میں دعا کی تھی۔

---

[1] ۔ یہ پوری دعا حزب الاعظم، مناجات مقبول میں ملاحظہ فرمائیں۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد
وھو علی کل شیئ قدیر۔ اللھم اجعل فی قلبی نوراً
وفی صدری نوراً وفی سمعی نوراً وفی بصری نوراً اللّٰھم
اشرح لی صدری ویسر لی امری واعوذبک من وسواس
الصدر وشتات الامر وفتنۃ القبر اللھم انی
اعوذبک من شر مایلج فی اللیل وشر مایلج
فی النھار وشر ماتھب بہ الریاح وشر
بوائق الدھر۔

ان دعاؤں کے اسناد میں کچھ کمزوری ہے۔ اسی جگہ آیت مبارکہ الیوم اکملت الآیۃ نازل ہوئی، اسی جگہ مسلمانوں میں سے ایک صاحب اپنی اونٹنی سے گر پڑے تھے اور اسی حالت میں اُن کا انتقال ہوگیا تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا تھا، اُس کو اسی احرام کے لباس میں کفن دیا جائے اور خوشبو نہ لگائی جائے۔ اور بیری کے پتوں سے ملے ہوئے گرم پانی سے غسل دیا جائے۔ سر نہ ڈھانکا جائے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ قیامت کو یہ آدمی تلبیہ کہتا ہوا اُٹھے گا۔

۱۲ بارہ مسائل اس قصہ میں بارہ احکام ہیں ۱؎ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی وجہ سے غسل میت کا واجب ہونا ۲؎ موت کی وجہ سے وہ نجس نہیں ہوئے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو غسل سے نجاست میں اضافہ ہی ہوا ہوتا اس لئے کہ موت کی نجاست جاندار کے لئے نجاست عین ہے[۱]۔ ۳؎ یہ کہ میّت کو بیری وغیرہ کے پتّے ڈال کر غسل دینا چاہیے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین جگہ بیری وغیرہ

۱؎ علامہ کا قیاس غلط ہے۔ مفصل حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کے پتے ڈال کر میت کو غسل دینے کا امر فرمایا ہے۔ ایک جگہ تو یہی ہے جو بیان ہوئی۔ دوسری جگہ جب آپ کی مرحومہ صاحبزادی رضؓ کو غسل میت دیا گیا تھا، تیسری جگہ غسل حائضہ کے بارے میں فرمایا تھا۔ کسی پاک چیز کے ملنے سے پانی کی پاکی میں فرق نہیں آتا۔ یہی مذہب جمہور کا ہے اور امام احمدؒ سے بھی دو روایتوں میں اسی پر تصریح ہے اگرچہ ان کے اصحاب متاخرین نے اس کے خلاف کیا ہے۔ بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو بیری کے پتوں کے پانی سے غسل دلایا تھا اور پھر بعد میں خالص پانی سے غسل نہیں دلایا تھا بلکہ آخر میں پانی میں کافور ڈلوا دیا تھا، اگر پانی ناپاک ہو جاتا تو آپ اس میں کافور نہ ڈلواتے۔ بلکہ کافور کے پڑنے سے بدن میں خوشبو آجاتی ہے اور جلد کو قوت حاصل ہو جاتی ہے ۵۔

محرم کو غسل کرنا جائز ہے اس مسئلہ میں حضرت ابن عباسؓ اور حضرت مسور بن مخرمہ میں مناظرہ ہو گیا تھا۔ اور حضرت ابو ایوب انصاری نے فیصلہ کیا تھا، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں غسل کیا تھا اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ محرم کو غسل جنابت کرنا چاہئے البتہ امام مالکؒ نے یہ مکروہ قرار دیا ہے کہ محرم کا سر پانی میں غرق نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس طرح سر کا چھپانا اور ڈھکنا لازم آتا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے ایسا ہی کیا تھا۔

۶ محرم کو جائز نہیں ہے کہ وہ بیری کے پتوں کے ملے ہوئے پانی کو استعمال کرے یہ مکروہ ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے اس کو مباح قرار دیا ہے، اور امام ابو حنیفہ اور امام مالکؒ نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ امام صاحب کے دونوں شاگردوں نے فرمایا ہے ایسے کرنے والے محرم پر صدقہ ہے[1]، کیونکہ اس سے جوں وغیرہ مر جاتی ہیں۔ دوسرے

---

[1] اگر کسی محرم نے جوں کے مارنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے تو احتیاطاً اس میں سے صدقہ دیا جائے خواہ ایک روٹی کا ٹکڑا، اور جوں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، لیکن صاحب بحر نے کہا ہے کوئی شے نہیں ہے۔ بہر حال پہلی صورت احتیاط کی ہے اور احتیاط پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ (مناسک از ملا علی قاری صفحہ ۲۰۳ ج ۱)

وجہ یہ ہے کہ اس سے پراگندہ بال ہونا ختم ہو جاتا ہے اور یہ ہیئت مطلوب ہے تیسری وجہ یہ ہے کہ اس سے کسی قدر خوشبو آجاتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ تینوں علتیں بیکار ہیں۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ جائز ہے کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے پراگندہ بالی کو دور کرنے کو منع نہیں فرمایا ہے۔ اور نہ جوں کے مارنے کو منع کیا ہے اور بیری کے پتوں میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔

۷۔ یہ کہ کفن میراث پر مقدم ہوتا ہے۔ .... اور قرضہ پر بھی مقدم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے کفن دلیا ہے، اس سے پہلے نہ قرض خواہ کو دریافت کیا اور نہ کسی وارث کو معلوم کیا۔ جیساکہ حالت حیات میں سب سے پہلے لباس پوشی ضروری ہے۔ ایسے ہی بعد مرنے کے تن پوشی ضروری ہے اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے ان کے دلائل کی طرف توجہ نہ کرنا چاہئے۔

۸۔ یہ کہ دو کپڑوں میں کفن دینا کافی ہے۔ ایک چادر اور ایک تہبند یہی قول جمہور کا ہے لیکن قاضی ابو یعلی نے کہا ہے کہ تین کپڑوں سے کم نہ ہونا چاہئے۔ اگر قدرت ہو لیکن صحیح بات وہ ہے جو پہلے مذکور ہو چکی ہے

خوشبو لگانا

۹۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محرم کو خوشبو کا استعمال منع فرمایا ہے اس لئے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ مردہ قیامت میں تلبیہ کہتا ہوا اٹھیگا۔ اور یہی اصل ہے اور بخاری و مسلم میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت بھی موجود ہے۔ ارشاد فرمایا وہ کپڑا نہ پہنو جس میں زعفران وغیرہ لگا ہو۔

(۲) ایک مرتبہ آپ کے جبہ میں (جس میں آپ نے احرام باندھا تھا) خوشبو لگادی گئی تھی اس کو ڈھلوایا تھا۔ ان احادیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ محرم کو خوشبو لگانا جائز نہیں ہے اور تینوں میں واضح تر حدیث وہی ہے جو گذر چکی ہے کیونکہ ممانعت ہر خوشبو کے لئے عام ہے اور جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا کہ اس کے قریب بھی خوشبو نہ لائی

جائے تو یہ حکم بدن کے لئے اور سر کے لئے عام ہے۔

لیکن خوشبو کا بغیر چھوئے سونگھنا۔ اس کے بارے میں بعض لوگوں نے حرام کہا ہے لیکن بات یہ ہے کہ الفاظ سے سونگھنے کی حرمت ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ اور نہ اس کے خلاف اجماع ہے کہ اسکو اختیار کیا جائے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حرمت، تحریم وسائل کی حرمت کی طرح ہے۔ کیونکہ سونگھنے میں ہاتھ سے چھونا یا کپڑوں کو لگنا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کسی اجنبیہ عورت کو دیکھنا ہے۔ کیونکہ دیکھنے کی صورت میں ارتکاب حرام تک ہو سکتا ہے ہاں ضرورۃً جائز ہے جیسا کہ باندی کو خریدتے وقت یا کسی کو شادی کا پیغام دیتے وقت لیکن جنھوں نے منع کیا ہے انھوں نے اس وجہ سے منع کیا ہے کہ محرم کو اس سے لذت اور فرحت حاصل ہوگی، اور وہ خوشبو جو بلا ارادہ ناک میں چلی جائے وہ منع نہیں ہے

کیونکہ محرم کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی ناک بند رکھے۔ یہ پہلی صورت اچانک نظر پڑ جانے کی طرح ہے جو کہ جائز ہے۔

یہ چیز اس سے بھی واضح ہے کہ جن لوگوں نے محرم کے لئے جائز قرار دیا ہے کہ وہ خوشبو جو ان کے احرام میں پہلے سے چلی آرہی ہے اور باقی ہے وہ درست ہے یہ قول اصحاب امام ابو حنیفہ کا ہے جوامع الفقہ میں امام ابو یوسفؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس خوشبو کے سونگھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو احرام کے قبل باندھنے کے لگا دی گئی تھی۔ صاحب المفید نے کہا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس سے تعب (تھکاوٹ) دور ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ روزے دار کے لئے سحری ہے۔

فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ خوشبو کا کپڑے میں باقی رہنا کیسا ہے؟ اس میں دو قول ہیں جمہور جواز کے قائل ہیں جیسا کہ سنت صحیحہ سے ثابت ہے کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احرام سے پہلے خوشبو لگایا کرتے تھے۔ حتی کہ خوشبو کی سفیدی آپ کی مانگ سے ظاہر ہوتی تھی

اس سے یہ تاویل باطل ہو گئی، کہ غسل کے بعد اس کا اثر دور ہو گیا تھا۔ حدیث میں ہے

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا اراد ان يحرم تطيب باطيب ما يجد ثم يرى بيض طيبه في رأسه ولحيته۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب احرام کا ارادہ فرماتے تو سب سے بہتر خوشبو جو آپ کو ملتی، لگاتے۔ پھر اس کی سفیدی آپ کی مانگ اور ڈاڑھی سے ظاہر ہوتی۔

دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آپ کی خصوصیات میں سے ہے لیکن یہ قول درست نہیں ہے کیونکہ خصوصیت کے دعویٰ کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب ہم مکّہ کے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر کرتے تو مشک کی خوشبو احرام کے وقت استعمال کیا کرتے تھے، اور جب پسینہ آتا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو کو دیکھتے کہ وہ پھیل جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے منع نہیں فرمایا۔

سر اور چہرہ ڈھانکنا

۱۰۔ دسواں حکم یہ ہے کہ محرم کے لئے سر ڈھانکنا جائز نہیں ہے اس کے تین درجہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بالاتفاق ممنوع ہے۔ (۲) جائز ہے (۳) مختلف فیہ ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو سر کو چھوتی ہو وہ ستر میں داخل ہے اور ناجائز ہے، جیسے عمامہ، خود وغیرہ، دوسری صورت جیسے خیمہ پیڑ وغیرہ، ان کے سایہ میں بیٹھنا جائز ہے، ان کا شمار ستر میں نہیں ہوتا، جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ آپ کے لئے خیمہ نصب کیا گیا تھا مگر امام مالکؒ نے منع فرمایا ہے کہ پیڑ وغیرہ کپڑا ڈال کر اس کے سایہ میں بیٹھنا جائز نہیں ہے، اور ان کے شاگردوں نے بھی یہی فرمایا ہے اور کہا ہے کہ محرم کو محمل کے سایہ میں بھی چلنا منع ہے لیکن اکثر علماء نے اس کی مخالفت کی ہے۔

تیسری صورت محمل اور ہودج وغیرہ کی ہے۔ اس میں تین قول ہیں۔ پہلا قول جواز کا ہے اور اس کے قائل امام شافعی، امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ دوسرا قول عدم جواز کا ہے اگر کوئی

اس کے سایہ میں بیٹھ گیا تو اُس کو فدیہ دینا پڑے گا۔ اور یہ امام مالکؒ کا مسلک ہے تیسرا قول یہ ہے کہ ممانعت ضرور ہے لیکن اگر کسی نے ایسا کر لیا تو فدیہ لازم نہیں آتا، اور یہ تینوں قسم کی روایات امام احمدؒ سے مروی ہیں۔

۱۱۔ محرم کے لئے چہرے کا چھپانا بھی جائز نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمدؒ اباحت کے قائل ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ، امام مالکؒ ناجائز کہتے ہیں اور اباحت کے بارے میں چھ حضرات صحابہؓ نے بھی فرمایا ہے، ان میں حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص حضرت جابرؓ شامل ہیں۔ اور تیسرا قول شاذ ہے وہ یہ ہے کہ مردہ کا چہرہ ڈھکنا جائز ہے اور زندہ کے لئے جائز نہیں ہے۔ علامہ ابن حزم نے فرمایا ہے کہ بظاہر یہ زیادہ مناسب ہے، لیکن جن لوگوں نے اباحت کو کہا ہے انھوں نے فرمایا کہ اصل تو اباحت ہی ہے۔ جواز اور عدم جواز اس کی فرع ہیں۔ دوسری دلیل ان چھ حضرات کے اقوال ہیں اور یہ حدیث

لا تخمروا راسہ — اس کے سر کو نہ چھپاؤ

کی تاویل کی ہے کہ سر سے مراد چہرہ ہے لیکن یہ روایت غیر محفوظ ہے۔ شعبہ نے کہا ہے اصل روایت یوں ہے:۔

لا تخمروا راسہ ولا وجھہ — اس کے سر اور چہرے کو نہ چھپاؤ۔

اس روایت میں یوں بھی مروی ہے:۔

خمروا وجھہ ولا تخمروا راسہ — اس کے چہرے کو چھپاؤ سر کو نہ چھپاؤ۔

۱۲۔ بارھواں حکم یہ ہے کہ موت کے بعد بھی احرام باقی رہتا ہے یہی مذہب حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ کا ہے، اور یہی امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحٰقؒ نے فرمایا، لیکن امام ابوحنیفہؒ، امام مالک، امام اوزاعی نے ارشاد فرمایا کہ موت کی وجہ سے احرام

منقطع ہوجاتا ہے۔ لہذا مردہ کی تکفین ویسی ہی کرنی چاہئے جیسے حلال کی کیجاتی ہے۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے۔ جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے مگر تین چیزیں الخ۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس قصہ میں کوئی دلیل ایسی نہیں ہے کہ جس کو پیش کیا جاسکے بلکہ یہ اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے جیسا کہ نجاشی بادشاہ کے جنازہ کی غائبانہ نماز، ان ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔ جمہور نے کہا ہے کہ تخصیص کا دعویٰ خلاف اصل ہے اس لئے اس کو قبول نہیں کیا جائیگا۔ اور حدیث میں ارشاد ہے

فانہ یبعث ملبیاً — قیامت کو وہ تلبیہ کہتا اٹھے گا

اس میں علّت کی طرف اشارہ ہے اگر خصوصیت ہوتی تو علّت نہ بیان کی جاتی جیسا کہ شہداء احد کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ان کو ان کے لباس ہی میں کفنا دو، قیامت کو جب یہ اٹھیں گے تو ان کے خون سے مشک کی بُو آتی ہوگی یہ حکم بھی شہداء احد کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ تمام شہیدوں کے لئے یہی حکم ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث اصول شرع کے مطابق ہے کہ "جو آدمی جس حالت میں مریگا اسی حالت میں اٹھایا جائیگا۔

عرفات سے کوچ کرنا

جب سورج اچھی طرح غروب ہوگیا، تو آپ نے عرفات سے کوچ فرمایا۔ آپ نے ناقہ کی مہار کو اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ اس کا سر کجاوہ کے قریب آنے لگا تھا۔ آپ نے اس وقت ارشاد فرمایا تھا:-

ایھا الناس علیکم بالسکینۃ — لوگو! سکون اور اطمینان سے چلو!

اس وقت آپ عام گذرگاہ سے کوچ فرمارہے تھے اور عرفات میں داخل دوسرے راستہ سے ہوئے تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عید کے موقعوں پر بھی یہی عادت مبارکہ تھی۔ اور اس کی حکمت پہلے بیان کی جاچکی ہے۔

آپ میانہ رفتار سے چل رہے تھے۔ جب ذرا کشادگی مل جاتی تو تیز ہوجاتے تھے جب کوئی ٹیلہ آتا۔۔ اونٹنی کی لگام ڈھیلی کردیتے تھے تاکہ وہ چڑھ جائے۔ اور تلبیہ پڑھتے ہوئے

چل رہے تھے۔ جب آدھا راستہ گذر چکا تو آپ پیشاب فرمانے کے لئے اُترے۔ اور پیشاب کیا اور پھر وضو کیا۔ اس وقت حضرت اسامہؓ نے عرض کیا۔ حضورؐ! نماز۔ فرمایا نماز آگے" بہرحال مزدلفہ تشریف لائے، اور نماز کے لئے وضو کیا۔ اور مؤذن کو اذان کا حکم دیا۔ اس نے اذان دی پھر اقامت کہی۔ پہلے آپ نے مغرب کی نماز کجاودں کے اتارنے سے قبل پڑھی۔ اور پھر کجاودں کو اتار کر اقامت کہی گئی تو عشاء کی نماز بلا اذان کے پڑھی گئی۔ اس کے درمیان میں کوئی سنت وغیرہ نہیں پڑھی گئی۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے دو اذانوں سے نماز ادا کی۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ ایک اذان اور دو اقامت سے نماز ادا کی جیسا کہ عرفات میں کیا تھا۔ پھر آپ سو گئے اور اس رات کو آپ تہجد کی نماز کے لئے بیدار نہیں ہوئے اور نہ آپ سے صحیح طور پر عیدین کی راتوں کو بیدار رہنا ثابت ہے۔

اس رات کو آپ نے اپنے اہل کو کمزوری (اور تھکاوٹ) کی وجہ سے اجازت دیدی تھی کہ وہ صبح صادق سے پہلے منیٰ پہونچ جائیں اور اس وقت چاند چھپ چکا تھا۔ آپ نے فرما دیا تھا کہ جب تک سورج نہ نکل آئے اس وقت تک رمی جمرہ نہ کریں اس کو ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے، لیکن حضرت عائشہؓ کی وہ روایت کہ جس میں مذکور ہے کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ کو لیلۃ النحر (دسویں شب) میں رات ہی کو بھیجدیا تھا اور انھوں نے سورج نکلنے سے پہلے ہی رمی کرلی تھی۔ اور یہ دن ام سلمہؓ کی باری کا دن تھا۔ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے" لیکن یہ حدیث منکر ہے۔ اس کا امام احمد نے انکار کیا ہے، اور وجہ انکار یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو امر فرمایا تھا کہ وہ صبح کی نماز مکہ میں جاکر ادا کریں" اور یہ چیز محال ہے کہ صبح کی نماز مکہ میں ادا کی جائے۔

اثرم نے کہا ہے کہ مجھ سے ابو عبداللہ نے کہا کہ زینب بنت ام سلمہ نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ کو امر فرمایا کہ وہ صبح کی نماز مکہ میں جاکر ادا کریں۔ اس روایت کو ابو معاویہ کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا ہے۔ اور یہ خطا

ہے۔ وکیع نے اس کو مرسل روایت کیا ہے۔ اور یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے۔ وکیع نے کہا کہ میں نے یحییٰ بن سعید سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس میں وہم ہو گیا ہے اصل روایت میں ہے:-

توافی منی　　　　منی میں ادا کرو۔

وکیع کے اصحاب نے کہا ہے کہ ان سے خطا ہو گئی ہے۔ خلال نے کہا ہے عروہ نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا، کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے بعض اہل کے ساتھ مزدلفہ کی رات میں پہلے ہی بھیجدیا تھا۔ میں نے رات میں رمی کی اور پھر مکہ آکر صبح کی نماز پڑھی اور پھر وہاں سے واپس ہو کر منی پہونچی۔

میں کہتا ہوں کہ اس روایت کا راوی، سلیمان بن داؤد دمشقی ہے اس کو ابن داؤد کہا جاتا ہے۔ ابو زرعہ نے کہا کہ وہ کچھ نہیں ہیں" اور عثمان بن سید ضعیف ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ اس روایت کے باطل ہونے کے بارے میں اسقدر کافی ہے کہ صحیحین میں روایت ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت سودہؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مزدلفہ کی رات لوگوں کے ہجوم کی روانگی سے قبل روانہ ہونے کی اجازت طلب کی۔ اور وہ ضعیف عورت تھیں۔ لہٰذا وہ حضور اکے کوچ فرمانے سے پہلے چلی گئیں۔ اور ہم سب صبح تک رہے۔ اور اگر میں اجازت مانگتی تو مجھے بھی مل جاتی"۔

یہ حدیث صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت سودہؓ کے علاوہ اور دیگر ازواج مطہرات تھیں۔ ان سب نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوچ فرمایا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت دار قطنی نے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کو اجازت دیدی تھی کہ وہ رات ہی کو مزدلفہ سے جاسکتی ہیں، اور رمی کرنے کے بعد اپنی قیامگاہ

پر آجائیں۔ اور حضرت عائشہ رضؓ نے مرتے دم تک ایسا ہی کیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ محمد بن حمید جو اس حدیث کے راویوں میں سے ہیں۔ ان کی بہت سے حضرات نے تکذیب کی ہے ونیز حضرت عائشہؓ کے اس قول کی تردید اس سے ہوتی ہے جو انھوں نے ہی فرمایا ہے۔

انی کنت استاذنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما استاذنت سودۃ رضؓ — جیسا کہ حضرت سودہؓ نے اجازت طلب کی تھی ایسے ہی میں نے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو اجازت مانگی تھی

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کی تردید بھی ممکن ہے تو حضرت ام حبیبہ کی وہ روایت جو مسلم میں ہے کہ

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث بھا من جمع بلیل — جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مزدلفہ سے رات ہی کو روانہ کر دیا تھا۔

تو ان سب کا جواب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کمزور متعلقین کو رات ہی کو روانہ کر دیا تھا، چنانچہ حضرت ابن عباس رضؓ بھی ان ہی میں سے ہیں اور یہ ثابت ہے کہ حضرت سودہ رضؓ کے علاوہ تمام ازواج آپ ہی کے ہمراہ رہیں اور آپ ہی کے ساتھ انھوں نے کوچ کیا۔ رہا حضرت ام حبیبہؓ کی حدیث کا معاملہ تو مسلم اس میں منفرد ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ام حبیبہ بھی ضعفا اور کمزوروں کے ساتھ روانہ ہو گئی ہوں اس کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ امام احمد نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعث بہ مع اھلہ الی منی یوم النحر فرموا الجمرۃ مع الفجر — نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل کے ہمراہ مجھے یوم النحر کو منی بھیجا اور انھوں نے فجر کے ساتھ رمی کی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام احمد اور ترمذی نے ان ہی کی دوسری روایت ذکر کی ہے اس میں سورج نکلنے سے پہلے رمی کی ممانعت ہے۔ یہ حدیث محفوظ ہے لیکن وہ حدیث جس میں اجازت ہے تو اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ بچوں کو اور کمزوروں کو بھیڑ

اور ازدحام کے خوف کی وجہ سے اجازت دیدی ہوگی جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معذور کے لیے فجر سے قبل رمی کرنے کی اجازت ہے، اس بنا پر اس مسئلہ میں تین مسلک ہیں، ایک تو یہ ہے کہ نصف لیل کے بعد ہر ایک کو رمی کرنے کی اجازت ہے خواہ عاجز ہو یا قادر ہو، یہی قول امام شافعی اور امام احمد کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ طلوع فجر سے قبل رمی جائز نہیں ہے، یہی قول امام ابوحنیفہ کا ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ قادر کو طلوع شمس کے بعد رمی کرنا جائز ہے، پہلے نہیں یہ اہل علم کی ایک بڑی جماعت کا قول ہے، واللہ اعلم

وقوف مزدلفہ جب دسویں تاریخ کی صبح ہوئی تو آپ نے نماز فجر ایک اذان اور اقامت سے اول وقت[1] ادا کی۔ یہ دن عید کا تھا اور یہی دن حج اکبر کا تھا[2]۔ اور یہی دن اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان عام کا دن تھا[3]۔ بعد نماز کے آپ سوار ہو کر مشعر حرام کے پاس آئے اور مستقبل قبلہ ہو کر تکبیر و تہلیل اور دعا میں مشغول ہوئے۔ یہاں تک کہ خوب دن نکل آیا اور اسفار ہوگیا۔ ابھی طلوع شمس نہیں ہوا تھا کہ اسی جگہ حضرت عروہ بن مضرطائی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا۔

میں قبیلہ طے کی پہاڑیوں سے آرہا ہوں اور میری سواری
بالکل نڈھال ہو چکی ہے۔ میں نے کوئی پہاڑی ایسی نہیں
چھوڑی، جہاں وقوف نہ کیا ہو، کیا میرا حج ہوگیا؟ آپ نے
ارشاد فرمایا، جس نے ہمارے ساتھ آج صبح کی نماز پڑھی

لہ قیام مزدلفہ کے علاوہ افضل یہی ہے کہ نماز فجر اسفار کر کے پڑھی جائے۔ اسفروا بالفجر فان اعظم للاجر الحدیث

لہ یوم حج اکبر، یوم النحر کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی رض کی روایت سے یہی ثابت ہے۔ یوم حج اکبر کی تفصیلی بحث ملاحظہ فرمایئے جلد اول صفحہ ۲۸ لہ اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہے اذان من اللہ ورسولہ الی الناس الآیۃ

اور ہمارے ساتھ کوچ کرنے سے قبل وقوف کیا اور اس رات
یا دن میں عرفات میں وقوف کیا (یعنی نویں تاریخ کا دن اور
دسویں شب) اس کا حج پورا ہو گیا۔

امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وقوف مزدلفہ اور وہاں شب باشی ارکان حج میں سے ہے۔ انھوں نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ حضرات صحابہ میں سے دو کا یعنی حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کا یہی مسلک ہے یہی خیال ابراہیم نخعی، شعبی، علقمہ، حسن بصری کا ہے۔ اور یہی مذہب اوزاعی، حماد بن ابی سلیمان داؤد ظاہری، ابو عبید قاسم بن سلام کا ہے اور اسی کو ابن جریر اور ابن خزیمہ نے اختیار کیا ہے اور یہی ایک دلیل امام شافعیؒ کی ہے۔

امام شافعی صاحبؒ کے تین دلائل ہیں۔ ایک یہی جو گذرا، اور دوسری دلیل یہ آیت مبارکہ ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ — مشعر حرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو!

اور تیسری دلیل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے جو اس آیت کے لئے بیان کا درجہ رکھتا ہے اور جن حضرات کے نزدیک وقوف مزدلفہ رکن نہیں ہے ان کا استدلال یہ ہے:۔

(۱) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقوف عرفہ کی مدت طلوع فجر تک قرار دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے وقوف عرفہ طلوع فجر سے ذرا قبل کیا اس کا حج صحیح ہو گیا۔ لہذا اگر وقوف مزدلفہ رکن ہے تو اس کا حج صحیح نہ ہونا چاہئے۔

(۲) اگر وقوف مزدلفہ رکن ہے تو اس میں عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں۔ لیکن جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کو رات ہی سے منیٰ بھیج دیا تو معلوم ہوا کہ یہ رکن نہیں ہے۔

ان دونوں دلیلوں میں نظر ہے کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج

کو قدرے رات گذرنے کے بعد روانہ کیا تھا، اور ذکر اللہ سے مراد عشا کی نماز ہے، اور وقوف مزدلفہ کا وقت فجر تک ہونا یہ اس کو منافی نہیں ہے کہ یہاں کی شب باشی رکن نہیں ہے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے جیسا کہ تنگ وقت میں دونوں نمازوں کو ادا کیا جاتا ہے[1]

بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں وقوف فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ کل مزدلفہ موقف ہے۔ یہاں سے آپ نے فضل بن عباس کو اپنا ردیف بنایا اور منی کی طرف کوچ کیا۔ اور آپ تلبیہ کہہ رہے تھے۔ اور حضرت اسامہ بن زید قریش کے آگے آگے پیدل چل رہے تھے۔ اسی راستہ میں آپ نے ابن عباسؓ کو امر فرمایا تھا کہ کچھ کنکریاں مارنے کے لئے اٹھالی جائیں اور ان کو پہاڑ سے توڑوا کر نہیں منگایا تھا جیسا کہ آج کل جہلا کرتے ہیں، اور آپ نے ان کنکریوں کو رات میں بھی نہیں اٹھایا تھا۔ بہر حال سات کنکریاں مثل چنے کے برابر اٹھائیں اور ہاتھ میں لیکر پھونک مار کر ان کو صاف کیا اور ارشاد فرمایا "ان جیسی کنکریوں سے رمی جمار کرو" اور غلو فی الدین سے بچو! تم سے پہلے لوگ غلو کی وجہ ہی سے ہلاک ہوئے ہیں۔

اسی راستہ میں قبیلہ خثعم کی حسینہ و جمیلہ عورت نے آپ سے اپنے بوڑھے باپ کے بارے میں دریافت کیا جو سواری پر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ تو اس کی طرف سے حج کرلینا، اس گفتگو کے دوران فضل بن عباسؓ اس عورت کی طرف دیکھتے تھے اور وہ عورت فضل بن عباسؓ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آپ نے فضل بن عباسؓ کے منھ پر ہاتھ رکھ کر ان کا رُخ دوسری طرف کو کردیا۔ اور فضل بن عباسؓ نہایت حسین و جمیل تھے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ نے فضل بن عباسؓ کا چہرہ ان کے دیکھنے کی وجہ سے موڑا تھا یا اس عورت کے دیکھنے کی وجہ سے موڑا تھا، دونوں ہی باتیں درست ہیں۔

اسی راستہ میں ایک اور آدمی نے اپنی بوڑھی ماں کے حج کے بارے میں ......

---

[1] یعنی ایک نماز آخری وقت میں اور دوسری نماز اسکے شروع وقت میں ملاحظہ فرمائیے جمع بین الصلوٰۃ صفحہ ۱

دریافت کیا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

> اگر تیری ماں پر قرضہ ہو تو کیا تو اس کو ادا کرے گا۔ اس
>
> نے عرض کیا، ہاں! تو آپ نے فرمایا تو اللہ تعالیٰ کا قرضہ
>
> اس سے زیادہ حقدار ہے کہ تو اس کو ادا کرے۔

جب آپ بطن محسر میں آئے تو آپ نے اپنی اونٹنی کی رفتار تیز کر دی۔ یہ آپ کی عادت شریفہ تھی کہ جن جگہوں میں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہے وہاں سے آپ تیزی سے گذر جاتے تھے[1] یہ وہی وادی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کو روک دیا تھا اور ان پر عذاب نازل کیا تھا۔ ایسا ہی آپ نے دیار ثمود سے گذرتے ہوئے کیا تھا۔ وادی محسر منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ایک برزخی فاصلہ ہے یعنی درمیان میں ہے اور بہت تھوڑا فاصلہ ہے۔ اس کا شمار نہ منیٰ میں ہے اور نہ مزدلفہ میں ہے جیسا کہ عرنہ کا شمار نہ عرفات میں ہے اور نہ مزدلفہ میں۔ بہر حال دونوں مشعر کے درمیان برزخی فاصلے ہیں، اور دونوں مشعر کا جزو نہیں ہیں۔

یہاں سے آپ نے درمیانی راستہ اختیار کیا جو بڑے جمرے کے پاس جاکر نکلتا ہے منیٰ پہونچ کر آپ نے جمرۂ عقبہ کی رمی اس طرح کی کہ آپ اسفل وادی میں کھڑے ہوئے منیٰ آپ کی داہنی طرف تھا اور قبلہ آپ کی بائیں جانب تھا۔ اور جمرہ کی طرف کو رخ کر کے اونٹنی پر سوار ہو کر جب سورج نکل آیا تو آپ نے سات کنکریاں یکے بعد دیگرے ماریں۔ اور ہر مارنے کے وقت تکبیر کہی۔ البتہ تلبیہ پہلی کنکر مارنے کے بعد ختم کر دیا تھا۔ اور آپ اس راستہ میں برابر تلبیہ کہتے رہے تھے۔ آپ نے جتنی دیر رمی کی حضرت بلال اونٹنی کی مہار پکڑے رہے اور حضرت اسامہ آپ پر کپڑے سے سایہ کئے رہے

---

[1] اسی سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ لہو لعب، گانے بجانے کی جگہ اور وہ مقامات جہاں معصیت ہوتی ہو تیزی سے گذر جانا چاہیے

اس سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ محرم محمل کے سایہ میں بیٹھ سکتا ہے اور اگر یہ قصہ بعد یوم نحر کا ہے تو اس سے استدلال درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں وقت مذکور نہیں ہے۔

قیامِ منیٰ

رمی سے فراغت کے بعد آپ منیٰ تشریف لائے اور ایک بلیغ خطبہ دیا جس میں لوگوں کو یوم النحر کی فضیلت اور عظمت بتلائی اور مکہ معظمہ کی فضیلت اور عظمت بتلائی اور فوقیت تمام شہروں پر ظاہر فرمائی۔ اور جو امیر اُن کا مقرر کر دیا گیا ہو اس کی اطاعت کا امر فرمایا بشرطیکہ وہ کتاب اللہ کے مطابق امر فرمائے۔ اور فرمایا کہ سب اپنے مناسک حج کو مجھ سے حاصل کریں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:۔

لعلی لا احج بعد عامی ھذا — شاید کہ میں اس سال کے بعد حج نہ کر سکوں۔

اور مہاجرین و انصار کو اپنی اپنی جگہ ٹھہرنے کو فرمایا اور تاکید فرمائی کہ کوئی میرے بعد دین سے نہ پھر جائے اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرے اور جو کچھ مجھ سے سنا ہے اُس کی تبلیغ کرے، چنانچہ ارشاد فرمایا:۔

رب مبلغ اوعی من سامع — بعض اوقات مبلغ سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔

اور ارشاد فرمایا جو بھی قصور کرے گا اس کا جرمانہ اسی پر رہے گا۔ آپ نے مہاجرین کو سمت قبلہ سے داہنی طرف اور انصار کو بائیں طرف ٹھہرایا۔ اور بقیہ لوگوں کو گرد۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی سماعت اسقدر تیز کر دی تھی کہ آپ کی آواز سب تک برابر پہونچ رہی تھی آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

اعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شھرکم۔ واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنۃ ربکم — اپنے رب کی عبادت کرو اور پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ اور ماہ رمضان کے روزے رکھو اور جب امر کیا جائے تو اطاعت کرو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

پھر آپ نے لوگوں کو رخصت کیا، اسی وجہ سے اس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے بعض لوگوں نے آپ سے دریافت کیا، اگر کسی نے سر منڈانے سے پہلے رمی کر لی تو کیا حکم ہے؟ فرمایا کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ نے تمام سوالات کے جواب میں ارشاد فرمایا "کرد کوئی حرج نہیں ہے"۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں، میں نے ذبح، سر منڈانا، رمی کرنے کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت اسامہ بن شریکؓ کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ کے ساتھ حج کیا۔ لوگ آتے تھے اور دریافت کرتے تھے اور آپ فرماتے تھے کوئی حرج نہیں ہے بلکہ حرج یہ ہے کہ کوئی کسی مسلمان کو ذلیل کرے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث نہیں ہے بلکہ محفوظ یہ ہے کہ رمی، ذبح، حلق کو اگر ایک دوسرے سے پہلے کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ مذبح کی جگہ تشریف لائے اور یہاں آپ نے ۶۳ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کئے یہ تعداد آپ کی عمر شریف کے سالوں کے برابر ہے۔ آپ نے تمام اونٹوں کو کھڑے کھڑے نحر کیا، ۶۳ ذبح کرنے کے بعد آپ نے حضرت علیؓ کو امر فرمایا کہ سو میں سے باقی اونٹ وہ ذبح کریں، اور امر فرمایا کہ ان اونٹوں کی جھول، لگام، گوشت اور کھالیں مساکین کو صدقہ کر دی جائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان جانوروں کی کوئی چیز، جزار کو اُجرت میں نہ دی جائے بلکہ اس کی اُجرت ہم اپنے پاس سے دیں گے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بخاری و مسلم کی اس طویل حدیث کے آخر میں جو یہ مذکور ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے سات اونٹ کھڑے کھڑے ذبح کئے اور دو دُنبے مدینہ منورہ میں ذبح کئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابن حزم نے کہا ہے کہ حضرت انسؓ کی یہ حدیث تین طریقوں سے مروی ہے، ایک یہ کہ آپ نے سات

اونٹ سے زیادہ اپنے ہاتھ سے ذبح نہیں کئے اور اس کے بعد ما بقی ۶۳ کو ذبح کرنے کے لئے دوسرے کو امر فرمایا۔ پھر اس جگہ سے ہٹ کر حضرت علیؓ کو ذبح کرنے کا امر فرمایا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بہت ممکن کہ حضرت انسؓ سات اونٹ کے ذبح کرنے تک رہے ہوں اور حضرت جابرؓ اول تا آخر رہے ہوں تیسری وجہ یہ ہے کہ سات اونٹ کے ذبح کرنے کے بعد بقیہ ۶۳ کا عدد پورا کرنے کے لئے حضرت علیؓ کے ہمراہ ذبح کیا ہو۔ ایسے ہی عروہ بن حارث کندی نے بیان کیا ہے۔ ان کی روایت اور حضرت جابرؓ کی روایت تقریباً ایک ہی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث کا کیا جواب ہے جو امام احمد اور ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس اونٹ خود ذبح کئے پھر مجھے امر فرمایا تو باقی میں نے ذبح کئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ راوی نے غلطی کی ہے اور معاملہ بالکل لوٹ دیا ہے۔ کیونکہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سات اونٹ ذبح کئے۔ اس وقت حضرت علیؓ موجود نہیں تھے جب حضرت علی آگئے تو آپ نے ۶۳ ذبح کئے اور باقی ۳۰ حضرت علیؓ نے ذبح کئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عبداللہ بن قرط کی حدیث کا کیا جواب ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے باعظمت دن یوم نحر ہے پھر اس کے بعد دوسرا دن ہے۔ اس کے بعد کہا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پانچ اونٹ پیش کئے گئے۔ وہ اونٹ آپ کی طرف سبقت کر رہے تھے تاکہ ان کو پہلے ذبح کیا جائے۔ جب ان کو پچھاڑ گیا، تو آپ نے ہلکی آواز سے کچھ پڑھا، آپ کی خدمت میں سو اونٹ یکبارگی پیش نہیں کئے گئے تھے۔ بلکہ تھوڑے تھوڑے پیش کئے گئے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث کا کیا جواب ہے جو بخاری و مسلم میں ہے اور جس کو ابوبکرہ نے روایت کیا ہے جس میں خطبہ کے ذکر کے بعد مذکور ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں دو دنبے پیش کئے گئے، اور آپ نے ان کو ذبح کیا۔ اس حدیث میں دو دنبوں کا ذبح کرنا مکہ میں ہے۔ اور حضرت انسؓ والی حدیث میں مدینہ میں ذبح کرنے کا ذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دو قصے ہیں جن راویوں نے منیٰ میں نحر کا ذکر کیا ہے اس سے مراد اونٹ کا نحر ہے اور یہ وہی اونٹ تھے جن کو آپ ھدی کے طور پر ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ حضرت جابر نے حجۃ الوداع کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اونٹوں ہی کا ذکر کیا ہے بعض راویوں پر دنبوں کا معاملہ پوشیدہ رہا جو یوم عید کو پیش آیا، انھوں نے اُس کو منیٰ کی طرف منسوب کر دیا۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو ابن حزم نے بیان کیا ہے کہ یہ علیحدہ علیحدہ دو قصے ہیں اور دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ چنانچہ ابو بکرہ نے مکہ کی قربانی کا ذکر کیا ہے ... ... اور حضرت انسؓ نے مدینہ منورہ کی قربانی کا ذکر کیا ہے۔ اس دن آپ نے بکری، گائے اور اُونٹ ذبح کیا، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بیان فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کی طرف سے گائے کی قربانی کی یہ حدیث صحیحین میں ہے اور مسلم میں اس طرح ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کی طرف سے قربانی کے دن گائے ذبح کی اور سنن کی روایت یہ ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں اپنی آل کی جانب سے گائے ذبح کی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ حاجی کے لئے ھدی کے جانور کے ساتھ قربانی بھی کرنا ضروری ہے اور صحیح مسلک پہلا ہے۔ اور ھدی کا جانور حاجی کے لئے بمنزلہ قربانی کے ہے اور یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہؓ میں سے کسی سے منقول نہیں ہے کہ ان میں سے کسی نے ھدی اور قربانی دونوں کو کیا ہو بلکہ ھدی کا جانور منیٰ میں ذبح کرتے تھے اور جب حج کو نہ جاتے تو قربانی کرتے تھے۔

اس کے باوجود حضرت عائشہؓ کا ارشاد کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کی طرف سے گائے ذبح کی، اس سے مراد ھدی کا جانور ہے اسی کو

انھوں نے قربانی کا جانور کہہ دیا ہے اور وہ سب چونکہ متمتعہ تھیں، اس لئے ان پر ھدی کرنا ضروری تھا۔ پس گائے کو ان کی طرف سے ذبح کر دیا گیا۔ اس کے تسلیم کرنے کے بعد یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات ۹ تھیں اور گائے کے زیادہ سے زیادہ سات حصے ہو سکتے ہیں۔ اس کا جواب ابن حزم نے دیا کہ حضرت عائشہ کا شمار اس میں نہیں ہے، کیونکہ وہ قارنہ تھیں اور ابن حزم کے نزدیک قارنہ پر قربانی نہیں ہے اس کی تائید میں ابن حزم نے مسلم کی حدیث جس کو ہشام بن عروہ نے روایت کیا ہے ذکر کی ہے۔ اس حدیث میں نہ ھدی کا ذکر ہے اور نہ صدقہ کا اور نہ روزہ کا۔ ابن حزم کا یہ خیال فاسد ہے۔ صحابہ اور تابعین میں سے یہ کسی کا مسلک نہیں رہا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ قارن پر ھدی ہے جیسا کہ تمتع کرنے والے پر ھدی ہے۔ حضرات صحابہؓ کی زبان سے یہی مذکور ہے۔ جہاں تک حدیث کی صحت کا معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں اسقدر عرض ہے کہ یہ حضرت ہشام کا اضافہ ہے۔ چنانچہ مسلم شریف میں پوری حدیث مذکور ہونے کے بعد یہ الفاظ ہیں :-

"ہشام بن عروۃ نے کہا کہ نہ اس میں ھدی ہے اور نہ صدقہ اور نہ روزہ۔"

ابن حزم نے کہا ہے کہ اگر وکیع نے اس کو حضرت ہشام کا قول قرار دیا ہے تو اس کو حدیث میں۔ ابن نمیر اور عبدۃ نے داخل کیا ہے اور یہ دونوں ثقہ ہیں۔ پس وکیع نے اس کو ہشام سے روایت کر دیا، کیونکہ انھوں نے ان سے سنا تھا، حالانکہ ہشام نے نہیں کہا تھا یہ قول ہشام کا نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے یوں بیان فرمایا ہے" اور کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ راوی کوئی حدیث روایت کرتا ہے، حالانکہ اس کا فتوٰی اس کے خلاف ہوتا ہے۔ بہر حال ان میں سے ہر ایک آدمی ثقہ ہے۔ ابن نمیر اور عبدۃ اور ہشام بن عروۃ ہر ایک کی عدالت مسلّمہ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ طریقہ انھیں لوگوں کے زیادہ لائق ہے جن کو علل احادیث میں تفقہ حاصل نہیں ہے جیسا کہ نقاد قسم کے ائمہ کو ہوتا ہے۔ یہ حضرات اس قسم کی باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ یہ ظاہر ہے کہ عبدۃ اور ابن نمیر نے یہ نہیں کہا کہ حضرت عائشہؓ نے یوں فرمایا ہے بلکہ اس میں ایک قسم کا ابہام ہوگیا ممکن ہے ان دونوں سے ہوا ہو یا ہشام بن عروۃ سے ہوا ہو۔ چنانچہ وکیع نے ایسے ہی روایت کردیا۔ اور جدا جدا اس کو انھوں نے بیان کردیا کہ فلاں نے کہا ہے۔

اس کے بعد یہ اشکال کہ ازواج مطہرات ۹ تھیں اور ایک گائے تھی تو اس بارے میں تین باتیں منقول ہیں (۱) یہ کہ ان سب کی جانب سے یہ گائے کردی گئی (۲) یہ کہ اس دن صرف ایک گائے ذبح کردی گئی تھی تیسری بات یہ ہے کہ یوم النحر میں گائے کا گوشت ہمارے پاس بھیجا گیا میں نے کہا یہ کیا ہے تو جواب ملا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کی طرف سے گائے ذبح کی ہے

لوگوں کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ ایک گائے یا ایک اونٹ کتنے آدمیوں کی جانب سے ہوسکتا ہے؟ بعض نے کہا سات آدمیوں کی جانب سے، یہی امام شافعی صاحبؒ کا مشہور قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دس آدمیوں کی جانب سے جائز ہے۔ یہ قول امام اسحٰق کا ہے اور یہ ثابت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر قرار دیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات نو تھیں، اس لئے ایک گائے ان کی طرف سے کردی گئی۔ اور سفیان نے زبیر کے واسطہ سے حضرت جابرؓ کی حدیث روایت کی ہے

انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ دس آدمیوں کی طرف سے ایک اونٹ ذبح کیا

باوجودیکہ یہ حدیث مسلم کی شرائط کے مطابق ہے، لیکن انھوں نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔ البتہ حضرت جابرؓ کا یہ قول روایت کردیا۔

ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لئے
نکلے، جب مکہ معظمہ پہونچے تو بیت اللہ اور صفا و مروہ کا طواف
کیا اور ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا کہ ایک
اونٹ اور ایک گائے میں سات آدمیوں کو شریک کرلیں،

مسند میں امام احمد نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے کہ بقرہ عید کا دن آگیا، چنانچہ ہم گائے میں سات آدمی اور اونٹ میں دس آدمی شریک ہوئے۔ اس کو نسائی نے اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ انھیں کی ایک دوسری روایت صحیحین میں ہے کہ ہم نے حدیبیہ میں ایک اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے اور ایک گائے سات آدمیوں کی طرف سے کی۔ اور حذیفہ نے کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں ایک اونٹ میں سات آدمیوں اور ایک گائے میں سات آدمیوں کو شریک کیا ان احادیث کو امام احمد نے تین طریقہ پر ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یا تو یہ بات ہے کہ دس بکریاں برابر ایک اونٹ قیمت کے اعتبار سے ہے یا ایک اونٹ سات ھدی کے برابر ہے یہ اس کا شرعی اعتبار ہے یا یہ کہا جائے یہ فرق زمانہ کے اعتبار سے ہوسکتا ہے، چنانچہ بعض جگہ بعض اوقات ایک اونٹ سات بکریوں کے برابر تھا تو اس کو سات کی طرف سے جائز قرار دیا، واللہ اعلم

ابو محمد ابن حزم نے کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کی طرف سے قربانی اور ھدی کے طور پر ایک گائے ذبح کی اور اپنی طرف سے دو ڈنبے ذبح کئے، یہ قربانی کے تھے اور ۶۳ اونٹ ھدی کے طور پر ذبح کیے۔ اس سے جو ایک وہم ہوتا تھا میں اس کو سمجھ گیا۔ وہ یہ کہ حاجی کی ھدی کا جانور مقیم کی قربانی کی طرح ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

منیٰ کی قربان گاہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ منی تمام قربانگاہ ہے اور مکہ معظمہ میں داخلے کے تمام راستے، راستہ بھی ہیں اور قربان گاہ بھی ہیں۔" اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کرنا صرف منی کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ مکہ معظمہ کے راستوں میں بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کا معاملہ ایسا ہی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وقوف عرفات کیا تو فرمایا، ... ... عرفات تمام موقف ہے۔ اور ایسے ہی مزدلفہ کے بارے میں ارشاد فرمایا

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منی میں گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے ڈیرہ ڈالنے کی اجازت چاہی گئی تاکہ آپ پر کچھ سایہ ہو جائے تو آپ نے منع کر دیا اور فرمایا "منی اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے جو پہلے پہونچ جائے اس کی وہی جگہ ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس بارے میں سارے مسلمان مشترک ہیں[1]۔ جس جگہ جو قائم ہو گیا۔ کوچ کرنے تک وہ جگہ اسی کی ہے۔ البتہ وہ ملکیت کسی کی نہیں ہے۔

قربانی کے بعد سر منڈانا

جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی سے فارغ ہو گئے تو آپ نے سر مونڈنے والے کو طلب فرمایا، چنانچہ معمر بن عبداللہ رض استرہ لئے موجود تھے۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا معمر! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کان کی لو کے قریب پر قدرت دیدی اور تیرے ہاتھ میں اُسترہ ہے[2]۔ انھوں نے جواب دیا نہیں حضور یہ تو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر انعام فرمایا ہے۔ اور یہ اس کا مجھ پر احسان ہے۔ اس کو امام احمد نے بہت نمایاں طور پر ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے محدثین کا خیال ہے کہ مونڈنے والے معمر بن عبداللہ تھے۔

---

[1] مساجد کے بارے میں بھی یہ مسئلہ ہے کہ جو آدمی جس جگہ بیٹھ گیا، اب اسکو کوئی اُٹھا نہیں سکتا۔ البتہ یہ طریقہ شرعاً ناجائز ہے کہ لوگ اپنے رومال اور تولیہ وغیرہ کے ذریعہ صف میں کسی جگہ پر حق تحقیق سمجھتے ہیں[2] یہ آپ نے مزاحاً فرمایا تھا۔

بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مونڈنے والے کو داہنی طرف کو اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، اس طرف سے مونڈنا شروع کرو، جب وہ مونڈ کر فارغ ہوئے تو آپ نے موئے مبارک ان حضرات کو تقسیم کر دیئے، جو وہاں موجود تھے۔ پھر بائیں طرف کے بال مونڈے گئے اور اس طرف کے تمام بال ابو طلحہ رضؓ کو دیدیئے گئے۔ صحیح مسلم میں اسی طرح ہے اور صحیح بخاری میں ابن سیرین نے حضرت انس رضؓ سے روایت کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مونڈا گیا تو سب سے پہلے بال حضرت ابو طلحہ رضؓ نے لیئے لیکن اس روایت اور پہلی روایت میں تناقض نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ دونوں جانب کے بال حاصل کرنے میں حضرت ابو طلحہ رضؓ مقدم ہوں لیکن امام مسلم نے حضرت انس رضؓ کی حدیث روایت کی ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمرہ کی رمی سے فارغ ہوئے اس کے بعد قربانی کی۔ اور سر منڈوایا تو بال مونڈنے والے نے داہنی طرف کے بال مونڈے تو آپ نے حضرت ابو طلحہ کو طلب فرمایا اور وہ بال ان کو دیدیئے۔ اس کے بعد بائیں جانب کے بال مونڈوائے تو وہ بال حاضرین کو حضرت ابو طلحہ سے تقسیم کرا دیئے۔

اس روایت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضؓ کو دائیں جانب کے بال ملے اور پہلی روایت میں بائیں جانب کے بالوں کا تذکرہ ہے، حافظ ابو عبداللہ نے کہا ہے کہ مسلم نے حفص بن غیاث اور عبدالاعلیٰ کے واسطہ سے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو طلحہ کو بائیں جانب کے بال مرحمت فرمائے۔ اور سفیان بن عیینہ کی سند سے روایت کیا ہے کہ دائیں جانب کے بال عطا فرمائے لیکن پہلی روایت زیادہ قوی ہے۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن سیرین کی پہلی روایت بخاری نے بھی ذکر کی ہے واللہ اعلم اور یہ ثابت ہے کہ بائیں جانب کے بال آپ نے حضرت ابو طلحہ رضؓ ہی کے لئے خاص فرمائے تھے۔ اور اکثر روایات اسی پر ہیں۔ چنانچہ مذکور ہے کہ آپ نے بال مونڈنے والے کو طلب فرمایا

اور اس کو داہنی طرف سے مونڈنے کا اشارہ کیا اور ان بالوں کو جو آپ کے پاس بیٹھے تھے ان پر تقسیم فرما دیا۔ اس کے بعد بائیں طرف کے بالوں کے لئے فرمایا اور وہ ام سلیمؓ کو مرحمت فرما دیئے"۔ اس روایت میں اور پہلی روایت میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ ام سلیمؓ حضرت ابو طلحہؓ کی بیوی ہیں۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دائیں طرف کے بال ایک ایک دو دو سب لوگوں کو تقسیم کر دیئے اور بائیں طرف کے سب بال حضرت ابو طلحہ کو دیدیئے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ نے بائیں جانب کے بال حضرت ابو طلحہ رضؓ کو دیدیئے اور اس کے بعد ناخن کٹوائے اور ان کو لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ امام احمد نے روایت کیا ہے کہ محمد بن زید کہتے ہیں کہ میرے والد اور ایک قریشی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے وقت موجود تھے۔ وہ گوشت تقسیم کر رہے تھے۔ اتفاق سے ان کے حصہ میں کچھ بھی گوشت نہ آیا، چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے میں بال مونڈوائے اور ان کو دیئے۔ اس کے بعد لوگوں پر تقسیم کئے اور ناخن کٹوائے وہ بھی تقسیم کر دیئے ہمارے پاس خضاب والے بال تھے۔ آپ نے سر منڈوانے والوں کے لئے تین مرتبہ مغفرت کی دعا کی اور بال کٹوانے والوں کے لئے ایک مرتبہ مغفرت کی دعا کی۔ اکثر صحابہؓ نے بال مونڈوائے اور بعض نے کٹوائے۔ یہ عمل اس آیت مبارکہ کے مطابق ہے

لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقین رؤسکم ومقصرین

اللہ تعالیٰ نے اگر چاہا تو تم بال منڈے اور بال کٹے ہوئے مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہوں گے

اس کے باوجود حضرت عائشہ کا یہ ارشاد کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احرام باندھنے سے قبل اور احرام کھولنے سے پہلے بال منڈوانا پسند تھے"۔ اس سے کوئی حرام لازم نہیں آتا ہے (کیونکہ اس میں عادت شریفہ کا ذکر ہے اور آیۃ مبارکہ میں جواز کا ذکر ہے)

منیٰ سے مکہ کی طرف جانا

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے سوار ہو کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور طواف

افاضہ فرمایا اور اسی کا نام طواف زیارت ہے۔ اور اس کو طواف صدر بھی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ آپ نے سعی نہیں کی تھی یہی صواب ہے۔ اس مسئلہ میں تین جماعت ہو گئی ہیں بعض نے کہا ہے کہ آپ نے دو طواف کئے۔ ایک طواف قدوم جو طواف افاضہ کے علاوہ تھا، ایک جماعت نے کہا ہے کہ آپ نے اس طواف کے ساتھ بھی سعی کی کیونکہ آپ قارن تھے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ آپ نے اس دن سعی نہیں بلکہ اس دن طواف زیارت کو آپ نے رات تک موخر کر دیا تھا۔

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صحیح بات میں کہتا ہوں۔ اثرم نے کہا، میں نے ابو عبد اللہ سے دریافت کیا کہ تمتع کرنے والا طواف اور سعی کتنی مرتبہ کرے؟ فرمایا ایک مرتبہ طواف اور سعی حج کے لئے کرے اور دوسری مرتبہ طواف زیارت کے لئے! اور ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔ شیخ نے المغنی میں کہا ہے کہ یہی حکم قارن اور مفرد کے لئے کہ وہ جب تک یوم نحر سے پہلے مکہ معظمہ نہ آئے ہوں۔ یہ دونوں طواف زیارت سے پہلے طواف قدوم کریں گے۔ حضرت امام احمد نے اسی پر اصرار کیا ہے اور فرمایا کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے پہلے عمرہ کے لئے طواف اور سعی کی اور پھر حلال ہو گئے۔ اور پھر منیٰ سے حج کے بعد لوٹنے کے طواف کیا (بہتر ہے) اس کے علاوہ وہ حضرات جنھوں نے حج اور عمرہ جمع کیا وہ صرف ایک ہی طواف کریں۔

امام احمد نے حضرت عائشہ رضؓ کے ارشاد کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ حج کے لئے جو طواف کیا جاتا ہے وہ طواف قدوم ہوتا ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ طواف قدوم جائز ہے۔ لہذا طواف زیارت کو اس کا مسقط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی صورت بعینہ ایسی ہے جیسا کہ فرض نماز پڑھنے سے پہلے تحیۃ المسجد کو ادا کر لیا جائے۔ علامہ خرقی نے اپنی مختصر میں بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی متمتع ہے تو اس کو سات طواف بیت اللہ کے کرنے ہوں گے جیسا کہ عمرہ کے لئے کرتے ہیں پھر دوبارہ طواف جو کیا جائے گا وہ طواف زیارت کا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ

کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب

ولیطوفوا بالبیت العتیق — اور چاہیے کہ بیت اللہ کا طواف کریں

ہٰذا جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متمتع تھے جیسے علاّ قاضی اور اُن کے اصحاب کا کہنا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے اور شیخ ابو محمد کے نزدیک یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ خاص قسم کے متمتع تھے پھر بھی آپ نے ایسا نہیں کیا ہے۔ اور میں نہیں جانتا کہ کسی نے ابو عبداللہ کی اس طواف کے بارے میں موافقت کی ہو جس کو علامہ خرقی نے بیان کیا ہے بلکہ مشروع طواف زیارت کے لئے ایک طواف ہے جیسا کہ کوئی مسجد میں اُس وقت داخل ہو اُس وقت تحیۃ المسجد کے لیے یہی فرض کافی ہو جائیں گے۔ اور یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے بارے میں منقول نہیں ہے کہ جنھوں نے حجۃ الوداع میں تمتع کیا تھا۔ کہ اس کے خلاف کیا ہو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کسی کو امر بھی نہیں فرمایا تھا حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث اسی پر دلیل ہے انھوں نے کہا ہے کہ آپنے صرف ایک ہی طواف کیا تھا۔ یہی طواف زیارت تھا اس کے علاوہ کوئی طواف مذکور نہیں ہے اگر یہ طواف قدوم ہوا ہوتا تو طواف زیارت میں اس کا ذکر نہ ہوتا اور طواف زیارت ہی رکن ہے کہ جس کے بغیر حج پورا ہی نہیں ہوتا۔ بہرحال حضرت عائشہ رضؓ نے ایک طواف کے علاوہ ذکر نہیں کیا ہے لہٰذا دو طواف کا استدلال کہاں سے کیا جائیگا؟ اس لئے کہ جب حضرت عائشہ رضؓ کو حیض آیا اور ..... جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو امر فرمایا تھا، اور اس لئے کہ اگر طواف قدوم ساقط نہیں ہوا تھا تو اس کا اعادہ طواف عمرہ میں ہونا چاہیئے تھا اور ایسا ہوا نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ابو محمد کے کلام سے اشکال ختم نہیں ہوا وہ بدستور قائم ہے اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کا انکار اس طرح سے کیا جائے کہ حضرات صحابہ رضؓ میں سے کسی نے بھی

عرفات سے لوٹنے والے کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ جس نے طواف قدوم نہ کیا ہو وہ اب کرے۔ اور نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور نہ کیا لیکن اشکال کا منشا یہ ہے کہ حضرت ام المومنین رضؓ نے متمتع اور قارن کے بارے میں یہ فرق کیا ہے کہ قارن اور متمتع منی سے لوٹ کر صرف ایک ہی طواف کریں گے لیکن جن لوگوں نے عمرہ کا احرام باندھا ہے وہ منی سے لوٹ کر ایک دوسرا طواف کریں گے۔ یہ طواف طواف زیارت کے علاوہ ہے۔ کیونکہ طواف زیارت میں قارن اور متمتع دونوں برابر ہیں۔ اس کے بارے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن شیخ ابو محمد نے یہ خیال فرمایا کہ ان کو منی سے لوٹنے کے بعد اس کے علاوہ ایک اور طواف کرنا پڑے گا۔

اس بارے میں یہ پیچیدگی دیکھ کر دوسری جماعت نے یہ کہہ دیا کہ یہ عروۃ یا اس کے بیٹے کی زیادتی ہے جو ظاہر نہیں ہو رہی ہے۔ اس وجہ سے یہ حدیث مرسل ہے۔ اس ارسال کے باوجود بھی اشکال بدستور باقی رہتا ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے جس طواف کی خبر دی ہے وہ طواف بیت اللہ نہیں ہے بلکہ صفا اور مروہ کا طواف ہے اس طرح اشکال بالکل ختم ہو جائے گا۔ اور یہی قول جمہور کا ہے اس طرح یہ حدیث حضرت عائشہ رضؓ کی دوسری حدیث کے عین موافق ہو جائے گی۔ جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ بیت اللہ اور صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنا تیرے حج اور عمرہ کے لئے کافی ہے"۔

اس کو تسلیم کر لینے کے بعد اس مسئلہ پر حضرت جابر رضؓ کی حدیث سے اشکال پیدا ہوتا ہے جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضؓ میں سے کسی نے بھی بجز پہلے طواف کے کوئی طواف نہیں کیا۔ یہ حدیث اس قول کے موافق ہے کہ متمتع کے لئے ایک طواف اور ایک سعی ہے"۔ یہی ایک روایت امام احمد کی ہے اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کی روایت مثبت ہے اور حضرت جابر رضؓ کی

منفی ہے اور اصولاً مثبت کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ یا حضرت جابرؓ کی مراد وہ حضرات ہو سکتے ہیں جنھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قران کیا تھا اور اپنے ساتھ ھدی لے گئے تھے جیسے حضرت ابوبکر صدیق رض حضرت عمر رض۔ ان حضرات نے ایک ہی سعی کی اور ایک ہی طواف کیا، ورنہ حضرت عائشہ رض کی حدیث میں ادراج ماننا پڑے گا۔ بہر حال اس حدیث کی یہ تین تاویل تھیں۔ واللہ اعلم

لیکن جن لوگوں نے کہا ہے کہ متمتع قدوم کے لئے طواف بھی کرے گا اور سعی بھی کرے گا۔ منی جانے سے پہلے یہ قول امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا ہے لیکن اس کے بارے میں، میں قوت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ ابو محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رض میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا۔ اور نہ امر کیا، اور نہ کسی اور نے ایسا کیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل مکہ منی سے لوٹنے سے پہلے نہ سعی کریں اور نہ طواف کریں۔ اسی کے مطابق جمہور کا مسلک ہے اور یہی امام مالک، امام احمد، امام ابو حنیفہ اور امام اسحٰق نے فرمایا ہے لیکن جو حضرات اس سعی اور طواف کے استحباب کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ احرام باندھنے کی وجہ سے مکی بھی آفاقی کی طرح ہوجاتا ہے لہٰذا اس کو طواف کرنا مستحب ہے۔ لیکن یہ دونوں دلیل نہایت کمزور ہیں، اس لئے کہ مکی کا قادم ہونا اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب وہ عمرہ کے افعال ادا کرے۔ اس کا یہ طواف طواف قدوم سے مستغنی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ فرض نماز، جماعت میں شریک ہونے کی وجہ سے تحیۃ المسجد سے مستغنی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں حضرات صحابہؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کا احرام باندھا تھا، باوجودیکہ وہ اکثر متمتع تھے، لیکن انھوں نے اس کے بعد طواف نہیں کیا۔

حسن بن زیاد نے امام ابو حنیفہ رض سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ

اگر یوم ترویہ کو زوال سے قبل احرام باندھا ہے تو طواف قدوم اور سعی کرنا چاہیے۔ اور اگر بعد زوال باندھا ہے تو نہیں، اس طرح انھوں نے فرق کیا ہے، کیونکہ بعد زوال کے منی کی طرف جانے کا معاملہ رہتا ہے اور قبل زوال یہ مشغولیت نہیں ہوتی ہے بہر حال جمہور اور حضرت ابن عباسؓ کا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم

طوافِ زیارت ایک تیسری جماعت اور ہے جس کا کہنا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف زیارت کو رات تک موخر کیا تھا۔ اس جماعت میں، طاؤس، مجاہد، عروۃ داخل ہیں چنانچہ سنن ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ نے ابوزبیر مکی کی سند سے حضرت عائشہ کی حدیث روایت کی ہے، اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طواف کو یوم نحر میں رات تک موخر رکھا۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔ حالانکہ یہ حدیث غلط ہے، اس بارے میں اہل علم کو شک نہیں ہے چنانچہ ہم علماء کے اقوال کا ذکر کریں گے۔

امام ترمذی نے کتاب العلل میں بیان کیا ہے کہ میں نے امام بخاری سے دریافت کیا "کیا ابوزبیر نے حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباسؓ سے سنا ہے انھوں نے کہا ہاں ابن عباسؓ سے تو سنا ہے لیکن حضرت عائشہ رض سے سننا محل نظر ہے۔ ابوالحسن قطان نے کہا ہے کہ میرے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طواف دن میں کیا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی یا لوٹ کر منیٰ میں پڑھی؟ حضرت ابن عمر رض آخری بات کے قائل ہیں۔ حضرت جابر مکہ کے بارے میں فرماتے ہیں حضرت جابر رض کا قول ظاہر ہے اور .. ابوزبیر کی روایت کے علاوہ حضرت عائشہ رض کا قول ہے لہذا ابوزبیر مدلس ہیں۔ ان کے بارے میں یہ طے ہے کہ ان کا سماع نہ حضرت عائشہ رض سے ثابت اور نہ حضرت ابن عباس رض سے ثابت بلکہ بالواسطہ انھوں نے روایت کیا ہے۔ لہذا اس بارے میں توقف کرنا واجب ہے۔

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مدلس کی حدیث کو قبول کیا جائے یا نہیں؟ بعض نے کہا ہے قبول کرنا چاہئے اور بعض نے کہا ہے نہیں قبول کرنا چاہیئے۔ یہ گذر چکا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن میں طواف کیا ہے۔ لہذا اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابو زبیر نے حضرت عائشہ رض سے روایت کرنے میں غلطی ہے، کیونکہ ابو سلمہ بن عبدالرحمن نے حضرت عائشہ رض سے روایت کیا ہے کہ ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا اور منیٰ سے یوم النحر ہی کو، کوچ کر دیا تھا، اور محمد بن اسحٰق نے حضرت عائشہ رض کی حدیث روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رض کو اجازت دیدی تھی اور انھوں نے دوپہر کے وقت یوم النحر میں طواف زیارت کیا۔ اور جناب رسول اللہ نے اپنی ازواج کے ساتھ رات کو طواف کیا اور یہ غلط ہے بیہقی نے کہا ہے اس بارے میں دن والی حدیث صحیح ہے میں کہتا ہوں، بات صحیح ہے لیکن طواف کا نام لینے میں غلطی ہوئی ہے کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف رخصت کو موخر کیا تھا نہ کہ طواف زیارت کو۔ اور یہ حدیث متصلاً صحیحین میں ہے۔ لہذا ابو زبیر نے غلطی کی یا اس نے غلطی کی جس نے ابو زبیر سے روایت کیا۔ واللہ اعلم

طواف زیارت اور طواف وداع میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمل نہیں کیا بلکہ طواف قدوم میں رمل کیا تھا۔

آب زمزم نوش فرمانا

طواف زیارت سے فارغ ہو کر آپ چاہ زمزم پر آئے۔ آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ کنویں سے پانی نکال رہے ہیں تب آپ نے ارشاد فرمایا، اگر مجھے لوگوں کے ہجوم کرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں خود نکال کر پیتا۔ اس کے بعد آپ نے ڈول لیا اور کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا۔

کہا گیا ہے اس سے کھڑا ہو کر پانی پینے کی ممانعت منسوخ ہوگئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہی ترک اولیٰ کے بارے میں تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں کھڑا ہو کر پینا ضرورتاً تھا۔ اس جگہ یہ

بھی سوال ہوتا ہے کہ آپ نے یہ طواف پیدل کیا یا سوار ہو کر کیا؟ چنانچہ امام مسلم نے حضرت جابر رضؓ کی حدیث روایت کی ہے کہ آپ نے یہ طواف اپنی سواری پر کیا۔ اور محجن سے بوسہ لیا، اور یہ اس وجہ سے کیا تاکہ لوگ آپ کو دیکھ سکیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت صحیحین میں ہے کہ آپ نے اونٹ پر طواف کیا اور محجن کے ذریعہ بوسہ لیا۔ اور یہ طواف رخصت نہیں تھا کیونکہ طواف رخصت تو آپ نے رات میں کیا تھا، اور نہ طواف قدوم تھا، کیونکہ طواف قدوم میں آپ نے رمل کیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ رمل سواری پر نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں عمرو بن شرید نے کہا ہے۔

افضت مع رسول اللہ صلی اللہ	میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
علیہ وسلم فما مست قدماہ	افاضہ کیا۔ آپ کے قدم مبارک نے زمین کو نہیں
الارض حتی اتی جمعا	چھوا، حتی کہ آپ مزدلفہ آگئے۔

اس روایت سے دو رکعت طواف پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ دو رکعت طواف کا معاملہ تو ظاہر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ افاضہ عرفات سے مزدلفہ کی طرف ہے۔ مزدلفہ کو ہی "جمع" بھی کہتے ہیں۔

منیٰ کی طرف جانا

اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز کہاں پڑھی؟ صحیحین میں ابن عمر رضؓ کی روایت میں ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی۔ اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضؓ کی روایت ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز مکہ میں ادا کی۔ یہی حضرت عائشہ رضؓ نے ارشاد فرمایا ہے لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟ ابو محمد بن حزم نے کہا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت جابر رضؓ کا قول اولیٰ ہے، اسی کو ایک جماعت نے اختیار کیا ہے کیونکہ (۱) دو کی روایت ایک کے مقابلہ میں بہتر ہے (۲) حضرت عائشہ رضؓ کو زیادہ خصوصیت حاصل ہے (۳) حضرت جابر رضؓ کی حدیث کو اس وجہ سے اولیت حاصل ہے کہ وہ اول تا آخر محفوظ ہے اور مفصل ہے حتی کہ اس میں وہ چیزیں بھی مذکور ہیں جن کا تعلق مناسک سے نہیں ہے (۴) یہ کہ حجۃ الوداع میں

تمام اعمال رات اور دن میں ادا ہوئے۔ چنانچہ آپ طلوع شمس سے قبل منیٰ تشریف لائے اور آپ نے خطبہ دیا پھر قربانی کی۔ پھر سر منڈوایا، قربانی کا گوشت تقسیم فرمایا۔ اور قربانی کا گوشت جب پک چکا تب آپ نے نوش فرمایا؟ رمی جمار بھی کیا۔ پھر یہاں سے کوچ کر کے مکہ تشریف لائے اور طواف کیا اور زمزم نوش فرمایا۔ ان تمام اعمال کی وجہ سے یہ کہنا دشوار ہے کہ آپ کو پھر بھی اتنا وقت مل گیا کہ آپ نے ظہر کی نماز بھی واپس آکر منیٰ ادا کرلی تھی؟ (۵) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں راویوں نے عادت شریفہ کے مطابق بیان کیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حجۃ الوداع میں عادت شریفہ یہی رہی کہ آپ نے اپنی قیامگاہ پرہی نماز ادا فرمائی لہٰذا حضرت ابن عمرؓ نے عادت شریفہ کے مطابق روایت کیا اور حضرت جابرؓ اور حضرت عائشہؓ نے خارج از عادت شریفہ روایت کیا لہٰذا حفظ کے اعتبار سے یہی اولیٰ ہے۔

بعض حضرات نے چند وجہ سے حضرت ابن عمرؓ کی روایت کو اولیٰ قرار دیا ہے (۱) یہ کہ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز مکہ میں ادا کی تھی، تو حضرات صحابہؓ نے منیٰ میں تنہا تنہا نماز ادا کی ہوگی اور یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کوئی نائب مقرر نہیں کیا تھا کہ میرے بعد فلاں نماز پڑھائے گا لہٰذا ثابت ہے کہ ظہر کی نماز آپ نے منیٰ آکر ہی پڑھائی ہوگی۔

(۲) یہ کہ اگر آپ نے ظہر کی نماز مکہ میں ادا کی تو لازماً بعض اہل شہر نے ضرور آپ کے پیچھے نماز پڑھی ہوگی اور وہ مقیم تھے لہٰذا آپ نے ان کو ضرور فرمایا ہوگا کہ تم اپنی نماز پوری کرلو! اور کسی نے بھی یہ روایت نہیں کیا ہے، لہٰذا آپ نے ظہر کی نماز مکہ میں ادا نہیں کی۔ اور اگر کوئی ناواقف کہہ بھی دے تو ہم کہیں گے کہ وہ فتح مکہ کا واقعہ ہے۔

(۳) یہ ظاہر ہے کہ جب آپ نے دو رکعت طواف ادا کی ہوں گی تو آپ کے پیچھے آپ کی اقتدا کرنے والے بہت سے مسلمان ہوں گے تو بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ وہ ظہر کی دو رکعت ہیں، حالانکہ وہ رکعت طواف تھیں۔ اس قسم کا احتمال دور نہیں ہوسکتا۔ بخلاف منیٰ میں نماز کے

بارے میں اس میں یہ احتمال نہیں ہوتا ہے۔

(۴) آپ سے ثابت نہیں ہے کہ قیام مکہ کے درمیان آپ نے مکہ میں نماز پڑھی بلکہ آپ نے اپنی قیام گاہ پر مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھی منزل پر ہی آپ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔

(۵) حضرت ابن عمر رضؓ کی حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت جابر رضؓ کی حدیث صرف امام مسلم نے روایت کی ہے، اسی طرح حضرت ابن عمر رضؓ کی حدیث کے راوی زیادہ حافظ ہیں اور زیادہ محتاط ہیں۔

(۶) حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث میں وقت کے بارے میں اضطراب ہے چنانچہ ایک میں دن کا وقت ہے دوسری روایت میں رات تک طواف کو مؤخر کرنے کا ذکر ہے تیسری روایت میں ہے کہ آپ نے دن کے آخری حصہ میں کوچ فرمایا ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں اس قسم کا اضطراب نہیں ہے۔

(۷) حضرت ابن عمر رضؓ کی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ اور حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث میں ابنِ اسحٰق کے بارے میں اختلاف ہے۔

(۸) حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث سے ظاہراً یہ بات نہیں ثابت ہوتی ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز مکہ میں ادا کی، اس میں تو یہ ہے کہ:-

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر دن میں کوچ فرمایا
جب ظہر پڑھ چکے پھر منیٰ تشریف لائے اور یہاں ایام تشریق کی
چند راتوں میں قیام فرمایا۔

اس حدیث میں صراحۃً یہ مذکور نہیں ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز مکہ میں ادا فرمائی اور حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے:-

افاض یوم النحر، ثم صلی الظہر   آپ نے یوم نحر کو کوچ فرمایا، اور منیٰ آکر ظہر

یمنی دلجمعاً   کی نماز ادا کی۔

حضرت ام سلمہ کا طواف

ابن حزم نے کہا ہے کہ اس دن حضرت ام سلمہ رضؓ نے بیمار ہونے کی وجہ سے لوگوں کے پیچھے اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا۔ مسلم نے حدیث روایت کی ہے حضرت ام سلمہ رضؓ فرماتی ہیں:۔

> میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی طبیعت خراب
> ہونے کے بارے میں عرض کیا تو آپ نے مجھے لوگوں کے پیچھے
> سے سوار ہو کر طواف کرنے کی اجازت دی، اس وقت جناب
> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں ایک طرف ہو کر
> نماز پڑھ رہے تھے اور نماز میں سورۂ طور قرأت فرما رہے تھے

اس حدیث سے بظاہر نہیں ہو رہا ہے کہ یہ طواف افاضہ تھا، اس لئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں رکعات میں سورۂ طور کی قرأت نہیں فرمائی۔ وہ بھی اس طرح کہ حضرت ام سلمہ رضؓ نے سنا ہو۔ ابو محمد نے کہا ہے کہ جس نے ایسا کہا ہے غلط کہا ہے بلکہ حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث صحیح ہے، اس میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضؓ کو یوم النحر کی شب میں ہی منیٰ بھیج دیا تھا۔ انھوں نے فجر سے پہلے ہی رمی جمرہ کر لی تھی۔ اس کے بعد جا کر طواف افاضہ کیا تھا۔"

لہٰذا حضرت ام سلمہ رضؓ کی شرکت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ محالات میں سے ہے کیونکہ یہ قرأت یا تو نماز فجر میں کی یا مغرب میں یا عشاء میں اور ان اوقات میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قطعاً مکہ معظمہ میں نہیں تھے۔

بہر حال حضرت عائشہ رضؓ نے اس دن ایک طواف اور ایک سعی کی۔ اور یہ افعال ان کے حج اور عمرہ دونوں کے لئے کافی ہو گئے۔ حضرت صفیہ رضؓ نے اس دن طواف کیا اور پھر ان کو حیض آ گیا یہی طواف ان کے طواف رخصت کا قائم مقام ہو گیا۔ اس سے عورتوں کے بارے میں

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت شریفہ بھی معلوم ہوگئی۔

منیٰ کا قیام طواف زیارت کے بعد آپ منیٰ تشریف لائے اور رات کو یہیں قیام فرمایا۔ اگلے دن جب سورج ڈھل گیا تو آپ اپنی قیام گاہ سے جمار کی طرف تشریف لائے اور بغیر سوار ہوئے رمی کی۔ پہلے اس جمرہ کے سات کنکریاں ماریں جو مسجد خیف سے متصل ہے۔ ہر کنکر مارنے کے وقت آپ نے اللہ اکبر کہا۔ پھر اس جمرے کے سامنے پہونچے اور مستقبل قبلہ ہو کر دعا کی یہ دعا بقدر سورۂ بقرہ طویل تھی۔ اس کے بعد آپ جمرۂ وسطیٰ کے پاس آئے اور وہاں بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد آپ جمرۂ... عقبہ کے پاس تشریف لائے اور یہ تیسرا جمرہ ہے۔ اور اس طرح کھڑے ہوئے کہ بیت اللہ آپ کے بائیں جانب اور منیٰ دائیں جانب تھا، اور وہاں سے رمی کی اور آپ نے جمرات کے اوپر کی طرف کھڑے ہو کر رمی نہیں کی جیساکہ جاہل کرتے ہیں۔

رمی کرنے کے بعد آپ فوراً واپس ہو گئے۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جگہ تنگ تھی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبادت سے فارغ ہونے سے قبل دعا کرنا افضل عبادت ہے اور جب رمی سے فارغ ہو گئے تو یہ فضیلت ختم ہو گئی۔ اس وجہ سے آپ نہیں ٹھہرے یہی وجہ ہے کہ آپ کی دعا نماز میں تو ثابت ہے، لیکن بعد نماز کے ثابت نہیں ہے۔ اگرچہ غیر صحیح روایت میں منقول ہے کہ آپ کبھی بعد سلام کے طویل دعا فرمایا کرتے تھے۔ اس حدیث کی صحت میں کلام ہے، اس میں شک نہیں ہے کہ جو دعا آپ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو سکھائی تھی وہ نماز کی دعا ہے لیکن حضرت معاذ بن جبل رضؓ کی بھی حدیث موجود ہے:

لا تنس ان تقول دبر کل صلوٰۃ	تو ہر نماز کے بعد یہ کہنے سے نہ بھولنا
اللّٰھم اعنی علیٰ ذکرک وشکرک	اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلیٰ ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ
وحسن عبادتک	وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ۔

یہاں دبر صلوٰۃ سے مراد آخر صلوٰۃ قبل سلام ہے جیسے کہ دبر حیوان اور بعد سلام بھی

مراد ہو سکتا ہے، جیسے [1]

تسبحوا اللہ دبر کل صلوٰۃ۔ ہر نماز کے بعد اللہ کی تسبیح کیا کرو

میرے دل میں ہمیشہ یہ بات رہی ہے کہ آپ نے رمی جمرات قبل صلوٰۃ ظہر کی یا بعد صلوٰۃ ظہر لیکن قوی بات یہ ہے کہ قبل صلوٰۃ ظہر کی، رمی سے فارغ ہو کر آپ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ کیونکہ حضرت جابرؓ وغیرہ نے یہی روایت کیا ہے کہ جب سورج زائل ہو جاتا تب آپ رمی فرمایا کرتے تھے۔ ابن ماجہ میں روایت ہے:-

اذا فرغ من رمیہ صلی الظہر جب رمی سے فارغ ہوتے تو ظہر پڑھتے۔

امام ترمذی نے فرمایا ہے یہ حدیث حسن ہے لیکن امام ترمذی کی سند میں حجاج بن ارطاۃ اور ابن ماجہ کی سند میں ابراہیم بن عثمان ہیں اور دونوں قابل اعتبار نہیں ہیں لیکن اس کے علاوہ کوئی حدیث نہیں ہے۔ امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ آپ نے یوم نحر میں تو سوار ہو کر رمی کی اور بقیہ دنوں میں پیدل رمی کی۔

حجۃ الوداع میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ وقفے ایسے ثابت ہیں جن میں آپ نے دعائیں کی ہیں ۱۔ صفا ۲۔ مروہ ۳۔ عرفات ۴۔ مزدلفہ ۵۔ جمرۂ اولیٰ ۶۔ جمرۂ ثانیہ، ان مقامات پر آپ سے دعا کرنا ثابت ہے۔

خطباتِ منیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں دو خطبے دیئے۔ ایک تو گذر چکا ہے، اور ایک خطبہ ایام تشریق کے درمیان میں دیا تھا۔ سراء بنت نبہانؓ کی حدیث ہے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپ نے فرمایا

جانتے ہو یہ کون سا دن ہے؟ عرض کیا اللہ اور اس کا رسول بہتر

---

[1] دعا کے متعلق ہمارا تفصیلی کلام حصہ اول میں گذر چکا ہے۔

جانتا ہے۔ فرمایا یہ ایام تشریق کا وسط ہے۔ پھر فرمایا جانتے ہو یہ کون سا شہر ہے؟ عرض کیا، اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتا ہے؟ فرمایا یہ شعر حرام ہے۔ اس کے بعد فرمایا، میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد آپ لوگوں سے شاید ملاقات نہ کرسکوں، پھر فرمایا تمہارے مال، تمہاری جانیں تمہاری عزت، ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں جیسے یہ شہر، اور یہ دن تمہارے لئے حرام ہے۔ مرنے پر اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا تم میں جو یہاں ہیں وہ غائبین کو تبلیغ کریں راویہ کہتی ہیں کہ اس کے کچھ بعد مدینہ منورہ پہونچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا

اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے" حدیث میں یوم الرؤس" سے مراد یوم نحر کا دوسرا دن ہے اور اسی پر سب کا اتفاق ہے بیہقی نے ابن عمرؓ کی حدیث روایت کی ہے اس میں ہے کہ سورۂ اذا جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایام تشریق کے وسط میں نازل ہوئی اسی سے آپ کا دنیا سے رخصت ہونا معلوم ہوا

متعلقات منیٰ

حضرت عباسؓ بن مطلب نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی تھی کہ وہ رات کو مکہ معظمہ رہیں، کیونکہ چاہ زمزم کا اہتمام ان کے پاس تھا۔ آپ نے ان کو اجازت دیدی تھی کہ وہ یوم نحر کو رمی کرلینے کے بعد باقی دونوں دنوں کی رمی ایک دن جمع کرکے کرلیں۔ امام مالکؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ حکم پہلے فرمایا تھا اور ابن عیینہ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں چرواہوں کے لئے اجازت ہے کہ وہ ایک دن چھوڑ کر رمی کریں۔ ان کے لئے اجازت تھی کہ دو دن کی رمی ایک دن میں کرلیں۔ لہٰذا جب اس سے رخصت ثابت ہوئی تو یہ مسئلہ ہے کہ جن لوگوں کو اپنے مال کا اندیشہ ہو یا مریض ہو تو ان کے لئے اجازت ہے کہ وہ منیٰ میں شب باشی نہ کریں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام تشریق کے بقیہ دو دنوں میں رمی کرنے میں جلدی نہیں کی تھی بلکہ آپ نے تاخیر فرمائی تھی حتی کہ آپ نے تینوں دن رمی مکمل کی تیسرے دن ظہر کی نماز کے بعد روانہ ہوئے۔ اور محصب تشریف لائے۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ حضرت ابو رافعؓ نے آپ کے لئے ڈیرہ بنا رکھا ہے۔ آپ نے ان کو امر نہیں فرمایا تھا۔ آپ نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء یہاں پڑھی۔ اور کچھ آرام فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے مکہ معظمہ کی طرف کوچ فرمایا، اور طواف رخصت رات میں ادا کیا، اور اس طواف میں آپ نے رمل نہیں کیا۔

قیامِ مُحَصَّب اسی جگہ حضرت صفیہؓ نے خبر دی تھی کہ وہ حائضہ ہوگئی ہیں۔ وہ طواف افاضہ کر چکی تھیں۔ اسی شب میں حضرت عائشہؓ نے عمرہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی تیرے حج اور عمرے کے لئے کافی ہے، لیکن جب انھوں نے اصرار کیا تو آپ نے ان کے بھائی کو امر فرما دیا کہ وہ عمرہ کرا دیں جب وہ فارغ ہو کر آگئیں تو آپ نے کوچ کرنے کا حکم فرمایا اور آپ نے صبح کی نماز سے قبل بیت اللہ کا طواف کیا تھا، اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت اسود کی بخاری میں حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت آکر ملی جب وہ مکہ کی طرف جا رہے تھے یا میں جا رہی تھی اور وہ آرہے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ راستہ میں ملاقات ہوئی اور پہلی حدیث سے محصب میں منتظر رہنا ثابت ہو رہا ہے۔

علاوہ ازیں اس میں ایک اشکال اور ہے وہ یہ ہے کہ جانے سے مراد مدینہ منورہ کی طرف بھی جانا ہو سکتا ہے، اس سے بھی انتظار کرنا ثابت نہیں ہوتا ہے، بہرحال ابو محمد کا استدلال درست نہیں معلوم ہوتا ہے اور قاسم کی حدیث میں صراحت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظار فرمایا۔ جب وہ آگئیں تب لوگوں کو سفر کا حکم دیا اور حدیث اسود کے لئے بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہو رہی ہے۔

ان دونوں حدیثوں کو بعض حضرات نے جمع بھی کیا ہے اس کی صورت یہ بتلائی ہے کہ آپ نے طواف رخصت دو مرتبہ کر لیا ہوگا، اسی وجہ سے تو آتے جاتے ملاقات ہوئی" اور یہ کھلا ہوا وہم ہے اس سے اشکال دور ہونا تو کجا بلکہ زیادہ ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ ممکن ہے کہ آپ عقبہ کی جانب سے تشریف لے آئے ہوں اور وہاں کو آتے جاتے ملاقات کی ہو اور وہیں آپ نے انتظار کیا ہو اور یہ بات پہلی سے بھی زیادہ بری ہے کیونکہ آپ عقبہ سے خارج نہیں ہوئے تھے بلکہ آپ مکّہ سے خارج ہوئے تھے اور وہ اسفل مکہ ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے تاہم اس کو تسلیم کر لینے سے دونوں حدیث جمع نہیں ہو سکتیں۔ ابو محمد ابن حزم نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ آپ محصب سے جانے کے بعد پھر آ گئے ہوں، لیکن یہ ابن حزم کا وہم ہے بلکہ آپ نے فوراً ہی مدینہ منورہ کی طرف کو کوچ فرما دیا تھا۔ ابن حزم نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے تو آپ کے داخل ہونے کی جگہ ذی طویٰ ہے اور مکہ سے نکلنے کی جگہ محصب ہے اس طرح آپ نے پورے مکہ کا دائرہ کی شکل میں حصار کر دیا تھا، اور یہ ابن حزم کا ہذیان ہے لوگ ان کی یہ بات سنکر ہنس دینگے۔ کیونکہ اس طرح سے کوئی دائرہ نہیں بنتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ:۔

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی نماز محصب میں پڑھی، اور کچھ آرام فرمایا، اور پھر سوار ہو کر بیت اللہ تشریف لائے اور طواف کیا

اور صحیحین میں حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث ہے[1]۔ یہ حدیث سب سے زیادہ صحیح ہے، اس میں

---

[1] یہ حدیث وہی ہے جس میں حضرت عائشہ رضؓ کے عمرہ کرنے کا ذکر ہے تکرار کی وجہ سے ہم نے اعادہ نہیں کیا۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ابن حزم کی کمزور قسم کی تاویلات کو، کوئی گنجائش مل سکے اور حدیث اسود کا بھی ضعیف ہونا ثابت ہوتا ہے اسلاف کا محصب میں قیام کرنے کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ سنت ہے یا نہیں ؟ ایک جماعت نے کہا ہے کہ وہ حج کی سنتوں میں سے ایک ہے۔ اس لیئے کہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رض کی روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے :-

نحن نازلون غدًا انشاء اللہ بخیف بنی کنانۃ حیث تقساموا علی الکفر۔

ہم انشاء اللہ کل خیف بنی کنانہ میں اتریں گے جہاں انھوں نے کفر پر قائم رہنے کی قسم کھائی تھی۔

خیف بنی کنانہ سے مراد محصب ہے، یہاں بنی کنانہ نے بنی عبد المطلب کے ساتھ ترک موالات کا عہد کیا تھا، لہذا اس جگہ قیام فرما کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعار اسلام کو ظاہر فرمایا، جہاں انھوں نے شعائر کفر کو ظاہر کیا تھا، یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھا کہ جہاں شعار کفر کا اظہار کیا گیا ہو وہاں آپ شعار اسلام اور توحید ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ ایسے ہی آپ نے طائف میں لات اور عزیٰ کی جگہ مسجد تعمیر کرائی تھی صحیح مسلم میں حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض یہاں نزول فرمایا کرتے تھے ان کے نزدیک یہ سنت ہے۔ اور امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رض یہاں ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔

ایک جماعت جس میں (حضرت ابن عباس رض، حضرت عائشہ رض ہیں) اس طرف گئی ہے کہ محصب میں اترنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ یہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض اس وجہ سے اُترے تھے تاکہ لوگوں کو آپ کے خروج کے بارے میں معلوم ہو جائے مسلم نے ابورافع کی حدیث روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محصب میں اترنے کا امر نہیں فرمایا، لیکن اس کے باوجود میں نے وہاں

ڈیرہ گاڑ دیا تھا، اور اس میں آپ نے قیام فرمایا لیکن اس حدیث سے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تائید ہو رہی ہے جس میں مذکور ہے نحن نازلون الخ

بیت اللہ میں داخل ہونا اس بارے میں تین مسلک ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حج میں، بیت اللہ میں داخل ہوئے؟ یا نہیں؟ کیا آپ نے طواف وداع کے بعد ملتزم کے قریب وقوف فرمایا یا نہیں؟ ... کیا آپ نے رخصت ہونے کے وقت صبح کی نماز مکہ میں پڑھی یا نہیں؟

بہت سے فقہاء نے بیت اللہ میں داخل ہونے کا اعتراف کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ سنت ہے۔ جن احادیث سے بیت اللہ میں داخل ہونا مسنون معلوم ہوتا ہے وہ حج اور عمرہ کے بارے میں نہیں ہیں بلکہ فتح مکہ کے بارے میں ہیں، چنانچہ صحیحین میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ میں داخل ہوئے۔ اس میں ہے کہ آپ نے عثمان بن طلحہ سے چابی طلب فرمائی، اور دروازہ کھول کر آپ اور حضرت اسامہ رض، حضرت بلال رض، حضرت عثمان بن طلحہ رض داخل ہوئے، اور دروازہ بند کر دیا گیا، پھر کھولا گیا، جب دروازہ کھلا تو لوگ دوڑے۔ میں نے حضرت بلال سے دریافت کیا کہ حضور کہاں ہیں؟ جواب دیا، دونوں ستونوں کے درمیان ہیں، مجھے یہ پوچھنا یاد نہ رہا کہ آپ نے کتنی رکعات پڑھیں

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رض کی روایت ہے اس میں ہے کہ جب آپ مکہ میں آئے تو آپ نے بیت اللہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس میں بُت رکھے ہوئے تھے۔ پہلے ان کو نکالا گیا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی تمثال نکالی گئی۔ اور ان کے ہاتھ میں تیر تھے۔ حضور ؐ نے فرمایا خدا ان کافروں کو ہلاک کرے ان کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات تیروں سے بانٹا کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور تکبیر کہی اور نماز نہیں پڑھی۔

کہا گیا ہے ممکن ہے کہ حضور دو مرتبہ داخل ہوئے ہوں۔ ایک دفعہ نماز پڑھی ہو اور ایک دفعہ نماز نہ پڑھی ہو۔

جو غیر معتبر اور ضعیف قسم کے اہل تنقید ہیں ایسے مواقع پر وہ آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ دوسرا واقعہ ہے جیساکہ انھوں نے لیلۃ الاسریٰ کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ چند مرتبہ ہوئی ہے ایسے ہی انھوں نے بیع و شراء کے معاملہ میں حضرت جابرؓ کے اونٹ کے بارے میں کہہ دیا ہے کہ ممکن ہے آپ نے اس کو چند مرتبہ خریدا ہو۔ اسی طرح طواف رخصت کو دو مرتبہ کہہ دیا۔ لیکن صاحب فن حضرات اس قسم کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں امام بخاری اور دوسرے ائمہ نے کہا ہے اس بارے میں حضرت بلالؓ کا قول معتبر ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا معتبر نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ آپ فتح کے موقعہ پر داخل ہوئے حج یا عمرہ کے موقعہ پر داخل نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی روایت ہے۔ ان سے پوچھا گیا۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی عمرہ میں بیت اللہ میں داخل ہوئے فرمایا نہیں اور حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا:

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے نہایت بشاش تشریف لے گئے لیکن جب واپس ہوئے تو رنجیدہ تھے۔ میں نے دریافت کیا تو فرمایا، میں بیت اللہ میں داخل ہوا اور کاش میں داخل نہ ہوتا کیونکہ اس سے میرے بعد میری اُمت مشقت میں مبتلا ہوگی۔

اس میں اگر بغور سوچا جائے تو یہ واقعہ فتح کا واقعہ ظاہر ہوگا۔ اور حضرت عائشہ رضؓ نے جب آپ سے بیت اللہ میں نماز پڑھنے کے لئے اجازت چاہی تو آپ نے حطیم میں نماز پڑھنے کی اجازت دی تھی۔

ملتزم میں وقوف

دوسرا مسئلہ وقوف ملتزم کا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے موقعہ پر یہاں وقوف فرمایا۔ سنن ابوداؤد میں

ہے جب حضور صلعم نے مکہ فتح کیا تو میں نے آپ کو کعبہ سے نکلتے دیکھا، اور آپ نے دروازے کے پاس کے رکن کا استلام کیا اور اپنے رخسار کو بیت اللہ پر رکھا۔ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب کی حدیث روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

میں نے حضرت عبداللہ کے ساتھ طواف کیا۔ جب وہ کعبہ کی پشت کی طرف پہونچے تو میں نے کہا، تعوذ فرمائیے۔ انھوں نے اعوذ باللہ من النار کہا۔ پھر حجر اسود کو بوسہ دیا، اور دروازہ اور رکن کے درمیان ٹھہرے اور پیشانی اور سر اور بازوؤں کو اس پر اس طرح رکھا اور فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔

اس میں احتمال ہے کہ ایسا وقتِ رخصت کیا ہو یا کسی دوسرے وقت ایسا کیا ہو۔ امام شافعیؒ اور مجاہدؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مستحب ہے۔

روحا میں تشریف آوری

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف کوچ فرمایا۔ جب روحا میں پہونچے تو ایک سوار سے ملاقات کی۔ آپ نے دریافت کیا کس قوم سے ہو؟ عرض کیا، مسلمان ہوں۔ اس وقت ایک عورت جو اپنے بچے کو لئے ہوئے تھی اس کو اوپر اٹھا کر پوچھا حضورؐ کیا اس کا بھی حج ہے؟ فرمایا ہاں۔ اور تیرے لئے اس کا ثواب ہے۔ یہاں سے چل کر آپ نے ایک رات ذوالحلیفہ میں شب باشی فرمائی۔ پھر آگے چلے جب مدینہ منورہ پر نظر پڑی تو آپ نے تکبیر کہی اور فرمایا "لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیئ قدیر۔ آئبون، تائبون عابدون، ساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ"

آپ مدینہ منورہ میں دن میں معرس کے راستہ سے نکلے تھے۔ واللہ اعلم۔

بعض اغلاط

ابن حزم کو حجۃ الوداع کے بارے میں وہم ہو گیا ہے۔

(۱) اس نے کہا ہے کہ باوجودیکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے پھر نہیں کیا۔ یہ ابن حزم کا وہم ہے اس لئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مدینہ منورہ لوٹنے کے بعد ارشاد فرمایا تھا۔ آپ نے ام سنان انصاریہ سے دریافت کیا۔ تو ہمارے ساتھ حج کو کیوں نہیں گئی؟ اس نے کہا ہمارے پاس پانی ڈھونے والے صرف دو اونٹ تھے۔ ایک اونٹ میرے شوہر حج کے لئے لے گئے تھے اور ایک اونٹ چھوڑ گئے تھے تب آپ نے ارشاد فرمایا جب رمضان آئے تو عمرہ کر لینا رمضان شریف میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہوتا ہے اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

ایسے ہی آپ نے ام معقل سے مدینہ منورہ لوٹنے کے بعد ارشاد فرمایا تھا، اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ام معقل کہتی ہیں کہ جب حضور ؐ نے حجۃ الوداع کیا، تو ہمارے پاس ایک اونٹ تھا اسی کو میرے شوہر نے اللہ کے راستہ میں دیدیا تھا۔ اور ان ہی دنوں میں کچھ تکلیف بھی ہو گئی تھی جس میں ابو معقل کا انتقال ہو گیا تھا۔ جب حضور ؐ حج سے واپس ہوئے تو ارشاد فرمایا، میں نے عرض کر دیا یہ عذر تھا؟ آپ نے ارشاد فرمایا، رمضان شریف میں عمرہ کر لینا، وہ بھی حج کے برابر ہے۔

(۲)۔ ابن حزم کو ایک وہم یہ ہوا کہ اس نے کہا کہ حضور صلعم نے جمعرات کے دن ۲۴ ذی قعدہ کو سفر شروع کیا۔ اس کے بارے میں تفصیل آچکی ہے۔

۳۔ علامہ طبری کا وہم یہ ہے کہ اس نے ذکر کیا ہے کہ آپ حجۃ الوداع میں جمعہ کے دن نکلے اور نماز پڑھنے کے بعد نکلے۔ اس وہم کے بارے میں بھی تفصیل گذر چکی ہے۔ اور یہ بات بلاشک وریب ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز مدینہ منورہ میں پڑھی تھی۔ طبری نے ایک تیسرا قول واقدی کا نقل کیا ہے کہ وہ دن ہفتہ کا تھا۔ اسی قول کو ہم نے ترجیح دی ہے لیکن واقدی کو وہم ہو گیا ہے اور واقدی نے تین جگہ غلطی کی ہے۔ ایک یہ کہ اس نے کہا ہے، آپ نے

ظہر کی نماز ذی الحلیفہ میں پڑھی، دوسرا وہم یہ کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھ کر احرام باندھا تیسرا وہم یہ ہے کہ آپ نے ہفتہ کے دن ذی الحلیفہ میں توقف فرمایا۔

(۴) ایک وہم قاضی عیاض کو بھی ہوا ہے وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے خوشبو لگائی اور پھر اس کو دھویا، یہ وہم ان کو مسلم کی اس حدیث سے ہوا ہے جس کو حضرت عائشہ رضؓ نے روایت کیا ہے۔ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشبو لگائی اور اس کے بعد اپنی ازواج کے پاس تشریف لے گئے پھر غسل کیا اور پھر صبح کو احرام باندھا۔ اس وہم کا رد حضرت عائشہ رضؓ کے دوسرے قول سے ہو رہا ہے۔ "میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو خوشبو لگائی" اور یہ بھی حضرت عائشہ رضؓ کا قول ہے "گویا میں خوشبو کی سفیدی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگ میں دیکھ رہی ہوں۔ اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضورؐ کو احرام کے وقت جو بھی خوشبو ملتی لگا لیتے۔ یہ تمام روایات صحیح ہیں قاضی عیاض نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے اُس کو ابراہیم بن محمد نے روایت کیا ہے اور اس سے بھی قاضی صاحب کے وہم کی تائید نہیں ہو رہی ہے۔

(۵) ابن حزم کو ایک وہم اور ہوا ہے وہ یہ کہ حضورؐ نے ظہر کی نماز سے پہلے احرام باندھا، اور یہ وہم بالکل ظاہر ہے، کیونکہ آپ نے ظہر کی نماز کے بعد احرام باندھا تھا پھر مقام بیدا، میں اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے تھے۔

(۶) بعض لوگوں کو یہ وہم بھی ہوا ہے کہ جو ہدی آپ ساتھ لے گئے تھے وہ نفلی تھیں اور اُس کی اصل یہ ہے کہ قارن پر ہدی نہیں بلکہ تمتع کرنے والے پر ہدی ہے اور اس قول کا باطل ہونا مذکور ہو چکا ہے۔

(۷) قاضی ابویعلی کو یہ وہم ہوا کہ انھوں نے کہہ دیا کہ آپ نے احرام باندھتے وقت کسی نسک کا ذکر نہیں کیا بلکہ احرام کو مطلق رکھا یہی صاحب مغنی نے فرمایا ہے بعض نے کہا ہے کہ حج مفرد کا ذکر کیا تھا بعض نے کہا ہے کہ عمرہ کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بارے

میں مستند بیان گذر چکا ہے۔

(۸) احمد بن عبداللہ طبری کو یہ بھی وہم ہوا کہ جب حضور صلعم راستہ میں تھے تو ابو قتادہ نے حمار وحشی کا شکار کیا تھا اور وہ محرم نہیں تھے اس لئے اس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا۔ حالانکہ یہ واقعہ عمرہ حدیبیہ کا ہے جیسا کہ بخاری نے روایت کیا ہے۔

(۹) ایک وہم طبری نے اور بیان کیا ہے وہ یہ کہ آپ منگل کے دن مکہ میں داخل ہوئے حالانکہ اتوار کے دن داخل ہوئے تھے۔

(۱۰) قاضی عیاض نے ایک وہم اور بیان کیا ہے کہ حضور صلعم طواف اور سعی سے فارغ ہو کر حلال ہو گئے تھے اور اس کو بھی ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

(۱۱) ایک وہم حضرت معاویہ رضؓ کو ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ پر بال کٹوائے تھے۔ اور یہ واقعہ انھوں نے حج کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۱۲) بعض کو یہ وہم ہوا کہ حضورؐ نے رکن یمانی کو بوسہ دیا۔ حالانکہ آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا تھا غلطی سے اس کا نام رکن یمانی رکھ دیا۔

(۱۳) ابن حزم کو ایک بہت بڑا وہم یہ ہوا کہ اس نے یہ کہہ دیا کہ حضور صلعم نے سعی کے تین چکروں میں رمل کیا اور چار میں اپنی ہیئت میں چلے

(۱۴) بعض کو یہ وہم ہوا کہ آپ نے صفا و مروہ کے چودہ چکر لگائے۔

(۱۵) بعض کو یہ وہم ہوا کہ یوم نحر میں آپ نے صبح کی نماز وقت سے پہلے پڑھ لی تھی اور اس کی وجہ حضرت ابن مسعود رضؓ کی حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ آپ نے صبح کی نماز اس کے وقت سے پہلے پڑھی، حالانکہ مراد یہ ہے کہ جس وقت صبح کی نماز پڑھنے کی عادت شریفہ تھی اُس سے قبل پڑھی۔ اور اس حدیث کی یہ تاویل بھی ضروری ہے بلکہ ایک حدیث انھیں کی بخاری شریف میں موجود ہے وہ یہ کہ:۔

دو نمازوں کو وقت سے ہٹا کر پڑھا۔ ایک مغرب کی نماز اور یہ
مزدلفہ میں پڑھی اور ایک صبح کی نماز جیسے ہی فجر ہوئی۔

حدیث جابرؓ میں یہ ہے کہ "جیسے ہی صبح ہوئی آپ نے صبح کی نماز پڑھی۔

(۱۶) ایک وہم یہ بھی ہوا ہے کہ آپ نے ظہر اور عصر عرفات میں اور مغرب اور عشاء مزدلفہ میں دو اذان اور دو اقامت سے پڑھیں اور بعض کو یہ وہم ہوا کہ بلا اذان کے اور دو اقامت سے پڑھیں۔ صحیح یہ ہے کہ آپ نے ان نمازوں کو ایک اذان سے ہر ایک کے ساتھ اقامت سے نماز پڑھی۔

(۱۷) بعض کو یہ وہم ہوا کہ آپ نے عرفات میں دو خطبے دیئے، اور درمیان میں دونوں خطبوں کے بیٹھے پھر مؤذن نے اذان دی تو دوسرا خطبہ شروع کیا اور اس سے فارغ ہو کر اقامت کہی گئی۔ یہ چیز کسی حدیث میں موجود نہیں ہے۔ حدیث جابر رضؓ میں صراحت ہے کہ جب آپ دونوں خطبے پورے کر چکے تو حضرت بلالؓ نے اذان دی اور اقامت کہی۔ اس کے بعد آپ نے ظہر کی نماز ادا فرمائی۔

(۱۸) ایک وہم ابو ثور کو ہوا ہے، وہ یہ کہ جب آپ اونٹنی پر چڑھے تو مؤذن نے اذان دی اور پھر آپ نے خطبہ دیا، وہم ظاہر ہے کیونکہ اذان بعد خطبہ کے دی گئی تھی۔

(۱۹)۔ بعض کو یہ وہم ہوا کہ حضرت ام سلمہ، لیلۃ النحر میں آئیں اور آپ نے ان کو امر فرمایا تھا کہ وہ صبح کی نماز مکہ میں پڑھیں۔ اس کے بارے میں گذر چکا ہے۔

(۲۰) بعض کو یہ وہم ہوا کہ آپ نے طواف زیارت یوم نحر میں رات تک مؤخر کیا اس کے بارے میں گذر چکا ہے جس طواف کو آپ نے رات میں ادا کیا تھا وہ طواف رخصت تھا

(۲۱) بعض کو یہ وہم ہوا کہ آپ نے دو مرتبہ افاضہ کیا۔ ایک مرتبہ دن میں اور ایک مرتبہ رات کو اپنی ازواج کے ہمراہ۔ اس وہم کی وجہ عمرو بن قیس کی روایت ہے جو گذر چکی ہے، اس وہم کو نہایت کمزور اہل علم نے اختیار کیا ہے۔

(۲۲) بعض کو یہ وہم ہوا ہے کہ آپ نے طواف قدوم یوم نحر میں کیا اور پھر طوافِ زیارت کیا۔

(۲۳) بعض کو یہ وہم ہوا کہ آپ نے اس دن طواف زیارت کے ساتھ سعی بھی کی تھی۔ اس کی بنا پر ان حضرات نے کہا ہے کہ قارن کے ذمہ دو سعی ہیں اور اس کا باطل ہونا گذر چکا ہے۔

(۲۴) بعض کو یہ وہم ہوا کہ آپ نے یوم نحر میں ظہر کی نماز مکہ میں ادا کی۔ صحیح یہ ہے کہ آپ نے منیٰ میں ادا کی جیسا کہ گذر چکا ہے۔

(۲۵) بعض کو یہ وہم ہوا ہے کہ وادی محسّر میں تیزی کے ساتھ نہیں چلے تھے۔ بلکہ وہ بعض اعراب کا فعل ہے بلکہ حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ ارشاد فرمایا۔

یاایھا الناس علیکم السکینۃ۔ لوگو! سکون سے چلو۔

اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا انکار طاؤس اور شعبی نے کیا ہے شعبی نے کہا ہے مجھ سے ام سلمہ نے بیان کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات سے اس طرح کوچ فرمایا کہ آپ کی سواری کا پیر بھی نہیں اٹھ رہا تھا۔ اسی طرح آپؐ مزدلفہ تشریف لائے اور فضل بن عباسؓ نے روایت کیا ہے کہ میں مزدلفہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ردیف تھا۔ آپ کی سواری کا پیر تک نہیں اٹھ رہا تھا۔ عطا نے کہا ہے کہ جن حضرات نے تیز چلنا روایت کیا ہے۔ ان کی مراد غبار اڑنا ہے کیونکہ اعرابی اور دیہاتیوں کے چلنے کی وجہ سے غبار اڑنے لگا تھا اور یہ لوگ چلنے میں محتاط نہیں ہوتے ہیں، اس وجہ سے یہ اشتباہ پیدا ہوا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اس وادی میں ٹھہرنا بدعت ہے۔ حضور صلعم یہاں ہرگز نہیں ٹھہرتے تھے۔

(۲۶) طاؤس کو وہم ہوا کہ حضور صلعم قیامِ منیٰ میں ہر رات مکہ تشریف لے جاتے

تھے۔ چنانچہ بخاری نے ابوحسان کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث روایت کی ہے :۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یزور البیت ایام منیٰ ۔	حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیام منیٰ میں بیت اللہ کی زیارت کیا کرتے تھے ۔

اور ابن عرعرۃ نے روایت کیا ہے کہ معاذ بن ہشام نے ہمارے پاس ایک کتاب بھیجی، اس میں تحریر تھا " حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات بیت اللہ کی زیارت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے، لیکن میں نے اس کی موافقت میں کسی کی رائے نہیں پائی۔ ثوری نے ابن طاؤس کے واسطے مرسلاً روایت کیا ہے اور یہ بھی وہم ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طواف افاضہ کرنے کے بعد پھر مکہ معظمہ تشریف نہیں لائے۔ اور منیٰ سے اسی وقت واپس ہوئے جب رخصت ہونے کا وقت آیا تھا۔

(۲۷) بعض کو یہ وہم ہوا کہ آپ نے طواف رخصت دو مرتبہ کیا ہے اور مکہ معظمہ کا دائرہ کیا ہے، کیونکہ آپ نے ذی طوی قیام فرمایا اور مکہ میں اوپر کی جانب سے داخل ہوئے اور واپس تشریف لاتے وقت محصب میں قیام فرمایا، اور نیچے کی جانب سے تشریف لائے اس طرح دائرہ ہوگیا۔

(۲۸) بعض کو یہ وہم ہوا کہ آپ عقبہ کی پشت کی طرف سے ہوکر محصب سے سفر شروع کیا۔ بہرحال یہ اوہام ہیں، ان کا مفصل اور مجمل ہم نے ذکر کردیا ہے وباللہ التوفیق ۔

حاشیہ

حج اور عمرہ پر

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد ایک حج کیا اور چار عمرے کئے عمروں کے بارے میں زیادہ الجھاؤ نہیں ہے۔ صرف تعداد اور وقت میں اختلاف ہے۔ لیکن حج کے بارے میں بہت زیادہ الجھاؤ ہے کہ آپ نے کیسا حج کیا اور مناسک حج کس طرح ادا کئے۔ آپ کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں حضرات صحابہؓ، عورتیں بوڑھے، بچے، سوار، پیدل موجود تھے۔ بہت سے وہ تھے جنھوں نے آپ کو قریب سے مناسک ادا کرتے دیکھا، اور بہت سے وہ تھے کہ جنھوں نے بالواسطہ سُنا، اس وجہ سے مناسک کی ادائگی کے سلسلہ میں کافی اختلاف ہوگیا، جیساکہ ازدحام کثیر کی وجہ سے صلوٰۃ کسوف شمس کے بارے میں اختلاف ہوگیا کہ آپ نے ایک رکوع کیا تھا یا دو رکوع کئے تھے؟ ایسے الجھاؤ کی صورت میں صاحب بصیرت عالم کا یہی کمال ہے کہ احادیث اور آثار کے بحر ذخار میں غوطہ لگاکر آبدار موتی نکال لائے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جو لوگ طویل نگار ہیں اور کسی بحث کو بہت پھیلاکر مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں، شاید ان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے، ہمارے زمانہ میں بھی بہت سے مصنف اور مقرر ایسے ہیں کہ صفحات کو رنگین کردیتے ہیں، اور پورے وقت کو گھیر لیتے ہیں لیکن مقصد بیان کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ یہ کسی مصنف یا مقرر کے لئے اچھی علامت نہیں ہے اور نہ اس سے استفادہ ممکن ہے اگرچہ وہ اپنے پھیلاؤ کی وجہ سے اپنے نزدیک سمندر اور پہاڑ جیسے ہوں، مگر اہل نظر ان کو جانتے ہیں۔ علامہ ابن قیم کی جلالت قدر مسلّم، ان کی

عظمتوں کے سامنے ہمارا سر تسلیم خم ہے کہ انھوں نے سیرت کے ذرہ ذرہ برابر گوشوں کو اُجاگر کیا، اور حج اور عمرے کی بحث کو اتنا پھیلا دیا کہ میں ہی نہیں بلکہ ہر مطالعہ کرنے والا اُکتائے گا یا اکتایا ہوگا، علامہ ابن قیم پر حافظ ذہبی نے تنقید کی ہے۔

لکنہ معجب برأیہ وسئی العقل   وہ خود پسند اور سوئے فہم ہیں۔

لیکن یہ ان کا مقام ہے۔ نہ ہمارا علم اس قابل، اور نہ ہمارے قلم میں اتنی جان کہ علامہ کا تعاقب کر سکے۔ حج و عمرہ کے متعلق، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث نے بھی عربی زبان میں ایک رسالہ ترتیب دیا ہے جو علامہ ابن قیم کی زاد المعاد کی بعض فصول کی شرح ہے۔ ہم اس کی بھی توصیف کرتے ہیں۔ اس جگہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ حج و عمرہ کے سلسلہ میں حنفی مسلک کو اس جگہ حضرت شیخ الحدیث زید مجدہ کے رسالہ اور بعض دوسری کتابوں کی امداد سے پیش کیا جا رہا ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج مبارک

جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حج کی فرضیت نازل ہوئی۔[1] تو آپ نے لوگوں کو اس کی اطلاع دی تو حوالی مدینہ کے لوگوں نے آپ کے ساتھ چلنے کا عزم کر لیا اور سامان سفر کرنے لگے۔ آپ کے ساتھ آپ کی تمام ازواج مطہرات تھیں۔ جن جن لوگوں کو معلوم ہوتا جاتا تھا، وہ راستہ میں آکر شریک سفر ہوتے تھے، جن کی شمار مشکل ہے۔ آپ کے آگے پیچھے غرضکہ چہار جانب جہاں تک نظر جاتی لوگوں کا ہجوم تھا۔

آپ مدینہ منورہ سے ۲۵ ذیقعدہ کو ہفتہ کے دن ظہر کی نماز

---

[1] صحیح روایت یہ ہے کہ آپ نے دو حج ہجرت سے قبل اور ایک حج بعد ہجرت کے ۱۰ھ میں کیا۔ بعض روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے ہر سال میں حج کرتے تھے۔

پڑھ کر سوار ہوئے[1]۔ اور مدینہ میں آپ نے ظہر کی چار رکعات ادا فرمائیں اور خطبہ دیا اور سر میں تیل لگایا۔ کنگھی کی اور چادر اوڑھی اور کوچ فرمادیا وادی عقیق[2] میں آپ کے پاس فرشتہ آیا، اور عصر کی نماز آپ نے ذوالحلیفہ[3] میں دو رکعت ادا فرمائی۔ اور آپ رات کو اپنی تمام ازواج کے پاس تشریف لے گئے۔ اور پھر آپ نے احرام کے لئے جنابت کے غسل کے علاوہ غسل کیا[4]۔ اور حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے خوشبو لگائی۔ آپ نے تہبند باندھا اور چادر اوڑھی، اور ذی الحلیفہ ہی میں آپ نے اگلے دن ظہر کی دو رکعت ادا فرمائیں اور نماز کے بعد مصلی ہی پر حج اور عمرہ کا احرام باندھا[5]۔ اور احرام سے پہلے آپ نے اونٹ کے قلادہ ڈالا[6] اور کوہان میں چیو لگایا۔ اور آپ نے قران کا احرام باندھا تھا۔ بہرحال یہاں سے سوار ہو کر آپ بیداء تشریف لائے۔ کبھی آپ تلبیہ میں حج و عمرہ کا نام لیتے۔ اور کبھی تنہا حج کا نام لیتے تھے۔ آپ نے یہ سفر اونٹ کی سواری پر کجاوہ پر کیا: تاکہ تمام لوگ آپ کو بہ آسانی دیکھ سکیں، اور مناسک حج سیکھ سکیں، آپ نے احرام کے بارے میں لوگوں کو اختیار دیدیا تھا کہ جیسا چاہے احرام باندھیں۔ یعنی قران کا یا تمتع کا یا حج مفرد کا، یہاں بھی حضرت جبرئیل تشریف

---

[1] ۔ صحیح روایت یہی ہے ورنہ علامہ ابن حزم نے جمعہ کا دن تحریر فرمایا ہے جس پر ابن قیم نے سخت تنقید کی ہے [2] یہ مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے عقیق اس وادی کو کہتے ہیں کہ پانی نے زمین کو پھاڑ کر اپنا راستہ بنایا ہو وادی عقیق دو ہیں۔ ایک۔ اصغر اور دوسرے اکبر۔ [3] موجودہ مسافت کے اعتبار سے مدینہ منورہ سے ۹ کیلومیٹر ہے، اس کو آبار علی بھی کہا جاتا ہے [4] احرام کے لئے غسل کرنا، حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ کے نزدیک مسنون ہے۔ اہل ظاہر واجب قرار دیتے ہیں [5] میقات سے احرام باندھنا واجب ہے۔ بلا احرام کے گذرنا جائز نہیں ہے اور میقات سے پہلے احرام باندھنا افضل ہے [6] جانور کے قلادہ باندھنا مسنون ہے [7] امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک چیرہ لگانا مکروہ ہے صاحبین مسنون کہتے ہیں [8] قران، حج اور عمرہ کا احرام ایک ساتھ باندھنا، یہ افضل ہے۔ قران میں دو طواف اور دو سعی کی جاتی ہیں۔ لیکن علامہ نے نہایت زور لگا کر ثابت کیا ہے کہ ایک سعی اور ایک طواف کافی ہے۔ لو ایات، اس بارے میں مختلف ہیں (باقی ۲۷۴ پر)

لائے اور فرمایا کہ لوگ تلبیہ میں آواز بلند کریں۔ یہیں حضرت ابوبکر صدیق کی اہلیہ کے یہاں بچہ پیدا ہوا، جس کا نام محمد بن ابی بکر ہے

یہاں سے کوچ فرما کر آپ "ملل"[۱] تشریف لائے اور یہاں آپ نے اپنے پائے مبارک کی پشت پر پچھنے لگوائے[۲] اور جب آپ روحا پہونچے تو حمار وحشی کا شکار پیش کیا گیا، جس کے تقسیم کرنے کے لئے آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امر فرمایا تھا[۳]۔ جب آپ اثایہ[۴] پہونچے تو یہاں ہرنی کا شکار پیش ہوا، اور مقام لحی جمل[۵] میں آپ نے سر میں پچھنے لگوائے پھر مقام عرج میں پہونچے۔ تو یہاں آپ کے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک ہی سواری رہ گئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام نے ان کی سواری کو کھو دیا تھا۔ جب آپ ابواء[۶] وادی میں پہونچے تو صعب بن جثامہ نے حمار وحشی کے گوشت کی ران پیش کی آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ یہیں حضرت صفیہ کا اونٹ تھک گیا تھا آپ نے حضرت زینب کو امر فرمایا تھا کہ ان کو اونٹ دیدیں، یہیں انجشہؓ کا واقعہ پیش آیا تھا[۷]۔ جب آپ وادی عسفان[۸] میں پہونچے تو حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا تھا کہ یہ کون سی وادی ہے؟ یہیں آپ نے فرمایا تھا کہ یہاں حضرت ہود اور صالح احرام باندھ کر گذرے تھے۔ اسی جگہ سراقہ بن مالک

صفحہ ۲۷۳ کا باقی حاشیہ:۔ دونوں فریق کے پاس دلائل ہیں ۹ مدینہ منورہ اور مکہ کے درمیان ایک چھوٹی پہاڑی ہے۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا ۱ مدینہ منورہ سے دورات کا راستہ ہے۔ فاصلہ اٹھارہ میل ہے اس کا یہ نام اس وجہ سے ہے کہ پہاڑی سفر کی وجہ سے یہاں آکر آدمی تھک جاتا ہے ۲ محرم کو بلا بال منڈوائے پچھنے لگوانا جائز ہے، اور اگر ضرورت ہو تو بقدر ضرورت بال منڈوا کر بھی پچھنے لگوانا جائز ہے، جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگوائے تھے یہی امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے ۳ محرم کو شکار کا گوشت کھانا جائز ہے بشرطیکہ شکار حدود حرم کا نہ ہو۔ محرم نے نہ کیا ہو۔ یا محرم کے اشارے اور مرضی سے نہ کیا ہو ۴ اس کے پہلے (باقی صفحہ ۲۷۵ پر)

نے حج کے بارے میں سوال کیا تھا، جب آپ مقام سرف پہونچے تو حضرت عائشہؓ کو حیض آگیا تھا۔ حضرت عائشہؓ کے حیض آنے کی جگہ میں اتفاق ہے، لیکن پاک ہونے کی جگہ میں اختلاف ہے یہیں پر آپ نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ جس کے پاس ھدی کا جانور نہ ہو اور وہ عمرہ کرنا چاہے تو اسی احرام کو عمرہ کا احرام بنالے اور جس کے پاس ھدی کا جانور ہو وہ ایسا نہ کرے۔

چار ذی الحجہ کی شب کو آپ ذی طوی پہونچے اور یہیں آپ نے رات گذاری۔ اور صبح کی نماز پڑھی اور غسل کر کے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اور یہ دن کا وقت تھا، آپ مکہ معظمہ میں اوپر کی جانب سے داخل ہوئے۔ اور جب بیت اللہ پر آپ کی نظر مبارک پڑی تو آپ نے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا[1]۔ بہر حال آپ چاشت کے وقت مسجد حرام میں داخل ہوئے اور سیدھے بیت اللہ کے پاس پہونچے اور آپ نے یہاں تحیۃ المسجد نہیں پڑھی، کیونکہ یہاں کا تحیۃ المسجد طواف ہے۔ آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس طواف میں اول کے تین چکر میں رمل کیا، اور جب بھی آپ طواف میں حجر اسود کے سامنے آتے تو محجن کے اشارے سے اس کو چھوتے اور بوسہ دیتے

جب آپ طواف سے فارغ[2] ہوئے تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے اور یہاں آپ نے

صفحہ ۲۷۴ کا باقی حاشیہ:۔ اوثیہ آتا ہے، پھر اثایہ، پھر روحائیہ تینوں جگہ مدینہ منورہ سے ۵۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہیں [5] مقام لحی جمل، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے درمیان ہے [6] یہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ مدفون ہیں [7] جحفہ سے ۲۳ میل کے فاصلہ پر ہے [8] افسوس کہ حضرت انجشہ کا واقعہ حدی پڑھنے کا ابن قیم نے ذکر نہیں کیا حالانکہ بخاری نے اس کو روایت کیا ہے [9] وادی عسفان مکہ معظمہ سے ۳۶ میل کے فاصلہ پر مدینہ منورہ کے راستہ پر ہے

صفحہ ہذا کا حاشیہ:۔ [1] موجودہ زمانہ میں اس جگہ کا نام معابدہ ہے [2] یہ رفع یدین مستحب ہے (باقی ص۲۷۶ پر)

دو رکعت ادا کیں[1]، اس کے بعد آپ نے پھر حجر اسود کو بوسہ دیا اور پھر صفا پہاڑی پر تشریف لے گئے۔ اور یہاں دعا کی اور پھر مروہ پر تشریف لے گئے اور بیت اللہ کی طرف رُخ کرکے تکبیر و تہلیل کہی اور یہ ایک سعی ہوئی اور سعی پوری کرلینے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا "اگر میں ھدی نہ لایا ہوتا تو حلال ہو جاتا" اسی جگہ آپ نے سر منڈوانے والوں کے لئے تین مرتبہ دعا کی[2]، یہ بات غلط ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حلال ہو گئے تھے۔ اسی جگہ سراقہ بن مالک نے سوال کیا تھا "کیا یہ حکم ہمیشہ کے لیئے ہے"؟ حضرت عائشہ رضؓ کے علاوہ آپ کی تمام ازواج افعال عمرہ کرکے حلال ہو گئیں تھیں اور حضرت عائشہ رضؓ حلال نہیں ہوئی تھیں[3]۔ اسی موقع پر حضرت علی رضؓ یمن سے تشریف لائے تھے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی مشرقی جانب قیام فرمایا تھا اور یہاں چار دن مقیم رہے تھے اور نماز میں قصر کیا تھا۔ جمعرات کے دن چاشت کے وقت منیٰ کے لئے کوچ فرمایا اور یہاں رات گذاری، جب سورج نکل آیا تو عرفات تشریف لے گئے۔ یہ سفر آپ نے ضب کی پہاڑی کی طرف سے کیا، اور واپسی دوسرے راستہ سے ہوئی، عرفات

باقی حاشیہ صفحہ ۲۷۵ نمبر ۳[3] چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے اس لئے یہ طواف عمرہ کا تھا۔ یہ غلط ہے کہ آپ نے ایک ہی طواف کیا۔ قیام منیٰ کے درمیان آپ کا کوئی دن طواف سے خالی نہیں رہا۔ حجۃ الوداع صفحہ ۲۲

حاشیہ صفحہ ہذا: [1] امام ابو حنیفہ رحؒ کے نزدیک یہ دونوں رکعت واجب ہیں [2] اس سے پورے سر کے بال منڈوانے کی فضیلت ثابت ہے،

[3] ۔ اس جگہ علامہ نے فسخ الحج الی العمرہ کے جواز پر بہت دلائل پیش کئے ہیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ مفردہ تھیں، انھوں نے احرام حج فسخ نہیں کیا تھا۔ ص ۲۵

میں آپ کے لئے پہلے ہی سے ڈیرہ گاڑ دیا گیا تھا۔ اس میں آپ نے قیام فرمایا، جب سورج ڈھل گیا تو بطن وادی[۱] میں تشریف لائے اور ایک عظیم خطبہ دیا، خطبہ پورا کر چکے بعد آپ نے حضرت بلال کو امر فرمایا اور انھوں نے اذان دی۔ اس جگہ آپ نے ظہر اور عصر کی دو دو رکعت ادا کیں۔

علامہ ابن قیم نے اس جگہ بہت زور لگایا ہے کہ قصر کے لئے کوئی تحدید نہیں ہے کیونکہ یہاں مکہ والوں نے بھی قصر کیا، اور یہ بھی کہا ہے کہ یہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمام کا حکم نہیں دیا۔ حالانکہ حضرت عمران بن حصینؓ کی حدیث ابوداؤد طیالسیؒ نے روایت کی ہے[۲]

شہدت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنیناً والطائف فکان یصلی رکعتین ثم حججت معہ واعتمرت ثم قال یا اھل مکۃ اتموا صلوٰتکم فانا قوم سفر ثم حججت مع ابی بکر واعتمرت فصلی رکعتین ثم قال اتموا صلوٰتکم فانا قوم سفر	میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حنین اور طائف میں تھا، آپ نے دو رکعت ادا کیں، پھر میں نے آپ کے ساتھ حج اور عمرہ کیا آپ نے فرمایا تھا، اہل مکہ میں مسافر ہوں تم اپنی نماز پوری کرو، پھر میں نے حضرت ابوبکر رض کے ساتھ حج اور عمرہ کیا، تو انھوں نے بھی یہی فرمایا تھا۔

خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ موقف تشریف لائے اور قبلہ رُخ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت آپ سوار تھے۔ اسی جگہ نجد والے آکر شریک ہوتے تھے۔ اور اسی جگہ آپ نے اُمت کی مغفرت کے لئے دعا کی تھی۔ اسی جگہ ایک آدمی نے اپنی سواری سے

[۱] بطن وادی عرفات کے میدان سے ایک الگ جگہ ہے اُس کو ارض عرنہ بھی کہتے ہیں۔

[۲] حضرت امام مالک صاحبؒ کا ایک قول ہے کہ مکہ والے منیٰ میں قصر کریں گے اور منیٰ والے مکہ میں قصر کرینگے۔ اور قصر جو ہے نسک کی وجہ سے ہے نہ کہ سفر کی وجہ سے۔

گر جانے کی وجہ سے وفات پائی تھی۔ اسی جگہ آیت مبارکہ الیوم اکملت الخ نازل ہوئی تھی۔

جب سورج غروب ہوگیا تو آپ نے یہاں سے کوچ فرمایا اور مازمین[1] کے راستہ سے مزدلفہ تشریف لائے تھے، راستہ میں آپ نے پیشاب بھی فرمایا تھا۔ اسی جگہ حضرت اسامہؓ نے نماز کے لئے کہا تھا۔ لیکن آپ نے مزدلفہ میں آکر مغرب اور عشاء کی نماز عشاء کے وقت ادا کی تھی اور پھر استراحت فرمائی تھی یعنی آپ تہجد کی نماز کے لئے[2] نہیں اُٹھے آپ نے اپنے کمزور اور ضعیف متعلقین کو حکم دیدیا تھا کہ چاند غروب ہونے کے بعد طلوع فجر سے قبل منی پہونچ جائیں اور سورج نکلنے کے بعد رمی کریں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں غلس یعنی صبح صادق ہوتے ہی نماز فجر ادا فرمائی۔ ....

اس کے بعد آپ نے مزدلفہ سے منی کی طرف کو توجہ فرمایا، اس وقت فضل بن عباسؓ آپ کے ردیف تھے۔ اسی راستہ میں ایک عورت نے آپ سے اپنے والد کے حج کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا اپنے والد کی طرف سے حج ادا کرلینا، ایک آدمی نے اپنی ماں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

جب آپ بطن وادی محسّر میں پہونچے تو آپ نے اپنی اونٹنی کی رفتار تیز کردی تھی یہاں تک کہ آپ جمرہ عقبہ کے پاس آئے اور رمی فرمائی اور یہ رمی سوار ہوکر سورج نکلنے کے بعد فرمائی تھی۔

ف علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب زاد المعاد میں یہاں تک ابحاث کو بہت اُلجھا دیا ہے۔ اس کے بعد ترتیب سے تمام چیزوں کو بیان فرمایا ہے اور حسب ضرورت بحث بھی کی ہے اس لئے ہم نے اپنے حاشیہ کو اسی جگہ ختم کردیا، حسب ضرورت ہمارا حاشیہ گذر چکا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

---

[1] مازمین عرفات اور مزدلفہ کے درمیان ایک جگہ ہے [2] اس سے ان لوگوں کا رد ثابت ہے (باقی ص ۲۷۹ پر)

چونتیسواں[۳۴] باب

ھدی ، قربانی ، عقیقہ[۱]

آٹھ جانور جن کا ذکر سورۂ انعام میں ہے۔ ان کے علاوہ ھدی ، قربانی عقیقہ کے بارے میں نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ منقول ہے اور نہ حضرات صحابہؓ سے ان کے بارے میں قرآن پاک کی چار آیات ہیں[۲]

۱ اُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْاَنْعَامِ	حلال کئے گئے تمہارے لئے مویشی جانور۔
۲ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ اللّٰهُ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ	اور پڑھو! اللہ کا نام گنتی کے چند دنوں میں جو اللہ نے تم کو روزی دی ہے یعنی مویشی جانوروں پر۔

صفحہ ۲۷۸ کا باقی حاشیہ :- جن لوگوں نے یہ کہا ہے صلوٰۃ عید جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض یا واجب نہیں تھی اس وجہ سے آپ نے اس کو نہیں پڑھا لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے پڑھا ہے۔ راوی نے اپنے علم کو بیان کردیا ہے۔ ورنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی مجامع کے موقع پر آپ بہت سے مستحبات لوگوں کو دکھا کر ادا نہیں کرتے تھے، حالانکہ آپ تنہائی میں ادا فرمایا کرتے تھے اس لئے علامہ کا ، عا ثابت نہیں ہوتا ، عیدین کی راتوں میں شب بیداری کی علامہ نے جو نفی فرمائی ہے وہ بھی ضعیف ہے۔ مرقاۃ اور احیاء العلوم میں عیدین کی راتوں میں شب بیداری کی فضیلت تفصیل سے مذکور ہے، ملاحظ فرمایئے (حجۃ الوداع ص۳۹۵) اس رات ذکر و استغفار کی کثرت کرنا چاہئے

۳ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ۔

کھاؤ اس میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق دیا ہے اور نہ پیچھے چلو شیطان کے وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، آٹھ جوڑے ہیں [۱]

۴ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ۔

ھدی ہو جو جاتی ہو کعبہ ہو

اس سے یہ ظاہر ہے کہ جو جانور ھدی کے طور پر کعبہ کی طرف لیجائے جا سکتے ہیں وہ آٹھ جوڑ ہیں اور یہ حضرت علیؓ کا استنباط ہے

ھدی کا جانور ذبیحہ جو ثواب اور عبادت ہے وہ تین قسم کے ہیں یعنی ھدی، قربانی اور عقیقہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری، اونٹ اور گائے کو ھدی کے طور پر ذبح کیا ہے چنانچہ آپ نے حج اور عمرہ میں ایسا کیا ہے۔ آپ کی سنت شریفہ بکری کے قلادہ ڈالنے کی تھی نہ کہ چیرہ لگانے کی اور جب اونٹ کی ھدی بناتے تو اس کے قلادہ بھی ڈالتے اور چیرہ بھی لگا دیتے تھے چنانچہ اونٹ کی بائیں جانب کوہان کے ہلکا سا شگاف دیتے تا کہ اس سے قدرے خون جاری ہو جائے [۵]

صفحہ ۲۷۹ کا باقی حاشیہ ۔ [۱] گذشتہ باب سے اس باب کی یہ مناسبت ہے کہ وہاں ھدی کا ذکر ہو چکا ہے اور قربانی اور عقیقہ میں بھی ان ہی جانوروں کو ذبح کیا جا سکتا ہے جو بطور ھدی کے لیجائے جا سکتے ہیں، اس لئے مفصلاً یہاں تینوں کا ذکر ہے [۲] ان آیات میں ان ہی جانوروں کا ذکر ہے جن کی قربانی اور عقیقہ ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ پالتو حلال جانور جو اصلاً وحشی نہ ہوں۔ لیکن اگر کسی وحشی کو پال لیا جائے جیسے ہرن تو اس کی قربانی جائز نہ ہوگی۔ ایسے ہی اگر کوئی پالتو جانور وحشی ہو جائے تو اسکی قربانی جائز ہوگی (حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] یعنی بکری نر اور مادہ، گائے نر و مادہ (باقی ص۲۸۱)

امام شافعیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنی طرف شگاف لگایا تھا۔ آپ جب کوئی ھدی بھیجتے تو فرما دیتے تھے کہ اگر وہ جانور بہت زیادہ تھک جائے اور چل نہ سکے تو اس کو ذبح کر دیا جائے اور اس کے خون سے اس کے بیرون کو رنگ دیا جائے اور کچھ خون کوہان پر بھی لگا دیا جائے۔ اس مذبوحہ جانور سے نہ آپ کھاتے اور نہ آپ کے ساتھی (بلکہ یہ حق فقراء کا ہوتا تھا)

یہ گذر چکا ہے کہ ایک اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ہوسکتا ہے اور ایسے ہی گائے بھی سات آدمیوں کی طرف سے ہوسکتی ہے۔ ھدی کو لیجانے والے کے لئے اجازت ہے کہ اگر وہ تھک جائے اور اس کے پاس سواری کا دوسرا جانور نہ ہو تو بقدر ضرورت اس پر سوار ہوسکتا ہے، جب تک دوسری سواری کا انتظام ہو، حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ اگر ھدی کا جانور دودھ والا ہو تو جو دودھ اس کے بچے کے پینے سے بچے ضرورتاً اس کو پیا جاسکتا ہے [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ کو کھڑا کر کے اور اس کے ہاتھ پیر باندھ کر نحر کیا کرتے تھے۔ اور آپ نحر کے وقت اللہ کا نام لیتے اور تکبیر کہتے تھے۔ آپ اپنی

صفحہ ۲۸۰ کا باقی حاشیہ: ۔ اونٹ نر اور مادہ یہ آٹھ ہوئے۔ [2] بکری، بھیڑ، اور گائے اور اونٹ کے گلے میں کچھ باندھ کر لٹکا دینا قلادہ ہے [3] زمانہ جاہلیت میں جانوروں کو بدوی لوگ پکڑ لیا کرتے تھے اس وجہ سے اشعار کرنا علامت تھی کہ یہ جانور اللہ کے نام کا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اشعار میں مبالغہ کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس سے جانور کا زخم پھیل جاتا ہے۔

حاشیہ صفحہ ہذا۔ [1] ھدی کے جانور پر بہت شدید ضرورت ہی میں سوار ہوا جاسکتا ہے بشرطیکہ سوار ہونے سے ھدی کو کوئی مضرت نہ ہو، اگر ہوگی تو بقدر ضرر صدقہ ادا کرنا پڑیگا (باقی صفحہ ۲۸۲ پر)

ھدی کو خود ہی ذبح کرتے، بعض اوقات دوسروں کو بھی وکیل بنا دیتے کہ وہ ذبح کرے جیساکہ حضرت علی رضؓ کو وکیل بنا دیا تھا، اور آپ بکری کو لٹاکر ذبح کیا کرتے تھے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کے لئے مباح قرار دیا ہے کہ وہ اپنی ھدی اور قربانی کا گوشت کھائیں اور ذخیرہ بھی بنا سکتے ہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ تین دن سے زیادہ ذخیرہ بنانے پر منع فرمایا[۱] ہے۔ ابوداؤد نے ثوبان سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

ثوبان ہمارے لئے اس بکری کا گوشت تیار کرو
چنانچہ جب تک آپ مدینہ تشریف لائے اس گوشت کو تناول فرماتے رہے۔

امام مسلم نے اس قصہ کو حجۃ الوداع کا قرار دیا ہے۔

عمرے کی ھدی آپ نے عمرہ کی ھدی کو مروہ پہاڑی کے پاس اور قران کی ھدی کو منی میں ذبح کیا ہے۔ اور ایسے ہی حضرت ابن عمر رضؓ کیا کرتے تھے اور آپ حلال ہونے کے بعد ہی ذبح کیا کرتے تھے اور یوم نحر سے پہلے آپ نے کبھی ذبح نہیں کیا اور ایسے ہی آپ نے طلوع شمس اور رمی سے

صفحہ ۲۸۱ کا باقی حاشیہ: یہی حال دودھ کا ہے اولاً تو ٹھنڈے پانی کے تھنوں کو چھینٹے دینے چاہئیں اور اگر یوم نحر میں مدت زیادہ ہو تو دودھ کو صدقہ کردینا چاہیے۔ اگر اپنے صرفہ میں لایا جائے تو بقدر قیمت صدقہ کردینا چاہیے۔ (فتح القدیر صـ۲۹۲ ج ۱)

حاشیہ صفحہ ہذا:۔ [۱] یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا جو منسوخ ہوگیا جیساکہ حدیث ثوبان اور دوسری احادیث سے ثابت ہے۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہ رضؓ کی روایات نقل کی ہیں وہ احادیث حسن صحیح ہیں اور مسنون طریقہ متعارف ہے۔

پہلے ذبح نہیں کیا، لہٰذا یہ چار چیزیں یوم نحر کے ساتھ خاص ہیں پہلے رمی، پھر نحر، پھر سر منڈانا، پھر طواف، اسی ترتیب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے یوم نحر میں طلوع شمس سے پہلے ذبح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا ہدی اور اور قربانی کا ایک ہی حکم ہے۔ قربانی کو بھی سورج نکلنے سے پہلے ذبح نہیں کرنا چاہیے[1]

قربانی کا بیان

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی قربانی کو ترک نہیں کیا، اور آپ دو دنبے عید کی نماز کے بعد ذبح کیا کرتے تھے آپ نے ارشاد فرمایا:۔

جس نے عید کی نماز سے پہلے قربانی کی اس کی قربانی
نہیں ہے بلکہ وہ گوشت ہے جس کو اپنے اہل کے لئے
کیا ہے (یعنی اس کا ثواب نہیں ہے)

یہ آپ کی سنت شریفہ پر دلالت ہے اور خطبہ کا اعتبار نہیں ہے[2] بلکہ ان کے ہو چکنے کا اعتبار ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیڑ کا جذع اور اُس کے علاوہ ثنی کا

---

[1] چونکہ مسنون یہی ہے اور یہی وقت قربانی ہے کہ عید کی نماز کے بعد کی جائے، اس لئے سورج نکلنے سے پہلے قربانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اس دن کا پہلا نسک نماز ہے، پھر قربانی، یہ حکم پہلے دن کے بارے میں ہے لیکن دوسرے اور تیسرے دن اور ایسے ہی دیہات والوں کے لئے پہلے دن بھی، طلوع فجر کے بعد قربانی کرنا جائز ہے، کیونکہ ان پر نماز عید واجب نہیں ہے فتح القدیر صفحہ ۷۶ ج ۸

[2] مطلب یہ ہے کہ خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد قربانی کرنا چاہیے نہ کہ صرف نماز سے فارغ ہونے کے بعد۔ حالانکہ یہ زیادتی ہے کیونکہ خطبہ نماز کے واجبات یا شرائط میں سے نہیں ہے جیسا کہ جمعہ کا خطبہ ہے، اس لئے خطبہ سے پہلے قربانی کرنا جائز ہے (باقی صفحہ ۲۸ پر)

حکم فرمایا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کل ایام تشریق ذبح کے دن ہیں لیکن یہ حدیث منقطع ہے۔ اس کے علاوہ قربانی کے گوشت کو ذخیرہ کر کے تین سے زیادہ کو منع فرمایا ہے۔[۱] اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ قربانی کے دن بھی تین ہیں، کیونکہ حدیث میں تین دن سے زیادہ گوشت کو جمع کرنے کی ممانعت ہے۔ لہذا اگر کسی نے آخری دن ذبح کیا تو اس کو بھی بعد کے تین دن جمع کر کے رکھنے کی اجازت ہے جن علماء نے تین دن کی تحدید کی ہے وہ اسی حدیث سے تین دن سمجھے ہیں۔ ان حضرات نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ جن دنوں میں ذبح جائز ہے ان ہی دنوں میں کھانا شروع اور جائز ہے اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہوا اور صرف ذخیرہ بنانے کی ممانعت باقی رہی۔

ذبح تین دن تک دو وجہ سے جائز ہے ایک تو دوسرے دن اور پھر تیسرے دن، لہذا ان ہی تین دن تک ذخیرہ بنا کر رکھا جا سکتا ہے لیکن استدلال اس سے بھی

صفحہ ۲۸۳ کا باقی حاشیہ :۔ اگرچہ مکروہ ہے، غالباً علامہ نے مستحب طریقہ ذکر کیا ہے یہی ایک روایت حسن بن زیاد کی ہے۔ ردالمحتار ص۲۲۲ ج ۵

حاشیہ صفحہ ہذا :۔ [۱] جذع بھیڑ کا وہ بچہ جو چھ مہینہ یا اس سے زیادہ کا ہو جائے، اور ثنی اونٹ، گائے، بھینس وغیرہ کی علیحدہ ہے۔ مراد اس سے تکمیل اعضا حیوانیت ہے۔ لہذا اونٹ کی ثنی ۵ سال اور گائے، بھینس کی دو سال کی ہے، اور بکری ایک سال۔ ردالمحتار ص۲۲۳ ج ۵ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ثنی جانور کی قربانی کیا کرو، اس سے یہی مراد ہے جو ذکر کیا گیا ہے۔ فتح القدیر ص۵۱۷ ج ۸ [۲] ایام نحر اور ایام تشریق میں فرق ہے۔ ایام النحر ۱۲ ذی الحجہ کو پورے ہو جاتے ہیں۔ اور ایام تشریق ۱۳ ذی الحجہ کو ہوتے ہیں، اور قربانی صرف ۱۲ ذی الحجہ تک کی جا سکتی ہے۔ علامہ نے امام شافعیؒ کا مسلک نقل کیا ہے، ہمارے نزدیک ایام نحر تین ہیں۔ ایک عید کا اور دو دن بعد کے، اس کو حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت علیؓ نے روایت (باقی ص۲۸۵ پر)

پورا نہیں ہوتا، تا وقتیکہ یوم نحر سے تین دن بعد ثابت نہ کیا جائے۔ اور اگر آخری یوم نحر میں ذبح کیا تو پھر آخری دن سے تین دن شمار کرنے ہوں گے، اور حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا ہے۔

ایام النحر یوم الاضحٰے وثلاثۃ ایام بعدہٗ — قربانی کے دن یوم اضحی اور تین دن اس کے بعد

یہی مذہب امام اہل بصرہ حسن کا ہے اور امام اہل مکہ عطار بن رباح کا ہے لیکن اہل شام اوزاعی اور اہل حدیث کے امام، امام شافعی صاحبؒ کا اور اسی کو ابن منذر نے اختیار کیا ہے کہ قربانی کے لئے صرف تین دن مخصوص ہیں اور وہی ایام منی ہیں اور وہی ایام رمی اور تشریق ہیں اور ان ہی کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ اور یہ چیز دو مختلف وجہ سے مروی ہے جس کی ایک دوسرے سے تائید اور قوت ہو رہی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:-

کل منی منحر وکل ایام التشریق ذبح — پورا منی ذبح کی جگہ ہے اور کل ایام تشریق ذبح کے دن ہیں۔

اور جبیر بن مطعمؓ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے، لیکن اس میں انقطاع ہے، اور اسامہ بن زید نے عطار سے اور انھوں نے جابرؓ سے روایت کیا ہے اور اسامہ بن زید اہل مدینہ کے نزدیک ثقہ ہیں۔

باقی حاشیہ ۲۸۴ :- کیا ہے، یہی امام صاحب کا مسلک ہے۔ امام شافعی صاحبؒ کی حدیث منقطع ہے۔ فتح القدیر ص ۷۵ ج ۴ - ۳ - امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ پہلے میں تین دن سے زیادہ گوشت رکھنے کو منع کرتا تھا، اب ہر آدمی خود بھی کھلائے اور دوسروں کو بھی کھلائے اور جب تک چاہے ذخیرہ بنا کر رکھے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ایام ذبح اس مسئلہ میں چار قول ہیں۔ ایک قول تو گذر چکا ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وقت ذبح یوم نحر (دسویں تاریخ) اور اس کے دو دن بعد ہیں۔ یہ امام احمد، امام مالک اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے۔ امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ یہی مذہب بیشتر حضرات صحابہ رضؓ کا ہے۔ اور اثرم نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ وقت ذبح صرف ایک ہی دن ہے اور یہ ابن سیرین کا قول ہے۔ ان کا فرمانا ہے کہ چونکہ ایک دن ہی کا نام یوم نحر ہے۔ اس وجہ سے اس کا حکم بھی ایک ہی دن کے لئے ہے۔ اور اگر تین دن تک قربانی کو جائز قرار دیا جائے تو پھر "ایام النحر" کہنا چاہیئے[1] جیسا کہ ایام الرمی ایام تشریق تین دن کو کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ قربانی یوم عید کو ہوتی ہے اور وہ صرف ایک ہی دن ہوتا ہے جیسا کہ عید الفطر ایک دن ہوتا ہے۔

چوتھا مذہب سعید بن جبیرؓ اور جابر بن زید کا ہے۔ اور ان کا فرمانا ہے کہ ایام قربانی منیٰ میں تین دن اور بقیہ تمام شہروں میں ایک دن۔ منیٰ میں چونکہ اعمال مناسک ادا ہوتے ہیں اور وہ تین دن تک رہتے ہیں اس لئے قربانی بھی تین دن تک ہونا چاہیئے اور دیگر شہروں کا یہ معاملہ نہیں ہے۔

آداب قربانی جو آدمی قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اُس کو بال وغیرہ نہیں کٹوانا چاہیے۔ صحیح مسلم میں اس کے بارے میں جناب رسول اللہ

لہ ۔ معلوم نہیں امام ابن سیرین کو کس وجہ سے اشتباہ ہوا۔ حالانکہ حدیث شریف میں صراحۃً ایام النحر ثلثۃ افضلھا اولھا، یعنی ایام نحر تین ہیں سب سے اول پہلا دن ہے حضرت علی کی روایت میں اولھن افضلھن ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے اور متعدد اسناد سے مروی ہے اور امام شافعیؒ دالی مقطوع بھی اور ابن حبان نے اسکو موضوع بھی قرار دیا ہے۔ العنایہ ص۱۷۷ ج ۲۔

صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے[1]۔ لیکن دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ حدیث ام سلمہ پر موقوف ہے۔ آپ کی عادت شریفہ قربانی کے لئے بہترین جانور لینے کی تھی۔ آپ نے کان کٹی سینگ ٹوٹی قربانی سے منع کیا ہے[2] ابوداؤد نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے ان جانوروں کی قربانی سے منع فرمایا ہے یعنی

مقابلہ مدابرہ شرقاء خرقاء

مقابلہ وہ جانور جس کے کان کا اگلا حصہ کٹا ہو۔ مدابرہ وہ جانور جس کے کان کا پچھلا حصہ کٹا ہو، شرقاء وہ جانور جس کے کان میں چیرہ ہو اور خرقاء وہ جانور جس کا کان پھٹا ہوا ہو۔ ابوداؤد نے دوسری روایت میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ چار قسم کی قربانی جائز نہیں ہے۔

بالکل واضح طور پر بھینگی، بہت بیمار، لنگڑی، کوئی عضو کٹا نہ ہو، بہت دُبلی

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے ان جانوروں کی قربانی سے منع فرمایا ہے۔

مصفرہ مستاصلہ بخقاء مشیعہ الکسری

مصفرہ وہ جانور جس کا جڑ سے کان ہی نہ ہو مستاصلہ وہ جانور جس کا جڑ سے سینگ

---

[1] امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں قربانی کرنے والے کو بال اور ناخن نہ کٹوانا چاہئے اور یہ مستحب ہے واجب یا ضروری نہیں ہے۔ بذل ص۵۸ ج۴ [2] حدیث میں چار قسم کے معیوب جانوروں کی قربانی جائز نہیں ہے عیمار عوراء، عرجاء، عجفاء۔ عمیا بالکل اندھا جانور (۲) عوراء جس کا بھینگا پن واضح ہو جس کو کانا کہا جاتا ہے۔ عرجاء لنگڑا جانور، عجفاء بہت دبلا اور کمزور جانور"۔ اس حدیث کے تحت فقہاء نے ذرا تفصیلی کلام کیا ہے۔ وہ جانور جس کے پیدائشی سینگ نہ ہوں اس کی قربانی جائز ہے (ہدایہ)

ہی نہ ہو نجقار جس کی آنکھ پھوٹی ہوئی ہو مشیعہ وہ جانور جو بکری کے پیچھے بھی نہ چل سکے اور کسیری وہ جانور جس کا کوئی عضو ٹوٹا ہوا یا کٹا ہوا ہو[۱]۔

قربانی کی جگہ آپ کی عادت شریفہ تھی کہ آپ عیدگاہ ہی میں ذبح کردیا کرتے تھے، اس کو ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں:۔

کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے جانور کو عیدگاہ لیجاتے
جب خطبہ سے فارغ ہوکر منبر سے اُترتے تو آپ کے سامنے دُنبہ پیش
کیا جاتا، آپ اس کو اپنے دست مبارک سے بسم اللہ و اللہ اکبر کہہ کر
ذبح کرتے اور فرماتے یہ میری جانب اور میری اُمت میں سے جو
نہ کرسکے اُس کی جانب سے ہے[۲]

صحیحین میں ہے کہ آپ ذبح اور نحر عیدگاہ میں کیا کرتے تھے۔ ابوداؤد نے روایت کیا

---

[۱] حنفیہ نے اس بارے میں فرمایا ہے کہ ایک تہائی یا اس سے کم اگر کوئی عضو کٹا ہوا ہے تو قربانی جائز ہے اور اگر نصف یا اس سے زائد کوئی عضو کٹا ہوا ہے تو قربانی جائز نہیں ہے۔ ردالمحتار صفحہ ۲۵۴ ج ۵ - علماء نے یہاں اجمال سے کام لیا ہے یا اُن کا مسلک ہی یہ معلوم ہوتا ہے [۲] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار یا پانچ جگہ عیدا در تیر عید کی نماز پڑھی ہے جس کا تفصیلی ذکر ہم نے اسی کتاب کے حصہ اول میں صفحہ ۱۶۳ پر کیا ہے۔ اس تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز عیدین جنگل میں ادا کیا کرتے تھے۔ اس کے لئے کوئی عمارت یا منبر وغیرہ تعمیر نہیں کیا گیا تھا جیسا کہ آجکل ہے، اس لئے عیدگاہ میں قربانی کا جانور ذبح کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ میں جس جگہ کو ہم عیدگاہ کہتے ہیں وہاں قربانی کا جانور ذبح کیا جائے [۳] یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ غرض یہ ہے کہ قربانی کا ثواب ایک سے زائد کو بخشا جا سکتا ہے یہاں سقوط وجوب یا فریضہ نہیں ہے بلکہ ثواب مراد ہے الخ بذل صفحہ ۷۶ ج ۴۔

کہ آپ نے یوم نحر میں دو دنبہ ذبح کئے، جب ان کو قبلہ رُخ کیا تو فرمایا:۔[۲]

وجہت وجہی للذی فطر	میں نے اپنا رُخ اُس ذات کی طرف کیا ہے
السمٰوٰت والارض حنیفاً وما انا	جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ میں
من المشرکین، ان صلاتی ونسکی	سب سے بے نیاز ہوں اور مشرکین میں سے
ومحیای ومماتی للہ رب العالمین	نہیں ہوں، میری نماز، قربانی، زندگی، موت خدا
لاشریک لہ وبذلک امرت وانا	ہی کے لئے ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے
اول المسلمین۔	اور اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں
اللھم منک ولک عن محمد	اے اللہ یہ تیری ہی توفیق سے اور تیرے ہی لئے ہے
وامتہ بسم اللہ واللہ اکبر۔	میری طرف سے اور میری اُمت کی طرف سے الخ۔

اس کے بعد ذبح فرماتے اور آپ نے فرمایا ہے کہ جب ذبح کیا جائے تو اچھی طرح کیا جائے اور جب قتل کیا جائے تو اچھی طرح قتل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کو لازم کیا ہے۔[۱]

آپ کی سنت شریفہ یہ ہے کہ ایک بکری ایک آدمی اور اس کے گھر والوں کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے، حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے دریافت کیا گیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قربانی کس طرح کی جاتی تھی۔ آپ نے فرمایا ایک بکری ایک اہل بیت کی طرف سے اُس کو وہ خود بھی کھاتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے ترمذی نے

---

[۱] یعنی ذبح اس طرح کیا جائے کہ جانور کو زیادہ دیر تک ایذا نہ ہو۔ تیز دھار آلہ ہو جس سے بہت جلد ذبح ہو جائے ایسے ہی ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کیا جائے۔ وعلی ہذا القیاس

[۲] شاید یہ حکم ابتدائے اسلام کا ہو، ورنہ صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ ایک بکری ایک ہی کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ اس پر تفصیلی طور پر کئی جگہ کلام ہو چکا ہے۔

کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

عقیقہ کا بیان

مؤطا میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔

لا احب العقوق۔ — میں عقوق[1] پسند نہیں کرتا۔

گویا آپ نے یہ نام ناپسند فرمایا ہے حضرات صحابہؓ نے عرض کیا:۔

یا رسول اللہ ینسك احدنا عن ولدہ فقال من احب منکم ان ینسك عن ولدہ فلیفعل عن الغلام شاتان وعن الجاریۃ شاۃ۔

حضور! ہم میں سے کوئی اپنے بچے کی طرف سے کیا ذبح کرے۔ فرمایا اگر تم میں سے کوئی ذبح کرنا چاہے تو لڑکے کی طرف سے دو بکری اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرے

حضرت عائشہ رضؓ کی صحیح روایت سے بھی یہی ثابت ہے اور فرمایا:۔

ہر بچہ عقیقہ کے ساتھ مرہون[2] ہے۔ ساتویں دن اس کی طرف سے ذبح کر دینا چاہیے۔ اور سر مونڈ دینا چاہیے اور اس کا نام رکھ دینا چاہیے۔

---

[1] عقوق کے معنی نافرمانی کے ہیں غالباً اسی معنی کے اعتبار سے ناپسندی کا اظہار فرمایا ہے بعض اہل لغت عقیقہ۔ العق سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی پھاڑنے کے آتے ہیں۔ غالباً اس صورت میں بالوں کا تراشنا مراد ہے اصطلاحاً اور عرفاً مذبوحہ جانور کو کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ بذل ھشح م [2] مرہون کے معنی گروی ہونے محبوس ہونے کے ہیں۔ اس کی بہت سی توجیہات علامہ نے بیان کی ہیں لیکن یہ توجیہ بھی عمدہ ہے کہ بچہ سر پر بال ہونے کی وجہ اور سر کے مسامات نہ کھلنے کی وجہ سے اذیت محسوس کرتا ہے اور اُسکے دماغی نشو ونما میں فرق آتا ہے سر کے بال مونڈنے کے بعد وہ دماغی اذیت ختم ہو جاتی ہے (باقی ۲۹۱ پر)

(باقی ۲۹۱ پر)

امام احمد نے فرمایا ہے اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کی شفاعت سے رکا ہوا ہوتا ہے۔ اور رہن لغت میں روک دینے کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ — ہر نفس اپنی کمائی کی وجہ سے رکا ہوا ہوگا۔

ظاہر حدیث سے مراد خیر سے رُکنا ہے اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کو آخرت میں عذاب ہوگا، اگراس کے ماں باپ نے عقیقہ نہیں کیا ہے۔ اور ماں باپ کی اس کوتاہی کی وجہ سے وہ خیر سے رُکا رہے گا، اور جیسا کہ جماع کرتے وقت آدمی بسم اللہ کرتا ہے تو شیطان اس جماع سے پیدا ہونے والے بچہ کو کچھ نقصان نہیں پہونچا سکتا، اور اگر نہ کیا جائے تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوگا[2] بلکہ یہ اس پر دلالت ہے کہ یہ لازم ہے۔ اسی حدیث سے بعض حضرات عقیقہ کے وجوب پر استدلال کرتے ہیں جیسے لیثؒ اور حسن بصریؒ اور اہل ظاہر۔ واللہ اعلم۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمام بن قتادہؒ کی روایت میں یدمّٰی (خون آلود کرنا) موجود ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ ہمام نے کہا قتادہ سے جب پوچھا گیا تو انھوں نے بتلایا کہ جب جانور کو ذبح کیا جائے تو اس کی رگوں سے جو خون نکلے اس سے

باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۰ اور بکری کا ذبح کرنا بطور صدقہ اور شکریہ ہے۔ واللہ اعلم بذل ۳۶ ج ۴

حاشیہ صفحہ ہذا: [1] شفاعت سے رکا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اگر بچہ کا اس وقت انتقال ہوجائے تو وہ والدین کی شفاعت نہیں کرے گا۔ علامہ کی یہ تاویل نہایت کمزور ہے۔ واللہ اعلم۔ [2] حدیث شریف میں جماع کرنے کے وقت کی ایک دُعا ہے "اے اللہ مجھے شیطان سے بچا اور جو تو نے میرے لئے مقدر فرمایا ہے (یعنی بچہ) اس کو شیطان سے بچا، انشاء اللہ اس سے فائدہ حاصل ہوگا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

کپڑا تر کر کے تالو پر رکھ دیا جائے، حتیٰ کہ خون سر پر بہنے لگے پھر سر دھو دیا جائے اور پھر بال مونڈ دیئے جائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے. بعض نے کہا ہے کہ یہ الفاظ بروایت حسن عن سمرۃ ہیں اور حسن کا سمرۃ رض سے سننا ثابت نہیں ہے اور بعض نے اس حدیث کا سننا صحیح قرار دیا ہے. ترمذی نے کہا کہ یہ صحیح ہے اور بخاری نے بھی اس کو اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے چنانچہ انھوں نے جبیب بن شہید کا مقولہ نقل کیا ہے کہ مجھ سے محمد بن سیرین نے کہا کہ امام حسن رض سے دریافت کرو. میں نے جب امام حسن بصری سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے سمرۃ رض سے سنا ہے۔

پھر اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے کہ ایسا کرنا چاہیئے یا نہیں؟ چنانچہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کو ہمام بن یحییٰ کا وہم قرار دیا ہے. بعض نے کہا ہے کہ حقیقت حال یہ ہے کہ اصل میں "یسمّی" تھا، چونکہ ہمام کی زبان میں لکنت تھی اس وجہ سے انھوں نے "یدمی" روایت کیا، میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے کیونکہ انھوں نے تو قتادہ رض سے اس کی کیفیت تک روایت کردی ہے۔ اگر وہم ہے تو پھر حسن کا یا قتادہ کا وہم ہوگا۔

جو حضرات اس کے قائل ہیں وہ اس کو سنن عقیقہ میں شمار کرتے ہیں اور جو حضرات اس کا انکار کرتے ہیں جیسے امام مالک، امام شافعی، امام احمد، ان حضرات کا فرمانا ہے کہ "یدمی" نہیں بلکہ یسمّی (نام رکھنا) ہے اور وہ عمل، عمل جاہلیت ہے جس کو اسلام نے باطل قرار دیا ہے جیسا کہ ابوداؤد نے بریدہ بن حصیب کی روایت ذکر کی ہے

> زمانہ جاہلیت میں جب ہمارے کسی کے بچہ پیدا ہوتا تو ہم بکری ذبح کرتے اور اس کے خون سے اس کے سر کو آلودہ کرتے لیکن جب اسلام آیا تو ہم بکری ذبح کرتے اور بچہ کا سر مونڈ کر اس پر زعفران ملتے۔

علماء نے کہا کہ اس حدیث کے اسناد اگرچہ قابل قبول نہ ہوں لیکن حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تائید ہو رہی ہے

امیطوا عنہ الاذی۔ بچہ سے گندگی دور کرو۔

اور یہ ظاہر ہے کہ دم (خون) گندگی ہے۔ لہذا اس سے سر آلودہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کا عقیقہ دو دنبوں سے کیا اور آپ نے ان کے سر کو خون سے آلودہ نہیں کیا، لہذا یہ عمل سنت نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ عمل اہل جاہلیت کے لئے زیادہ لائق ہے کہ وہ کرتے تھے

عقیقہ کا جانور

اگر یہ کہا جائے کہ حضرات حسنینؓ کا عقیقہ آپ نے ایک ایک دنبہ سے کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ ایک کی طرف سے ایک بکرا کرنا یہ آپ کی سنت شریفہ ہے یہی حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ نے روایت کیا ہے اور حضرت حسن کی پیدائش احد کے سال ہوئی تھی اور حضرت حسینؓ کی اس کے بعد کے سال ہوئی تھی، چنانچہ حضرت علیؓ روایت فرماتے ہیں

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کا عقیقہ ایک بکری سے کیا اور فرمایا اے فاطمہ اس کے سر کے بال مونڈ اور اس کے بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کر چنانچہ ہم نے وزن کیا تو اس کا وزن ایک درہم یا اس سے کچھ کم تھا۔

اگرچہ اس حدیث کے اسناد متصل نہیں، پھر بھی حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کافی ہے چنانچہ علماء نے کہا کہ عقیقہ بھی ایک قسم کی قربانی ہے، لہذا مثل قربانی اور دم تمتع کے ایک کی طرف سے ایک بکری کافی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ دو بکریاں لڑکے کی طرف سے اور ایک بکری لڑکی کی طرف سے اولیٰ ہے اس کو اختیار کرنا چند وجہ سے مناسب ہے

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں روایات بکثرت ہیں جیسے حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ابن عمر رضؓ، ام کرزؓ اور حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ، ابو داؤد نے ام کرز رضؓ

کی حدیث روایت کی ہے:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا،
وسلم یقول عن الغلام شاتان	آپ نے فرمایا لڑکے کی طرف سے دو بکری برابر کی
مکافیتان وعن الجاریۃ شاۃ	اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری

ابوداؤد نے کہا کہ میں نے امام احمد سے سنا، انھوں نے فرمایا مکافیتان کے معنی برابری کے ہیں۔ میں کہتا ہوں "مکافیتان" فا کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ محدثین حضرات فا کو زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں، زمخشری نے کہا ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ام کرز کی ایک دوسری روایت انھیں الفاظ کے ساتھ اور بھی ہے۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور حضرت عمرو بن شعیبؓ اور حضرت عائشہ رضہ کی حدیث میں گذر چکا ہے۔ ترمذی نے اس کے بارے میں بھی یہی فرمایا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور اسماعیل بن عباسؒ نے حضرت اسما کی روایت بھی یہی ذکر کی ہے۔ میں نے امام احمد سے دریافت کیا تو فرمایا اسماء سے مراد حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضہ ہیں۔ میں نے امام احمدؒ کے سامنے یہ حدیث پیش کی

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	حضور صلعم نے ارشاد فرمایا۔ لڑکے کی
قال یعق عن الغلام ولا یمس	طرف سے عقیقہ کرو اور اس کے سر کو
راسہٗ بدم	خون نہ لگاؤ۔

فرمایا میں اس حدیث کے راوی عبداللہ بن یزید مزنی کو نہیں جانتا۔ ان احادیث کے مقابلہ میں حسنؓ اور حسینؓ کا صرف ایک ہی واقعہ ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرات حسنینؓ کا عقیقہ صرف فعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور دو بکریوں کے بارے میں آپؐ نے امر فرمایا ہے اور اس میں بھی عمومیت ہے جبکہ عمل میں اختصاص کا احتمال ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ دو شاۃ والی روایت میں

ایک قسم کا اضافہ ہے جس کو اختیار کرنا اولیٰ ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ فعل سے جو ثابت ہوتا ہے یعنی ایک بھی جائز ہے، پانچویں وجہ یہ ہے کہ حضرات حسنینؓ کے عقیقہ کا واقعہ، احد والے سال اور اس کے بعد والے سال کا ہے اور ام کرز نے آپ سے حدیبیہ والے سال یعنی ۶ سال بعد سُنا، اس کو امام نسائی نے کتاب کبیر میں بیان کیا ہے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ حضرات حسنینؓ کے عقیقہ میں ممکن ہے کہ جنس مذبوح بیان کرنا مقصود ہو جیسا کہ حج کے موقعہ پر آپ نے اپنی ازواج کی طرف سے گائے کی، تو اس جگہ بھی جنس بیان کرنا مقصود تھا نہ کہ صرف ایک کی تخصیص کرنا تھا۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لڑکے کو لڑکی پر فوقیت دی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے "لَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثیٰ" لہٰذا احکام میں بھی فوقیت حاصل رہے گی جیسا کہ میراث اور دیت، اور شہادت میں دو عورتوں کا مرتبہ ایک مرد کے برابر ہے، لہٰذا عقیقہ میں بھی یہی حکم ہے۔ آٹھویں وجہ یہ ہے کہ عقیقہ، عتق کے مشابہ ہے (اس جگہ اصل کتاب میں جگہ خالی ہے اس کے بعد مرقوم ہے) چونکہ بچہ بغیر عقیقہ کے رہن ہوتا ہے، لہٰذا اس کی آزادی یہ ہے کہ لڑکے کے بدلے دو اور لڑکی کے بدلے ایک بکری ہونا چاہیے۔ اور جامع ترمذی میں حدیث ہے۔

ایما امرء مسلم اعتق امراءً	جو مسلمان مرد کسی مسلمان مرد کو آزاد کرے اس کی آزادی
مسلمًا کان فکاکہ من النار یجزی	دوزخ سے اس طرح ہوگی کہ اس کے ہر عضو کے
کل عضوٍ منہ عضواً منہ و	بدلے اس کا ہر عضو اور جو مسلمان مرد، دو مسلمان عورتوں
ایّما امرء مسلم اعتق امرأتین	کو آزاد کرے تو اس کی آزادی دوزخ سے اس
مسلمتین کانتا فکاکہ من النار	طرح ہوگی کہ ان کے دو عضو کے بدلے اس کا ایک
یجزی کل عضوٍ منہما عضواً	عضو آزاد ہوگا اور جو مسلمان عورت

من- وايما امرأة مسلمة اعتقت امرأة مسلمة كانت فكاكها من النار يجزى كل عضو منها عضوا منها- | کسی مسلمان عورت کو آزاد کرے اُس کی آزادی دوزخ سے اس طرح ہوگی کہ اسکے ہر عضو کے بدلے اُس کا ہر عضو آزاد ہوگا۔

اور یہ حدیث صحیح ہے حضرات حسنینؓ کے عقیقہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضؓ سے ارشاد فرمایا تھا کہ ان کے پائے دایہ کے یہاں بھیجدو[1] اور باقی گوشت خود بھی کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ اور اُس کی ہڈیاں نہ توڑو[2]۔

خود اپنا عقیقہ کرنا حضرت انسؓ نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی ہونے کے بعد خود اپنا عقیقہ آپ کیا ہے، علامہ نے اس جگہ ابوداؤد کی دو سند بیان کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ امام احمد نے فرمایا اس کی سند میں عبداللہ بن محرز ضعیف اور منکر ہے[3]

اذان دینا وغیرہ ابورافع کہتے ہیں کہ جب حضرت فاطمہؓ کے یہاں حضرت حسن پیدا ہوئے تو آپ نے ان کے کان میں اذان دی۔

---

[1] یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ میری نظر سے نہیں گذری۔ دایہ کے یہاں پائے بھیجنے کا اضافہ معلوم ہوتا ہے یا مراسم جاہلیت میں سے ہے ورنہ عقیقہ کے گوشت کا حکم وہی ہے جو قربانی کے گوشت کا حکم ہے [2] یہ دستور بھی فال لینے کے طور پر زمانہ جاہلیت کا تھا امام مالک نے موطا میں اس کے خلاف ذکر کیا ہے۔ ابن حبیب نے اس کو عمل جاہلیت قرار دیا ہے۔ علامہ نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی اور روایت کو ویسے ہی نقل کر دیا۔ اوجز ص۲۱۲ ج ۴

[3]۔ اس حدیث کے اکثر راوی ضعیف ہیں، بعض نے اس کو صحیح سند سے روایت کیا ہے تو اس کا جواب یہ دیا ہے ہوسکتا ہے کہ یہ خصائص میں سے ہو۔ علامہ عینی نے فرمایا عقیقہ کرنا ماں باپ کی سنت ہے بچّہ کی نہیں اور اسی پر فتویٰ ہے۔ امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے۔ افسوس کہ علامہ نے اس پر بھی کلام نہیں کیا اوجز ص۲۰۸ ج ۴۔

حضرت قتادہ کی حدیث میں یہ گذر چکا ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کیا جائے اور بچہ کا نام رکھ دیا جائے۔ ابو عبداللہ نے کہا ہے کہ حضرت انسؓ نے روایت کیا ہے کہ تیسرے دن تک نام رکھ دینا چاہیئے۔ اور ختنہ کے بارے میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ بچہ کی اُس وقت تک ختنہ نہ کراتے تھے جب تک وہ کوئی چیز پکڑنے نہ لگے۔ میمونی کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ بچہ کی ختنہ کرنا ساتویں دن مکروہ کہتے تھے، لیکن ابو عبداللہ کہتے ہیں کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے تو صرف یہود کی مشابہت کی وجہ سے انکار کیا ہے، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے مکحول کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے صاحبزادے حضرت اسحٰق کی ختنہ ساتویں دن کیں اور حضرت اسماعیلؑ کی ختنہ ۱۳ سال کی عمر میں کیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا ہے۔ بہر حال یہ دونوں سنت ابراہیمی ہیں۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختنہ کے بارے میں اختلاف گذر چکا ہے۔

نام اور کنیت آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سب سے بُرا نام ہے "ملک الاملاک" ہے، ملک تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، بلکہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ، عبدالرحمٰن ہے اور سب سے سچا نام حارث، ہمام ہے، اور سب سے بُرا نام حرب، مُرۃ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، اپنے لڑکے کا نام یسار، رباح، نجیح، افلح نہ رکھو اور آپ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے "عاصیہ" نام کو بدل کر جمیلہ رکھا تھا اور حضرت ام المومنین جویریہؓ کا نام "برۃ" تھا، آپ نے بدل کر جویریہ رکھا تھا۔ زینب بنت ام سلمہؓ

لہ متفق علیہ حدیث میں "برۃ" نام حضرت زینب کا آیا ہے، اور آپ نے حضرت زینب ہی سے یہ ارشاد فرمایا تھا، علامہ کی حدیث دانی ملاحظہ فرمائیے کہ کسی ضعیف حدیث کا سہارا لیکر اس واقعہ کو حضرت جویریہ کی طرف منسوب کردیا۔

کہتی ہیں کہ آپ نے ایسا نام رکھنے سے منع فرمایا تھا، اور ارشاد فرمایا ہے:۔

لا تزکوا انفسکم اللہ اعلم اہل البر منکم۔ — اپنے آپ پاک باز نہ بنو! اللہ تعالیٰ تمہارے نیکوں کو خوب جانتا ہے۔

اور آپ نے "اصرم" کو بدل کر "زرعہ" رکھا۔ ایسے ہی "ابو الحکم" کو بدل کر ابو شریح کر دیا تھا، اور "حزن" نام کو سعید سے بدل دیا تھا، ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "عاصی"۔ "عزیز"۔ عبلہ، شیطان، حکم، غراب، جناب، شہاب، ناموں کو بدل دیا تھا، اور آپ نے ہشام نام رکھا، حرب کی جگہ سلم، مضطجع کی جگہ منبعث، ارض عفرہ کی جگہ خضرہ اور شعب الضلالہ کی جگہ شعب الہدی اور بنو زنیہ کی جگہ بنو رشدہ مقرر فرمایا اور بنو معاویہ کی جگہ بنو رشیدہ نام رکھا۔

ناموں کے بارے میں حکمت یہ ہے کہ اسم معنی کے لئے قالب ہوتا ہے۔ لہذا مناسب یہ ہے کہ الفاظ اور معنی میں ارتباط اور تعلق ہو۔ لہذا ایسا نام رکھنا نہ چاہیئے، جس سے اجنبیت اور عدم ارتباط ظاہر ہوتا ہو، اور اسماء کی مسمّٰی پر تاثیر واقع ہوتی ہے جیسا کہ اچھائی، برائی، بوجھ اور لطافت میں تاثیر ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اچھے نام کو پسند فرماتے تھے۔ اور جب کوئی آپ کے پاس آتا تو آپ اس کے نام سے معنی کا استنباط فرمایا کرتے تھے۔

آپ نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہؓ۔ دار عقبہ بن رافع میں ہیں، اور آپ کی خدمت میں رطب (پکی کھجور) ابن طاب کی کھجوروں میں سے پیش کی جا رہی ہیں۔ آپ نے اس کی تاویل اس طرح فرمائی:۔

ان کے لئے دنیا میں عاقبت اور آخرت میں رفعت حاصل ہوگی اور جو دین اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے وہ اچھا اور عمدہ دین ہے۔"

ایسے ہی جب حدیبیہ میں آپ کی خدمت میں سہیل بن عمرو آئے تو آپ نے فرمایا معاملہ میں سہولت حاصل رہے گی، ایسے ہی آپ نے ایک جماعت کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا "کوئی اس بکری کا دودھ دوہے"۔ چنانچہ ایک آدمی کھڑا ہوا، آپ نے دریافت کیا، کیا نام ہے؟ اس نے عرض کیا "مرۃ" (کڑوے کو کہتے ہیں)، آپ نے فرمایا، بیٹھ جا، دوسرا کھڑا ہوا تو پھر دریافت کیا کیا نام ہے؟ اس نے عرض کیا "حرب" (جنگ کو کہتے ہیں) آپ نے فرمایا بیٹھ جا تیسرا کھڑا ہوا، اس سے پوچھا تو اس نے عرض کیا، میرا نام "یعیش" ہے آپ نے فرمایا تو دوہ!

آپ ان مقامات سے بھی کراہت فرماتے تھے جن کے نام برے ہوتے اور ایسی جگہوں سے ہوکر تشریف لیجانا بھی پسند نہیں تھا، چنانچہ بعض غزوات میں آپ تشریف لے جارہے تھے کہ دو پہاڑیاں ملیں، آپ نے ان کے نام دریافت فرمائے۔ عرض کیا گیا، فاضح، مخز (ذلیل اور رسوا کرنے والا اور رہونے والا) چنانچہ آپ وہاں سے ہٹ گئے اور دوسری طرف سے تشریف لے گئے۔

بہرحال اسم اور مسمّی میں ایک قسم کا تعلق ہوتا جیسا کہ اشیاء اور ان کے حقائق اور ڈھانچوں، اور روح وجسم میں تعلق ہوتا ہے تو عقل انسانی اس تناسب اور تعلق کی طرف رہنمائی کرتی ہے، چنانچہ ایاس بن معاویہ اور بعض دوسرے حضرات جب کسی آدمی کو دیکھتے تو فرماتے "مناسب تھا کہ اس کا نام یہ ہوتا" تو ممکن ہے اس سے یہ خطا نہ ہوتی۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک آدمی آیا تو آپ نے دریافت کیا، کیا نام ہے؟ عرض کیا "جمرۃ" (چنگاری)، اور تیرے باپ کا نام؟ عرض کیا شہاب (شعلہ) اور تیرا ٹھکانا؟ عرض کیا، بحرۃ النار (آگ کا سمندر) میں اور تیرا گھر؟ عرض کیا "ذات لظی" (لپیٹ والا) یہ سُنکر حضرت عمرؓ نے فرمایا، جا! تیرا گھر جل گیا ہے۔ چنانچہ جب واپس ہوا تو دیکھا واقعی اس کا گھر جل گیا تھا[1]

(حاشیہ ۱ے اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

حضرت عمرؓ نے اس واقعہ میں، الفاظ کو سنکر اس کے معنی بیان فرمادیے جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں سہیل کو دیکھ کر سہولت کو بیان فرمادیا تھا، چنانچہ ایسا ہوا کہ سہولت ہوتی چلی گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اچھے نام رکھنے کی تاکید فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا کہ قیامت کو تم لوگ نام بنام[1] بلائے جاؤ گے" اللہ بہتر جانتا ہے اس میں ایک قسم کا اشارہ ہے کہ اچھے ناموں کی بدولت امید ہے کہ افعال بھی اچھے ہوں گے لہذا پکار بھی اچھے ہی ناموں کے ساتھ ہوگی۔ اس سے عمدہ قسم کے اوصاف کا اعلان ہوگا جس میں ایک قسم کا اعزاز و اکرام ہے۔

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں اسمار گرامی" احمد، محمد" میں غور کیا جائے۔ یہ دونوں مبارک نام اپنے اندر کس قدر اوصاف لئے ہیں۔ آپ میں بکثرت اوصاف محمودہ تھے، اس لئے جناب کی ذات گرامی اور ان دونوں ناموں میں کسقدر ربط باہمی ہے جیساکہ روح اور جسم کے ساتھ ربط ہے۔

ایسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالحکم بن ہشام کی کنیت ابوجہل مقرر فرمائی تھی حقیقت یہ ہے کہ وہی اس کنیت کا سب سے زیادہ مستحق تھا، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے عبدالعزیٰ کی کنیت ابولہب مقرر فرمائی اور یہ کنیت اسی کے لئے زیادہ لائق تھی اس کا ٹھکانا دوزخ ہے[2] اور جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس کا نام یثرب تھا

حاشیہ صفحہ ۲۹۹ [1] یہ قصہ فرضی نہیں ہے موطاء مالک میں اس کو صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اس روایت کے الفاظ علامہ کی تخریج سے زیادہ واضح ہیں۔

حاشیہ صفحہ ہذا: [1] صحیح حدیث میں تو یہ ہے کہ قیامت کے دن تم اپنے ناموں اور اپنے آباء کے ناموں کے ساتھ پکارے جاؤ گے لہذا اچھے نام رکھو، علامہ نے غالباً مفہوم بیان کیا ہے [2] اس پر مفصل بحث جلد اول میں گذر چکی ہے۔ رجوع کیا جائے

وہ اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کا نام آپ نے طیبہ رکھ دیا، اور چونکہ اچھے نام اچھے مسمّی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے حضور صلعم جب بعض قبائل عرب کو دعوت دیا کرتے تھے تو فرماتے "یا بنی عبداللہ" اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام اور تمہارے باپ کا نام اچھا مقرر کیا ہے اس طرح آپ نے لوگوں کو عبودیت کی طرف دعوت دی۔

ایسے ہی غزوہ بدر میں چھ جنگبازوں کے ناموں پر غور کیجئے! ان کے ناموں کو ان کے احوال سے کسقدر مطابقت حاصل ہے، مثلاً عتبہ، شیبہ، ولید، چنانچہ ولید اس کو کہتے ہیں جس میں کم درجہ کا ضعف ہو اور شیبہ اُس کو کہتے ہیں جس میں زیادہ ضعف ہو جیساکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ	اللہ نے تم کو ضعیف پیدا کیا۔ پھر ضعف
مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ	کے بعد قوت دی اور پھر قوت کے بعد ضعیف
بَعْدِ قُوَّۃٍ ضُعْفًا وَّشَیْبًا۔	بوڑھا کر دیا۔

اور عتبہ، عتب سے بنا ہے۔ اور مسلمانوں میں سے ان تین کے جو مقابل آئے تھے ان کے ناموں پر بھی غور کیجئے علی، عبیدہ، حارث رضی اللہ عنہم، ان تینوں میں اوصاف کے اعتبار سے کسقدر مناسبت ہے۔ چنانچہ علی، علو اور بلندی کو کہتے ہیں۔ عبیدہ، عبودیت سے بنا ہے اور حارث، حرث سے بنا ہے جس کے معنی کوشش کرنے کے ہیں، لہٰذا یہ تینوں حضرات اپنی کوشش اور عبودیت کی بنا پر اُن کافروں پر غلبہ پا گئے

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناموں میں اللہ، اور رحمٰن کی طرف اضافت بہت پسندیدہ ہے۔ بمقابلہ دوسرے اوصاف کے مثلاً عبدالرحمٰن، اللہ تعالیٰ کو عبدالقادر کے مقابلہ میں زیادہ پسند ہے اور عبداللہ، عبدالرب کے مقابلہ میں زیادہ پسند ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور عبد کے درمیان، عبودیت کے ذریعہ تعلق ہے۔ ایسے ہی رحمت خاصہ کے ذریعہ تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب سے زیادہ ہے۔ اس لئے

عبدالرحمٰن، عبدالقادر کے مقابلہ میں زیادہ پسندیدہ ہے۔

چند مکروہ اسماء یہ سب جانتے ہیں ہر انسان متحرک بالارادہ ہے، اور "ہم" ارادہ کی ابتدائی حالت ہے۔ اسی ارادہ پر آدمی کی حرکات مرتب ہوتی ہیں اس وجہ سے ہمام اور حارث سچے نام ہیں کہ جن کے رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ "ملک" رکھنا یہ مکروہ ہے کیونکہ حقیقتاً ملک تو اللہ ہی کے لئے ہے اور اس سے بھی زیادہ مبغوض نام "شاہان شاہ" ہے یعنی ملک الملوک، اور سلطان السلاطین یہ نام سوائے خدا کے کسی کے لئے زیبا نہیں ہیں۔ خدا کے سوا کسی غیر کا یہ نام رکھنا سب سے زیادہ باطل ہے اور اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں کرتا۔

بعض اہل علم نے "قاضی القضاۃ" کو بھی اسی میں داخل کیا ہے، اس لئے کہ قاضی القضاۃ وہی ہو سکتا ہے جس کے فیصلے حق پر مبنی ہوں اور یہ صفت بھی خدا ہی کے لئے سزاوار ہے کیونکہ قرآن پاک میں ہے:۔

اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ — جب وہ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو فرماتا ہے ہو جا، وہ ہو جاتا ہے۔

اسی مکروہ نام کے برابر دوسرا نام "سید الناس" اور "سید الکل" ہے اور یہ نام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

انا سید ولد آدم ولا فخر۔ — اور میں آدم کی اولاد کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں ہے

لہٰذا آپ کے بعد کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں ہے [1]

---

[1] آجکل جہلاء کی طرف سے خطابات رکھنے کی اذلّتی شمشلاً سید الملّت، فخر الاسلام، فخر الملت وغیرہ (باقی ص۳۰۳ پر)

ان کے بعد "حرب" "مُرة" انسانوں کے لئے سب سے بڑے نام ہیں۔ اسی طرح حنظلہ حزن وغیرہ بُرے نام ہیں۔

اسمار انبیار حضرات انبیار علیہم السلام انسانوں میں اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے نام بھی تمام ناموں سے بزرگ تر اور بہتر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے لئے مستحب قرار دیدیا ہے کہ انبیار کے نام رکھو، نسائی نے روایت کیا ہے۔

تسمّوا باسماء الانبیاء۔
انبیار کے نام اختیار کرو

اگرچہ اس میں کوئی خاص مصلحت نہیں ہے، لیکن اتنی بات تو ضرور ہے، جب نام لیا جائیگا توکسی نبی کا ذکر ہوگا، اس تعلق سے انبیار علیہم السلام کی یاد رہے گی اور اس نسبت سے اُن کے اوصاف اور احوال کا بھی تذکرہ ہوتا رہے گا۔

مکروہ اسمار کی شرح بچہ کا نام یسار، افلح، نجیح، رباح کی ممانعت ایک دوسری وجہ سے ہے، ان ناموں میں ایک قسم کی فال ہے، اور فال بھی ایسی جو بُری معلوم ہوتی ہے مثلاً تم نے کسی سے کہا "اعندك يسارٌ"، کیا تیرے پاس یسار ہے؟ یا افلح یا رباح ہے؟ اور جواب میں اس نے کہا نہیں، تو یہ بدفالی ہے (کیونکہ یسار یسر سے بنا ہے اور اس کے معنی آسانی کے ہیں، ایسے ہی افلح، فلاح سے ماخوذ ہے جس کے معنی کامیابی کے ہیں اور رباح کے معنی منافع کے ہیں تو جواب میں لا کہنا، ان چیزوں کا انکار کرنا ہے) اور جو فال لی جاتی ہے کبھی ویسا ہی ہو بھی جاتا ہے اور یہ مقولہ ہے کہ "فال، فال لینے والے پر پڑتی ہے"۔

باقی حاشیہ ص۳۰۲ جاہلوں کی عطا ہیں جو موجودہ خطوب علیہم پر چسپاں نہیں ہوتے۔

حاشیہ صفحہ ہذا مقام غور یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور شعائر کی حفاظت کس قدر ضروری ہے۔

لہذا شارع علیہ السلام جو اپنی اُمت کے لئے رحمت ہیں اُن کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنی اُمت کے لئے مکروہ بات سننا بھی پسند نہیں فرماتے ہیں۔

نام رکھنے میں یہ بھی احتیاط رہنا چاہیئے کہ ایسا نام رکھا جائے جو مناسب ہو اور اس صفت کے نہ ہونے کی صورت میں ذم یا برائی لازم نہ آتی ہو۔ مثلاً "سدید" ایسے آدمی کا نام رکھ دیا جائے جو سخت گیر ہو۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

سموك من جهلهم سديداً۔ — (یعنی جہالت سے تیرا نام سدید رکھ دیا قسم

والله ما فيك من سدادٍ۔ — خدا کی تجھ میں کچھ نرمی نہیں ہے، تو وہ ہے

انتا الذى كون فساداً — جس سے اس فساد والی دنیا میں فساد ہی

فى عالم الكون والفسادِ — فساد ہے۔

اس طرح صرف نام ہی برائی بیان کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے، اور غالباً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے "برۃ" نام رکھنے سے منع کیا ہے (جیسا کہ آیت مبارکہ میں گذر چکا ہے۔ اسی طرح تقی، متقی، مطیع، طائع، راضی، مخلص، منیب، رشید، سدید نام رکھنا مناسب نہیں ہے۔

کنیت جہاں تک کنیت رکھنے کا تعلق ہے، یہ اکراماً اور تعظیماً رکھی جاتی ہے چنانچہ حضور صلعم نے صہیب کی ابویحییٰ، اور حضرت علیؓ کی "ابوتراب" "ابوالحسن" رکھی تھی، اور یہ کنیت آپ کو بہت پسند تھی۔ آپ نے حضرت انسؓ بن مالک کی کنیت جب وہ بچہ ہی تھے "ابوعمیر" رکھی تھی۔ اور کنیت آپ ہر اس آدمی کی رکھ دیتے تھے جس کے بچہ ہو یا نہ ہو۔ آپ نے کنیت رکھنے سے منع نہیں فرمایا۔ صرف ابوالقاسم کنیت رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا۔

تسموا باسمي ولا تكنوا — میرے نام کے ساتھ اپنا نام رکھو

بكنيتي — لیکن میری کنیت نہ رکھو۔

اس میں علماء کے چار قول ہیں :۔

پہلا قول یہ ہے کہ آپ کی کنیت رکھنا کسی حال میں جائز نہیں ہے خواہ کسی کا نام آپ کے ہمنام ہو یا نہ ہو، یہی حکم آپ کی حیات میں تھا اور یہی حکم اب ہے۔ اس حدیث کا یہ عموم بیہقی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے۔ علماء نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہ کنیت اور اسم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے خاص ہے اور بعض نے اس حدیث کی طرف بھی اشارہ کیا ہے :۔

واللہ لا اعطی احداً ولا امنع احداً وانما انا قاسم اضع حیث اُمِرتُ۔	قسم خدا کی میں نہ کسی کو دیتا ہوں اور نہ کسی کو منع کرتا ہوں۔ میں تو صرف قاسم ہوں جہاں کا حکم ہوتا ہے وہیں رکھتا ہوں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صفت کمال درجہ میں صرف آپ ہی کو حاصل تھی۔ دوسرے کو یہ بات حاصل نہیں ہے۔

علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ کسی بچہ کا نام قاسم رکھنا جائز ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ جائز نہیں ہے، جو حضرات جواز کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں یہ نام ہے، کنیت نہیں ہے اور ممانعت کنیت کی وارد ہوئی ہے نام رکھنے کی ممانعت نہیں ہے کہ کسی کا نام قاسم رکھ دیا جائے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ نام اور کنیت دونوں کو جمع نہ کرنا چاہیئے، علیحدہ علیحدہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ابو داؤد نے اس پر ایک باب قائم کرتے ہوئے حضرت جابرؓ کی حدیث روایت کی ہے۔

من تسمّی باسمی فلا یکتنی بکنیتی ومن اکتنی بکنیتی فلا یتسمّ باسمی	جس نے میرے نام کے ساتھ نام رکھا وہ میری کنیت نہ رکھے اور جس نے میری کنیت رکھی وہ میرا نام نہ رکھے

اس حدیث کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث روایت کی ہے، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اپنا نام "محمد ابوالقاسم" نہ رکھے۔ اور یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس قول کے قائلین نے فرمایا ہے کہ نام اور کنیت دونوں کو ایک ساتھ جمع کر دینے میں ایک قسم کی مشارکت ہے حالانکہ یہ خصوصیت ہے حضور صلعم کی لیکن اگر علیحدہ علیحدہ رکھ لیا جائے تو یہ مشارکت نہ رہیگی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ یہی قول امام مالک کا ہے دلیل ان حضرات کی ابوداؤد کی وہ حدیث ہے جو اس نے حضرت علیؓ کا ارشاد نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں

میں نے کہا یا رسول میرے یہاں اگر آپ کے بعد کوئی بچہ پیدا ہو تو
کیا میں اس کا نام، آپ کا نام اور اُس کی کنیت آپ کی کنیت رکھوں
آپ نے فرمایا، ہاں،

ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ ایک عورت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی "میں نے اپنے بچہ کا نام اور کنیت جو آپ کا اسم مبارک اور کنیت شریفہ ہے رکھ لیا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ آپ کو پسند نہیں ہے، تب آپنے ارشاد فرمایا:-

ما الذی احل اسمی وحرم کنیتی — کس نے میرا اسم حلال کیا اور کنیت حرام کی یا
او ما الذی حرم کنیتی وحل اسمی — کس نے کنیت حرام اور اسم حلال کیا۔

بہر حال اس مسلک کے حضرات نے فرمایا ہے جن احادیث میں ممانعت ہے وہ ان دونوں حدیثوں سے منسوخ ہو گئی ہیں۔

چوتھا قول یہ ہے کہ "کنیت ابوالقاسم" رکھنا آپ کی حیات میں منع تھا اور بعد وفات کے یہ ممانعت ختم ہو گئی یہ خصوصیت صرف حیات ہی تک تھی، چنانچہ حضرت انسؓ کی حدیث ہے:-

ایک آدمی نے بقیع میں یا ابا القاسم" کہہ کر پکارا تو آپ اس کی طرف متوجہ
ہوئے تب اس آدمی نے کہا حضور! میری مراد آپ نہیں ہیں بلکہ فلاں

آدمی ہے تب آپ نے ارشاد فرمایا :۔

تسموا باسمی ولا تکنوا بکنیتی — میرے نام کے ساتھ نام رکھو، لیکن میری کنیت نہ رکھو

علماء نے فرمایا ہے کہ حضرت علیؓ کی حدیث میں بھی اسی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس میں ہے "جو بچہ آپ کے بعد پیدا ہو" حضرت علیؓ نے اس بچہ کے بارے میں دریافت نہیں کیا جو آپ کی حیات میں پیدا ہو۔ حضرت علیؓ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ رخصت صرف میرے لئے تھی۔

بعض حضرات کا یہ قول بھی منقول ہے کہ آپ نے اپنا جیسا نام رکھنے سے منع فرمایا ہے لیکن یہ قول قابل اعتماد نہیں ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ نام جائز ہے اور کنیت ممنوع ہے اور دونوں کو جمع کرنا بطریق اولی منع ہے۔ اور حضرت عائشہ کی حدیث غریب ہے اور حضرت علیؓ کی حدیث میں بھی کلام ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے "اس میں ایک قسم کی کمزوری ہے"۔

کنیت ابو عیسیٰ اسلاف اور اخلاف سے منقول ہے کہ کنیت ابو عیسیٰ مکروہ[1] ہے بعض حضرات نے اس کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے لڑکے کو اس وجہ سے مارا کہ اس نے اپنی کنیت ابو عیسیٰ رکھ لی تھی، اور حضرت مغیرہ بن شعبہ نے جب اپنی کنیت ابو عیسیٰ رکھی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "کیا ابو عبداللہ" اپنی کنیت نہیں رکھ سکتے تھے تب انھوں نے عرض کیا کہ حضور صلعم نے ہی میری یہ کنیت "ابو عیسیٰ رکھی ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا حضورؐ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ سنکر اپنی کنیت ابو عبداللہ رکھ لی، اور حضرت عائشہ کی کنیت ام عبداللہ، اور دیگر ازواج کی کنیت ام حبیبہ، ام سلمہ تھی

---

[1] ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ بغیر باپ کے تولد ہوئے تھے، اس وجہ سے یہ معنی حقیقی کے (باقی صفحہ ۳۰۸)

بعض اسمار کی تشریح آپ نے عنب (انگور) کا نام "کرم" رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا "الکرم" مومن کا قلب ہوتا ہے" اور یہ ارشاد اس وجہ سے فرمایا ہے کہ کرم، کثرت خیر پر دلالت کرتا ہے، اس کے لئے مومن کا قلب ہی زیادہ مستحق ہے نہ کہ انگور کا پیڑ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عنب سے شراب بنائی جاتی ہے جو حرام ہے لہذا ایسی شے کا نام کرم رکھنا جس سے حرام چیز پیدا ہوتی ہے ہرگز مناسب نہیں ہے کیونکہ اس طرح حرام کا دروازہ کھلتا ہے واللہ اعلم)

صلٰوۃ عشار کا نام آپ نے ارشاد فرمایا ہے "دیکھو! اعراب تمہاری عشار کی نماز کے نام "عشار" پر غلبہ نہ کرلیں، اس لئے کہ وہ عتمہ کہتے ہیں" اور یہ بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے عشار کی نماز کا نام عتمہ لیا ہے، چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اگر تم لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ نماز عتمہ[1] اور نماز صبح کا
کیا ثواب ہے تو گھٹنوں کے بل چل کر آؤ۔

اس حدیث کے پیش نظر کہا گیا ہے کہ یہ حدیث پہلی والی حدیث کی ناسخ ہے، اور اس کے خلاف بھی منقول ہے لیکن زیادہ درست بات یہ ہے کہ اس بارے میں تاریخ کا علم ہونا دشوار ہے کہ کونسا ارشاد پہلے ہے اور کونسا ارشاد بعد کا ہے بلکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یوں کہا جائے کلیۃً عشار کو عتمہ کہنا درست نہیں ہے کہ "عشا" نام لینا ہی ترک کردیا جائے۔ اس نام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ البتہ کبھی کبھی عتمہ بول دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

باقی حاشیہ صفحہ ۳۰۷ اعتبار سے ہے۔ ورنہ نفس کنیت کے اعتبار سے کوئی مضائقہ نہیں ہے

حاشیہ صفحہ ہذا[1] یہ نام آپ نے بغرض تفہیم اور تعارف لیا تھا۔ بذل

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عبادات کے نام تجویز فرمادیئے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی بہت زیادہ حفاظت فرمایا کرتے تھے۔ اس لئے ان ناموں کو ترک کرکے دوسرے ناموں کو اختیار نہ کیا جائے جیسا کہ متاخرین علماء نے کیا ہے کہ نصوص کے مقابلہ میں اصطلاحی ناموں کو اختیار کرلیا ہے۔ اور یہ فساد کی بات ہے۔

ایسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کی حفاظت فرماتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقدم یا موخر ذکر کیا ہے آپ بھی عمل میں ان کو مقدم یا موخر رکھتے تھے جیسا کہ صفا اور مروہ کی سعی کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اسی سے ابتداء کرو جس سے اللہ تعالیٰ نے ابتداء کی ہے۔

(اللہ تعالیٰ نے سعی کے بارے میں ان الصفا والمروۃ فرمایا ہے، لہٰذا سعی کی ابتداء صفا سے ہونا چاہیئے)

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ٥ — اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر۔

چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

من ذبح قبلها فلا نسك له — جس نے پہلے ذبح کردیا اس کی قربانی نہیں ہے

اور ایسے ہی آپ نے اعضاء وضوء کے دھونے میں پہلے ہاتھ، پھر منہ، پھر سر کا مسح اور پھر پیروں کا دھونا اختیار کیا۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہی ترتیب ہے۔ اور ایسے صدقۃ الفطر کو عید کی نماز سے پہلے مقرر فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى — وہ کامیاب ہوا جس نے زکوٰۃ ادا کی اور خدا کو یاد کیا اور اپنے رب کی نماز ادا کی۔

بہر حال اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

۳۵ پینتیسواں باب

گفتگو، اور آدابِ کلام

آداب کلام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بات چیت اور کلام میں اپنی امت کے لئے بہترین اور ستھرے الفاظ اختیار کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ ایسے الفاظ جو گنواروں اور دیہاتیوں کی سختی سے پاکیزہ ہوتے تھے۔ آپ سخت کلام اور فحش کلام کرنیوالے نہیں تھے۔ آپ نہایت عمدہ اور شریف الفاظ کے ذریعہ اس آدمی کو تخاطب کرنے کو بھی برا جانتے تھے جو اس کا مستحق نہ ہو۔ اور شریف آدمی کی شان میں کمزور الفاظ بولنے کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ لہذا آپ نے منافق کے لئے "یا سیدنا" اے ہمارے سردار[۱] استعمال کرنے کو منع فرمایا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے

فان لم يكن سيداً فقد اسخطتم ربكم — اگر وہ سردار نہیں ہے تو تم نے اپنے رب کو ناراض کیا۔

آپ نے انگور کے پیڑ کا نام "کرم" رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ نے ابوجہل کو "ابو الحکم" والے نام سے یاد کرنے کو منع فرمایا ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ کی کنیت ابی الحکم تھی تو آپ نے بدل کر ابو شریح کردی، اور فرمایا "حکم" تو اللہ ہی کے لئے ہے۔

آپ نے غلاموں کو ادب سکھایا ہے کہ اپنے مالک خواہ مذکر ہوں یا مؤنث، ربی ربتی نہ کہیں اور مالکوں کو ادب سکھایا ہے کہ وہ "عبدی" نہ کہیں بلکہ "فتای، فتاتی" کہیں اور غلام ان کو سیدی اور اگر مونث ہو تو سیدتی کہے۔ اور جو آدمی کہے کہ فلاں

(حاشیہ لے صہ ۳۱۱ پر)

آدمی طبیب ہے۔ آپ نے اس کو ادب سکھایا کہ رفیق کہو، کیونکہ طبیب تو وہ ہے جس نے پیدا کیا ہے۔

جاہلوں کی حالت یہ ہے کہ وہ کفار جن کو علم طبیعت آتا ہے ان کو حکما ء یا حکیم کہتے ہیں، حالانکہ وہ نہایت ہی بدترین مخلوق ہیں (بلکہ اس کو معالج کہنا زیادہ مناسب ہے) ایسے ہی آپ نے فرمایا ہے:-

لا تقولوا ما شاء اللّٰہ وشاء فلان — "اگر اللہ تعالیٰ اور فلاں آدمی چاہے" ایسے الفاظ نہ کہو۔

بلکہ یوں کہنا چاہئے اگر اللہ چاہے اور پھر فلاں آدمی چاہے، ایک آدمی نے جب آپ سے یہی کہا تو آپ نے فرمایا کہ "کیا تو نے مجھے خدا کا شریک سمجھ رکھا ہے" اسی قبیل سے ہے:-

انا باللّٰہ وبک — میں اللہ سے اور تجھ سے چاہتا ہوں

اور ایسے ہی

انا متوکل علی اللّٰہ وعلیک — میں اللہ پر اور تجھ پر بھروسہ رکھتا ہوں۔

اور ایسے ہی

ھذا من اللّٰہ ومنک — یہ اللہ کی اور تیری طرف سے ہے

اور ایسے ہی

واللّٰہ لی فی السماء وانت لی فی الارض — اللہ میرے لئے آسمان میں ہے اور تو زمین میں ہے۔

واللّٰہ وحیاتک — خدا کی قسم اور تیری جان کی قسم۔

۱ے حاشیہ صفحہ ۳۱ ہمارے عرف میں سکھوں کو سردار بولا جاتا ہے، نظر فرمائیے۔

حاشیہ صفحہ ۱ے ہمارے عرف میں جاہل یوں بولتے ہیں، (اوپر خدا ہے اور نیچے تم ہو) یہ کلمہ شرکانہ ہے۔

اور ایسے ہی الفاظ کہ جن کی وجہ سے مخلوق کو خالق کا رتبہ حاصل ہو جاتا ہے " الفاظ مشرکانہ ہیں ان کی سخت ترین ممانعت ہے۔

توہین آمیز الفاظ دوسری قسم کسی ایسے شخص کے بارے میں توہین آمیز الفاظ بولنا جو اس کا مستحق نہیں ہے چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سب دہر" زمانہ کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ زمانہ کو لوٹ بدل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی تو ہے۔ حدیث قدسی میں ہے:۔

یوذینی ابن آدم فیسب	آدم زاد مجھے اس طرح ایذا دیتا ہے کہ زمانہ کو
الدھر وانا الدھر بیدی الامر	گالی دیتا ہے۔ حالانکہ میں زمانہ ہوں اور میرے ہاتھ میں
اقلب اللیل والنھار۔	سب کچھ ہے میں رات دن کو لوٹ بدل دیتا ہوں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "تم میں سے کوئی زمانہ کو برا نہ کہے"۔ اس طرح کہنے میں تین خرابیاں لازم آتی ہیں، ایک تو یہ کہ جو برائی کے لائق نہیں ہے اُس کو برا کہنا کیونکہ زمانہ کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے، اسی کے قبضہ میں سب کچھ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک قسم کا شرک ہے، گالی دینے والا زمانہ کو نفع، ضرر اور عزت دینے کا مالک سمجھتا ہے۔ حالانکہ زمانہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا یہ گمان کرنا سب سے بڑا ظلم ہے ایسے لوگوں کی علامت یہ ہے کہ وہ کثرت سے زمانہ کو گالیاں دیا کرتے ہیں جیسا کہ بہت سے جاہل زمانہ پر لعن، طعن کیا کرتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ زمانہ کو گالی دینا براہ راست خدا کو گالی دینا ہے، کیونکہ ان لوگوں کا گمان یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا، اگر خدا ان کی مرضی کے مطابق کرنے تو زمین اور آسمان میں فساد برپا ہو جائے۔ اور جب لوگوں کی مرضی کے مطابق ہونے لگتا ہے تو زمانہ کی تعریف کرتے ہیں۔ ... . حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دینے والا اور روکنے والا، عزت دینے والا اور ذلیل کرنے والا

نفع دینے والا، اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ زمانہ کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ اس طرح زمانہ کو گالی دینا بالفاظ دیگر خدا کو گالی دینا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں اوپر گذر چکا ہے حاصل کلام یہ ہے کہ زمانہ کو گالی دینے والا دو چیزوں میں سے ایک کا ارتکاب ضرور کرتا ہے یا تو شرک کا یا بدزبانی کا، لہٰذا اگر اس کا یہ اعتقاد ہے کہ زمانہ ہی فاعل حقیقی ہے تو اس عقیدہ کی وجہ سے وہ مشرک ہوا، اور اگر یہ عقیدہ ہے کہ فاعل تو خدا ہی ہے، لیکن اُس نے بُرا کیا تو اُس کی بدزبانی ہوئی۔ ایک دوسری حدیث ہے :-

یوں مت کہو شیطان ہلاک ہو اس سے وہ بہت فربہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے میں نے اُس کو پچھاڑ دیا، بلکہ بسم اللہ کہو اس کے کہنے سے وہ بہت کمزور حتیٰ کہ مکھی کی برابر ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث یہ ہے :-

جب آدمی شیطان کو لعنت کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے اے ابن آدم تو اس کو لعنت کرتا ہے جو خود بخود ملعون ہے۔

اسی قسم کے الفاظ میں سے قبح اللہ الشیطان (اللہ شیطان کا بُرا کرے) اخزی اللہ الشیطان) اللہ شیطان کو ذلیل کرے) ہیں۔ تو شیطان بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے "ابن آدم جانتا ہے کہ یہ سب کچھ میں اپنی قوت سے کرتا ہوں غرضکہ یہ باتیں شیطان کو اور زیادہ موقعہ دیتی ہیں کہ وہ گمراہ کرے اور انسان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں لہٰذا ایسے مواقع کے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ (وہ بجائے یہ الفاظ کہنے کے خدا کو یاد کریں اور اس کی پناہ چاہیں۔ یہ انسانوں کے لئے زیادہ مفید ہے اور شیطان کے لئے مضر ہے۔

بعض نازیبا کلمات

آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو یوں نہ کہے

خبثت نفسی — میرا نفس خبیث ہو گیا ہے۔

بلکہ یوں کہہ سکتا ہے "وقست نفسی" میرا نفس سخت ہو گیا ہے۔ اگرچہ دونوں فقروں کے معنی مفہوم کے اعتبار سے تقریباً ایک ہی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک لفظ زیادہ شدید ہے اس لئے آپ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اسی قبیل سے یہ الفاظ بھی ہیں جن کے بولنے سے آپ نے منع فرمایا ہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے کے بعد یہ نہ کہا جائے۔

لو انی فعلت کذا و کذا — اگر میں ایسا ایسا کرتا (تو ایسا ہوتا)

آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایسا کہنے سے شیطانی اعمال کے لئے دروازہ کھلتا ہے۔ آپ نے ہدایت فرمائی ہے کہ یوں کہنا چاہیے۔

قدر اللہ ما شاء فعل — اللہ قادر ہے اس نے جو چاہا کیا

پہلا کلمہ کہنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "اگر میں ایسا ایسا کرتا تو گویا خدا اپنے فیصلہ کو بدل دیتا، اور یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی فیصلہ کو بدل دے۔ لہذا اس کلمہ میں ایک قسم کا جھل ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو اس جملہ میں قضا و قدر کی تکذیب اور انکار نہیں ہے بلکہ آدمی اپنی تمنا کا اظہار کر رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں ایسا کرتا تو تقدیر الٰہی یہ بھی ہے کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور دشمن پر جہاد کے ذریعہ غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں تقدیر الٰہی کے خلاف نہیں ہیں۔ تو ان سب کا جواب یہ ہے بیشک ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن اس سے نفع قبل واقع ہونے ہی سے ہو سکتا تھا لیکن بعد ہو چکنے کے تو کوئی فائدہ نہیں بلکہ اب بہتر یہی ہے کہ فوت ہونے والے امر کو پھر نئے سرے سے شروع کرے اور محض تمنا کا سہارا لئے نہ بیٹھا رہے کیونکہ یہ ایک قسم کا عجز ہے اور عجز پر اللہ تعالیٰ نے ملامت کی ہے اور "الکیس" کو پسند فرمایا ہے کیس اسباب کو تلاش کرکے اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ اس سے خیر کے دروازے کھلتے ہیں لیکن "عجز" سے تو شیطان کے لئے دروازہ کھلتا ہے اور آدمی باطل تمناؤں میں الجھ جاتا ہے۔ یاد رہے شیطان کا دروازہ، عجز اور کسل ہے"۔ اور دونوں سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

پناہ چاہی ہے۔ یہ دونوں شر کے دروازے ہیں، ان سے حزن، ملال، بخل، قرض کی زیادتی، غلبہ رجال" ہو جاتا ہے۔

عجز اور کسل

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:-

عاجز انسان تمنا کرتا ہے جس سے شیطان کے لئے دروازہ کھلتا ہے، اور عاجز آدمی مفلس ہو جاتا ہے

لہذا تمنا اور عجز افلاس کی جڑ ہیں۔ اور عجز ہر شر اور گناہ کی اصل ہے۔ اس لئے کہ جب آدمی طاعت کے اسباب سے عاجز ہو کر عمل چھوڑ دیتا ہے۔ تو گناہ اس کو آکر دبا لیتے ہیں۔ اس لئے حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں چیزوں سے پناہ چاہی ہے۔ کیونکہ ان دونوں چیزوں میں تمام شرور کے مصادر اور مبادی ابتداء اور انتہاء ہے۔ یہ دونوں برائیاں آٹھ اور دوسری برائیاں پیدا کر دیتی ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعاذہ فرمایا

اللھم انی اعوذبک من الھم والحزن۔ — اے اللہ میں آپ سے حزن و ملال سے پناہ چاہتا ہوں۔

ہَمّ اور حزن دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس لئے کہ کوئی مکروہ چیز قلب میں دو کیفیتیں پیدا کرتی ہیں۔ اگر کسی فوت ہونے والی چیز پر رنج ہے تو اس کو حزن کہتے ہیں اور اندیشہ فردا کو ھم کہتے ہیں اور ان دونوں کی اصل عجز ہے۔ کیونکہ جو گذر چکا وہ حزن سے زائل نہ ہوگا، بلکہ رضا و حمد خدائے پاک، صبر اور تقدیر پر ایمان رکھنے سے دور ہوگا" اور جو چیز آئندہ پیش آنے والی ہے۔ ... ... وہ تدابیر اختیار کرنے سے دور ہوگی ... اور اگر سر دست کوئی تدبیر نہ کر سکتا ہو تو جزع فزع نہ کرے، بلکہ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر بھروسہ کرے اور توکل اختیار کرے اور ہر حال میں راضی برضا رہے۔ ایسا نہ کرے کہ پسندیدہ چیزوں میں تو ربوبیت

کا اقرار اور ناپسندیدہ چیزوں سے انکار، اگر ایسا کرے گا تو خدا بھی اس سے راضی نہ ہوگا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "ہم"۔ "حزن" سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں نقصان زیادہ ہے اس سے عزم میں کمزوری آتی ہے قلب میں کمزوری آتی ہے اور آدمی کوشش کرنے اور آدمی چلنے سے رُک جاتا ہے۔ علم کے لئے حجاب پیدا ہو جاتا ہے اور ہم، حزن آدمی کو ایسے ارادے تک سے روک دیتے ہیں جو کامیابی کے دروازے بنتے ہیں

حزن و ملال

اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت بالغہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں یعنی ہم اور حزن ان ہی قلوب میں پیدا ہوتی ہیں جو قلوب خدا سے اعراض کرتے ہیں، اس کی محبت سے خالی ہیں۔ اس کا خوف دل میں نہیں ہے۔ نہ خدا کی طرف سے اُمید، نہ اس سے انس اور محبت، ایسے قلوب ھموم اور غموم میں مبتلا ہوتے ہیں اور بہت سے آلام قلبیہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ معاصی کی کثرت اور شہوات نفسانیہ میں مبتلا کر دیتے ہیں، ایسے قلوب دنیا ہی میں دوزخ کی کوٹھری بن جاتے ہیں۔ اس دوزخ کی کوٹھری سے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک آدمی اپنے اندر توحید خالص پیدا نہ کرلے۔ اور خدا تعالیٰ سے انس اور محبت پیدا نہ ہو جائے۔ اور یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی کے قلب پر ذکر اللہ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ بدون ذکر کے دلوں کو قوت حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ جب ذکر اللہ ہوتا ہے تو دل میں قوت پیدا ہوتی ہے اور جب انقطاع ہوتا ہے تو دل میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے بہرحال بدون ذکر کے ان امراض اور آلام سے قلب کو نجات نہیں مل سکتی۔ اور بغیر خدا کے آدمی نہ نیکیوں کی طرف پیش قدمی کر سکتا ہے اور نہ گناہوں سے بازرہ سکتا ہے۔ خدا ہی کی طرف سے ایجاد فعل ہے اور اسی کی جانب سے امداد فعل ہے

آدمی کو چاہئے کہ وہ جس مقام اور حال میں ہو خدا کی حمد و ثنا بجالائے۔ خدا ہی کی حکمت سے آدمی پر وہ حال وارد ہوتا ہے سوائے خدا کے کسی غیر کے یہ لائق نہیں ہے

کوئی آدمی کسی کے بگڑے کو سنوار نہیں سکتا ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے منع کرتا ہے اس کے سوائے نہ کوئی دینے والا اور نہ کوئی منع کرنیوالا اور اگر وہ کسی سے کوئی چیز روکے تو وہ ظالم نہیں ہے، بلکہ منع کرنے اور روکنے میں یہ حکمت ہے کہ بندہ خدا کی طرف متوجہ ہو اور اس کے سامنے گڑگڑائے اور اپنے فقر کو اسی کی عطا جانے اور ہر چیز خواہ وہ ذرہ برابر ہو ظاہری ہو یا باطنی اسی کی طرف سے مشاہدہ کرے۔

آدمی کا محتاج اور فقیر ہونا نعوذ باللہ اس کے بخل کی وجہ سے نہیں ہے، اُس کی عطا سے اس کے خزانے میں کوئی نقص نہیں آتا۔ بلکہ اس کے روک لینے اور منع کرنے میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ آدمی اس کے سامنے جتنا تذلل اختیار کریگا وہ اسکو عزت عطا کرے گا، اس کی قدرت اور رحمت میں عزت ہے، اُس کا قہر بھی عنایت ہے اُسکی عقوبت میں تادیب ہے۔ اس کے امتحان میں محبت ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ انسان کو ہرگز یہ زیبا نہیں کہ دیتا وہ اس کی حکمت کے خلاف کرے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی عطا کے مواقع اور محل سے خوب واقف ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس کی رسالت کے لئے کون مناسب ہے۔

كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوٓا أَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنۢ بَيْنِنَآ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۔

ہم نے اسی طرح بعض کو بعض کے ذریعہ آزمایا تاکہ وہ کہیں! کیا ہم میں سے خدا کے احسانات کے یہی مستحق تھے، کیا اللہ تعالیٰ شاکرین کو زیادہ نہیں جانتا (بیشک جانتا ہے)

بیشک اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور عنایات کے مواقع سے خوب واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس کو کیوں محروم کیا ہے۔ اس کی عطا پر بھی حمد ہے اور اس کی عدم عطا پر بھی حمد ہے۔ وہ آدمی سب سے زیادہ بدبخت ہے جو اس سے غافل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہم اور حزن سے استعاذہ کیلئے ہے، اور اس وجہ سے کیا ہے کہ یہ دونوں عجز اور کسل کی جنس سے ہیں۔ جب آدمی کمالات حاصل نہیں کرسکتا تو یہ اس کی عجز کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر قادر ہونے کے بعد بھی حاصل نہیں کرسکتا تو یہ اس کا کسل ہے۔ اور ان دونوں عادتوں کی وجہ سے آدمی بہت سے خیر سے رُک جاتا ہے اور ہر قسم کے شر کا مرتکب ہوتا ہے اسی شر کی ایک قسم یہ ہے کہ آدمی اپنے جسم سے بھی نفع اندوز نہیں ہوسکتا اور اُس کو جبن یا بزدلی کہتے ہیں۔ اور جب مال کے نفع سے رُک جاتا ہے تو وہ بخل کہلاتا ہے۔ ان دونوں بُری عادتوں سے دین اور باطل کو غلبہ ہوجاتا ہے اور غلبہ رجال ہی کو غلبہ باطل کہتے ہیں۔ غرضکہ یہ تمام خرابیاں عجز اور کسل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے سست اور عاجز لوگوں کے لئے جو

حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ — اللہ تعالیٰ مجھے کافی اور وہ اچھا کارساز ہے

کو ہارے کا ہتھیار کے طور پر بولتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔

ان اللہ یلوم علی العجز — اللہ تعالیٰ عاجز کو ملامت کرتا ہے لیکن تمہارے

ولکن علیك بالکیس — اوپر اسباب کا اختیار کرنا لازم ہے

لہٰذا اگر کوئی آدمی اسباب اختیار کرنے اور پوری جدوجہد کرنے کے بعد یہ کلمہ کہے تو اس نے برمحل اس کا استعمال کیا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام پوری جدوجہد کرچکے تھے آخرکار جب کوئی سبب کام نہ آیا اور وہ مجبور ہوگئے تو انھوں نے یہ کلمہ بولا، تو بروقت اور برمحل تھا، اس وقت اس کلمہ کا بھی اثر مرتب ہوا۔ ایسے ہی جب غزوۂ احد میں حضرات صحابہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو اپنے

احد سے لوٹنے کے بعد ارشاد فرمایا:۔

کفار مکہ ایک جگہ جمع ہیں تم ڈرتے ہو (بلکہ) ان سے

ملاقات (جنگ) کے اسباب مہیا کرو اور نکلو!

اُس وقت حضرات صحابہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب استطاعت سامان کرلینے کے بعد یہ کلمہ فرمایا۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ — اللہ ہمیں کافی اور وہ بہترین کارساز ہے

چنانچہ اس وقت یہ کلمہ برمحل ہوا اور اس نے اپنا بروقت اثر دکھلایا۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے

مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے نکلنے کی راہ کر دیتا ہے اور جہاں سے گمان بھی نہ ہو وہاں سے اُس کو رزق دیتا ہے اور جو اللہ پر اعتماد کرتا ہے اللہ اُس کے لئے کافی ہے۔

توکّل کیا ہے؟ توکّل تقویٰ کے بعد فراہمی اسباب کرنے کے بعد ہوتا ہے اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کفایت کرتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

اور اللہ سے ڈرو! اور مومنین کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

لہٰذا توکل اور "حسب" بدون فراہمی اسباب ماموربہا کے عجز ہے۔ اور اگر عجز کی حالت میں کچھ توکل کی آمیزش ہو جائے تو وہ عاجزانہ توکل ہے اور بندے کے لئے ایسا توکل اختیار کرنا جس میں عجز بھی ہو مناسب نہیں ہے بلکہ توکل کامل تمام ماموربہا اسباب کی فراہمی کے بعد ہوتا ہے۔

اس مسئلہ میں دو جماعتیں ہوگئی ہیں، جن سے غلطی ہوئی ہے۔ ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ توکل محض بھی ایک سبب ہے اور حصول مراد کے لیئے کافی ہے۔ اس جماعت نے توکل کے لیئے اسباب کو معطل کر دیا ہے، اس طرح یہ لوگ تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ یہ حضرات تنہا توکل ہی میں ایک قسم کی قوت مانتے ہیں۔ یہ تسلیم کہ اس قسم کے توکّل میں بھی قوت ہوتی ہے، لیکن یہ توکل ضعیف قسم کا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے توکل کا محل تو اسباب ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کاشتکار زمین کو جوت کر بیج ڈالتا ہے، اس کے بعد پیداوار میں خدا کے اوپر توکل کرے تو یہ اعلیٰ درجہ کا توکل ہے۔ ایسے ہی مسافر کا توکل ہے، اگر چلنے اور مسافت طے کرنے میں کوشش کرے اور پھر منزل حاصل ہونے پر خدا پر بھروسہ کرے تو یہ اعلیٰ درجہ کا توکل ہے۔ اسی توکل پر اثر مرتب ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کفایت کرتا ہے اور توکل عجز پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، اور نہ اللہ تعالیٰ ہی کفایت کرتا ہے۔

دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ اسباب ہی اصل ہیں، ان کو جس قدر حاصل کیا جائے کرنا چاہیئے۔ اور کچھ نہیں۔ یہ لوگ اگرچہ اسباب کی بنا پر عارضی طور پر مراد کو حاصل کریں لیکن ان کو تائید اور نصرت خداوندی حاصل نہیں ہوتی، اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا دفاع ہوتا ہے۔ انجام کار ان لوگوں کو رسوائی ہوتی ہے اور ایسے لوگ نامراد رہتے ہیں، پوری قوت تو اللہ پر توکل کرنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

بعض بزرگوں نے کہا ہے، اگر کوئی آدمی سب سے زیادہ قوی بننا چاہے تو اس کو توکل اختیار کرنا چاہیئے۔ بس قوت متوکل کو حاصل ہوتی ہے اور اسی کا دفاع ہوتا ہے یہ قوت اسی درجہ کم ہوتی چلی جائے گی، جس درجہ کا تقویٰ کم ہوگا، لیکن اگر دونوں چیزیں موجود ہوں یعنی توکل بھی اور تقویٰ بھی، پھر ارشاد ربانی کے مطابق بے گمان جگہ سے رزق ملتا ہے، اور راہ نجات کھلتی ہے۔ مختصر یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی

"حسبی اللہ نعم الوکیل" کی غرض وغایت یہ ہے کہ آپ نے بندوں کو اس چیز کی ہدایت فرمائی ہے جس میں غایت درجہ کا کمال ہے اور مطلوب کا حاصل ہونا یقینی ہے اس لئے انسان کو چاہیئے کہ نفع والی چیزوں کے لئے کوشش کرے اور اپنی جدوجہد کو اس کے حصول پر خرچ کرے، اسی وقت اس کو

"حسبی اللہ ونعم الوکیل

کہنا مفید ہوگا، اور اللہ تعالیٰ بھی اسی وقت کفایت کرے گا۔ بخلاف عاجزین کے جو کوتاہی کرتے ہیں اور تمام مصالح کو ختم کر دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں "حسبی اللہ ونعم الوکیل" تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ملامت کرتا ہے۔ اور ان کی کوئی نصرت نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفایت اور نصرت ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو تقویٰ اختیار کرتے اور توکل کرتے ہیں لہ

لہ ۔ توکل کے اوپر علامہ نے نہایت ہی مبسوط اور محکم بحث کی ہے۔ اس سے اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ عام انسانوں کو جب توکل کا تعارف کرایا جائے گا، اور اسکی ترغیب دی جائے گی تو یہی کہا جائے گا، اور ہم ایسا ہی توکل اختیار کرنے کے مکلف ہیں لیکن اسی کے ساتھ ایک دوسرے طریقہ پر بھی غور کرنا فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔

دنیا میں ہم جن چیزوں کو اسباب کہتے ہیں وہ امر الٰہی کے آثار اور نشان ہیں، مثلاً کسی شخص کے بارے میں امر خداوندی ہوا کہ اس کو حکومت حاصل ہو جائے۔ تو دنیا میں اس کے اثرات رونما ہونے لگتے ہیں۔ اور شخص معین ایسی راہ کو اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی اثرات ہماری اصطلاح میں اسباب کہلاتے ہیں۔ انسان کی فلاح اور کامیابی اور سعادت اسی میں ہے کہ وہ ان اثرات یا اسباب کو خدا کی عطا جانے اور اختیار کرے۔ اور چونکہ یہ اثرات یا اسباب بھی مخلوق ہی ہیں اس لئے قلب کی توجہ کو ان سب کے باوجود خدا سے وابستہ رکھے، اسی وابستگی کا نام توکل ہے اور اس کے ظاہری (باقی ۳۲۲ پر)

(باقی ص۳۲۱) اجزاء (مذکورہ شرط کے ساتھ) یہی اثرات اور اسباب ہیں۔

یاد رہے کہ انعام اور عتاب، عزت اور ذلت کے فیصلے انسانی اعمال پر ہوتے ہیں اور عمل خالص کی بنیاد تقویٰ ہے۔اسی پر نزول رحمت ہوتا ہے۔ اور انعام و عزت کا امر ہوتا ہے اور پھر ویسے ہی اثرات اور اسباب ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ جو بندے کلیتہً اعراض عن المخلوق اور کلیتہً توکل علی اللہ اختیار کرتے ہیں وہ خواص کا توکل ہے جو مذموم نہیں بلکہ محمود ہے۔ وہ توکل حاصل ہونے کے بعد اس عالم کون و فساد کی اشیاء کی تاثیرات اس توکل کے سامنے بدل جاتی ہیں۔ مثلاً:

نارِ نمرود کو کیا گلزار   دوست کو یوں بچا لیا تو نے

بہرحال یہ شان بھی ہے اور وہ حالت بھی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ بس اشارہ کرنا کافی ہے، ورنہ مفصل کلام کرنے کے لیے بہت اوراق درکار ہیں۔

چھتیسواں باب ۳۶

اذکار ___ اور ___ دُعائیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کا ذکر ساری مخلوق سے زیادہ کرتے تھے بلکہ آپ کا تمام کلام ذکر اللہ ہی تھا۔ آپ کے اوامر اور نواہی اور احکامات ذکر اللہ ہی پر مشتمل تھے۔ آپ نے اُمت کو اللہ تعالیٰ کے اسماء، صفات، احکام، افعال، وعدے اور وعیدیں سب سے خبردار کیا۔ آپ نے اُمت کو، خدا کی نعمتوں پر نثار کرنا، اسکی تسبیح تحمید، تمجید، کرنی سکھائی، اس سے مانگنا، دعا کرنا، اس کی طرف رغبت کرنا، اس سے خوف کرنا بتلایا، حضور صلعم کی خاموشی اور گویائی سب ذکر ہی تھی آپ سانس کے ساتھ کھڑے بیٹھے ہر حال میں خدا کا ذکر کرتے تھے۔[۱]

بیدار ہونے کی دُعا، جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تو فرماتے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ۔ حمد اس خدا کی جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف اُٹھنا ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں جب آپ رات کو اُٹھتے تو اللہ اکبر ۱۰ مرتبہ، الحمد للّٰہ ۱۰ مرتبہ، سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ ۱۰ مرتبہ، سبحان الملک القدوس ۱۰ مرتبہ استغفر اللّٰہ ۱۰ مرتبہ، لا الٰہ الا اللّٰہ ۱۰ مرتبہ پڑھتے اور پھر فرماتے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ضِیْقِ الدُّنْیَا وَضِیْقِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ اے اللہ میں تجھ سے دنیا کی اور قیامت کے دن کی تنگی سے پناہ چاہتا ہوں۔

---

[۱] (ملاحظہ حاشیہ ۳۲۵ پر ملاحظہ فرمائیے)

اس کے بعد آپ نماز شروع فرما دیتے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ آپ جب رات کو بیدار ہوتے تو یہ بھی پڑھا کرتے تھے:۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ	خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے اے اللہ
اَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِيْ وَاَسْاَلُكَ رَحْمَتَكَ	میں تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں، اور
اَللّٰهُمَّ زِدْنِيْ عِلْمًا وَلَا تُزِغْ قَلْبِيْ	تجھ سے تیری رحمت مانگتا ہوں، اے اللہ میرے علم
بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنِيْ وَهَبْ لِيْ مِنْ	میں اضافہ کر اور میرے دل کو ہدایت کے بعد ٹیڑھا نہ کر
لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔	اور اپنے پاس سے مجھے رحمت عطا کر، بیشک تو

عطا کرنے والا ہے۔

ان دونوں حدیثوں کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے بیدار ہو کر لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کلِّ شیئٍ قدیر، الحمد للہ، سبحان اللہ، لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلیّ العظیم کہا اور پھر اللّٰھم اغفرلی کہا اور دعا کی اس کی دعا قبول ہوگی اور اگر وضو کر کے نماز پڑھی تو اس کی نماز قبول ہوگی۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے۔ ایک رات میں آپ کے پاس سو رہا تھا جب آپ بیدار ہوئے، تو آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور سورہ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں (یعنی اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ سے لیکر آخر تک) اس کے بعد آپ نے یہ پڑھا:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ	اے اللہ تیری حمد ہے اور تو ہی زمین و
نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ	آسمان کا نور ہے۔ اور جو کچھ ان میں ہے، اور

حاشیہ صفحہ ۳۲۲ ؎ صوفیوں کی اصطلاح میں یہ ذکر پاس انفاس کہلاتا ہے۔

ولكَ الحمدُ انتَ قيّمُ السمٰوات والارضِ ومَن فيهنّ ولكَ الحمدُ انتَ الحقُّ ووعدُكَ الحقُّ وقولُكَ الحقُّ ولقاؤكَ حقٌّ والجنّةُ حقٌّ والنارُ حقٌّ والنبيّونَ حقٌّ ومحمّدٌ حقٌّ والساعةُ حقٌّ اللّٰهمّ لكَ اسلمتُ وبكَ آمنتُ وعليكَ توكلتُ واليكَ انبتُ وبكَ خاصمتُ واليكَ حاكمتُ فاغفر لي ما قدّمتُ وما اخّرتُ وما اسررتُ وما اعلنتُ انتَ الٰهي لا اله الا انت ولا حولَ ولا قوّةَ الا باللهِ العليِّ العظيمِ۔

تیری حمد ہے، اور تو ہی آسمانوں اور زمین کا قیم ہے اور جو کچھ ان میں ہے اور تیری حمد ہے اور تو ہی حق ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تیرا قول اور تیری ملاقات جنت، دوزخ سب حق ہے۔ انبیا حق ہیں اور محمد حق ہے اور قیامت حق ہے اور میں تیرا تابعدار ہوں اور تجھ پر ایمان لایا ہوں اور تجھ ہی پر بھروسہ کرتا ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں اور تیری وجہ سے لڑتا ہوں اور تجھ ہی کو حکم مانتا ہوں سب مجھے معاف فرما جو کچھ میں نے پہلے کیا اور بعد میں کیا، اور جو کچھ چھپایا اور جو کچھ ظاہر کیا تو ہی میرا معبود ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں اللہ تعالیٰ عظیم و برتر کی قوت کے علاوہ کسی کی قوت نہیں ہے

حضرت عائشہ فرماتی ہیں، جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اُٹھتے تو یہ بھی پڑھا کرتے تھے:

اللّٰهمّ ربَّ جبرئيلَ وميكائيلَ واسرافيلَ فاطرَ السمٰوات والارضِ عالمَ الغيبِ والشهادةِ انت تحكمُ بينَ عبادِكَ فيما كانوا فيه يختلفونَ اهدني لما اختلف فيه من الحقِّ باذنِكَ انّكَ تهدي من تشاءُ الى صراطٍ مستقيمٍ۔

اے اللہ تو رب جبرئیل، میکائیل، اسرافیل کا پھاڑنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا جانتا ہے غیب کو اور ظاہر کو تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ مختلف ہیں۔ الٰہی مجھے اس حق کی طرف ہدایت کر جس میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، اپنے ہی حکم سے اور تو جسکو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے

بعض روایات میں حضرت عائشہؓ نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ بعض اوقات اس کو ابتدائے نماز میں بھی پڑھتے تھے اور آپ وتر ختم کرنے کے بعد تین مرتبہ سبحان الملک القدوس پڑھتے تھے اور آخری مرتبہ آواز کو کھینچ کر پڑھتے تھے:۔

گھر سے باہر تشریف لانیکی دعا

آپ جب گھر سے باہر تشریف لاتے تو یہ پڑھتے:۔

بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ	اللہ کے نام کے ساتھ۔ میں اللہ پر بھروسہ
اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ	کرتا ہوں، اے اللہ میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں
اُضَلَّ اَوْ اَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَظْلِمَ	کہ بھٹکوں یا بھٹکایا جاؤں پھسلوں یا پھسلایا جاؤں
اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیَّ۔	ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں یا کوئی مجھے جہل میں مبتلا کرے۔

یہ صحیح حدیث ہے آپ نے ارشاد فرمایا، جب کوئی گھر سے نکلے اور یہ کہے:۔
بسم اللہ توکلت علی اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ، تو کہا جاتا ہے تجھے ہدایت دی گئی۔ تیری کفایت اور حفاظت کی گئی اور تجھ سے شیطان کو دور کر دیا گیا

حضرت ابن عباسؓ نے اس رات کی بات نقل کی ہے کہ جس دن وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سوئے تھے، کہ جب آپ صبح کی نماز کے لئے تشریف لے جانے کے لئے نکلے تو یہ پڑھ رہے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا	اے اللہ میرے دل میں نور کر دے
وَاجْعَلْ فِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا	اور میری زبان میں نور کر دے
وَاجْعَلْ فِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا	اور میرے کان میں نور کر دے
وَاجْعَلْ فِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا	اور میری آنکھ میں نور کر دے
وَاجْعَلْ مِنْ خَلْفِیْ نُوْرًا	اور میرے پیچھے نور کر دے
وَمِنْ اَمَامِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ	اور میرے سامنے نور کر دے

مِنْ فَوقِیْ نُوراً وَّاجْعَلْ — اور میرے اوپر نور کر دے

مِنْ تَحْتِیْ نُوراً اَللّٰھُمَّ — اور میرے نیچے نور کر دے

اَعْظِمْ لِیْ نُوراً۔ — اے اللہ میرے لئے بہت بڑا نور کر دے

حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو آدمی گھر سے نماز کے لئے نکلا اور اس نے یہ دعا پڑھی:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِیْنَ عَلَیْكَ فَاِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ بَطَراً وَّلَا شَرًّا وَلَا رِیَاءً وَّلَا سُمْعَةً وَّاِنَّمَا خَرَجْتُ اِتِّقَاءَ سَخَطِكَ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ اَسْئَلُكَ اَنْ تُنْقِذَنِیْ مِنَ النَّارِ وَاَنْ تَغْفِرَ لِیْ ذُنُوبِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اَنْتَ۔

اے اللہ سائلین کا تجھ پر حق ہے اس کے واسطے سے سوال کرتا ہوں، میں اکڑ اور شرارت کے لئے اور دکھانے سُنانے کے لئے نہیں نکلا میں تو آپ کی ناراضگی سے بچنے اور آپ کی طلب رضا کے لئے نکلا ہوں میں آپ سے اپنا دوزخ سے چھٹکارا مانگتا ہوں آپ میرے گناہ معاف کر دیجئے۔ آپ کے سوا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔

تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے اس کے لئے استغفار کرنے کے لئے مقرر فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ رحمت کے ساتھ اس کی طرف ... ... اس وقت تک متوجہ رہتا ہے جب تک وہ نماز سے فارغ ہوتا ہے۔

مسجد میں داخل ہونا

ابو داؤد نے روایت کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے:۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِیْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِیْمِ مِنَ — میں نہایت ہی عظیم خدا اور اس کے کرم والے چہرے اور اُسکی قدیم قدرت کے ذریعہ شیطان

الشیطانِ الرجیم۔ مردود سے پناہ چاہتا ہوں۔

آپ نے ارشاد فرمایا جب کوئی یہ پڑھتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ یہ شخص پورے دن کے لئے محفوظ ہو گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود صلوٰۃ بھیجنے کے بعد یہ کہنا چاہئے۔

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِی اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ اے اللہ میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھولدے

اور جب مسجد سے باہر نکلے تو اُس کو یہ پڑھنا چاہیئے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ اے اللہ میں آپ سے آپ کا فضل مانگتا ہوں

اور آپ سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو درود شریف کے بعد یہ دُعا پڑھے

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِی ذُنُوبِی وَافْتَحْ لِی اے اللہ میرے گناہ معاف فرما اور میرے

اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ۔ لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے

اور جب نکلے تو درود شریف کے بعد یہ دعا پڑھے:۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِی ذُنُوبِی وَافْتَحْ لِی اے اللہ میرے گناہ معاف فرما اور میرے

اَبْوَابَ فَضْلِكَ ۔ لئے اپنے فضل کے دروازے کھولدے۔

صبح و شام کی دعا

صبح کی نماز کے بعد آپ سورج نکلنے تک اپنی نماز کی جگہ بیٹھے رہتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ بِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ اَمْسَیْنَا وَبِكَ نَحْیَا وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَیْكَ النُّشُوْرُ۔ اے اللہ ہم نے تیرے کرم سے صبح کی اور تیرے کرم سے شام کی، تجھ ہی سے ہماری زندگی اور تجھ ہی سے ہماری موت ہے اور اُٹھ کر جانا ہے۔

صحیح حدیث کی دعا یہ ہے:۔

اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ ہم نے اور اللہ کے ملک نے صبح کی، اللہ ہی

لله ولا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ. لہٗ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کلّ شیءٍ قدیرٌ ربّ اسئلک خیر ما فی ھذا الیوم وخیر ما بعدہٗ واعوذبک من شرّ ھذا الیوم وشرّ ما بعدہٗ ربّ اعوذبک من الکسل و سوء الکبر ربّ اعوذبک من عذابٍ النار واعوذبک من عذابٍ فی القبر۔

کی تعریف ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اکیلا ہے وہ اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے اسی کا ملک ہے اور اسی کی حمد ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے رب اس دن میں اور اس کے بعد جو خیر ہے اُس کو مانگتا ہوں اور اس دن میں اور اس کے بعد جو شر ہے اس سے پناہ چاہتا ہوں۔ اے رب میں آپ سے سستی اور برے بڑھاپے سے اور دوزخ میں عذاب سے اور قبر میں عذاب سے پناہ مانگتا ہوں۔

اور جب شام ہوتی تو یہ دعا پڑھتے۔ اَمسَینَا وَاَمسَی المُلکُ الخ امام مسلم نے ذکر کیا ہے کہ آپ سے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے عرض کیا کہ آپ مجھے صبح شام پڑھنے کے لئے چند کلمات تعلیم فرما دیجئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اللّٰھُمّ فاطر السمٰوات والارض عالم الغیب والشھادۃ ربّ کلِ شیءٍ وملیکہٖ وما لکہٖ اشھد ان لاّ الٰہ انت اعوذبک من شرّ نفسی وشرّ الشیطان وشرکہٖ وان اقترف علیٰ نفسی سوءً اواجرہٗ علیٰ مسلم۔

آپ نے ارشاد فرمایا یہ صبح شام اور جب بستر پر لیٹا کرو پڑھ لیا کرو۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی ہر دن کی صبح اور رات کی شام، تین مرتبہ یہ پڑھ لیا کرے ۔

بسم اللہ الذی لا یضرّ مع اسمہٖ شیءٌ فی الارض

ولا فی السماءِ اِنّہٗ ھو السمیعُ العلیمُ۔

تو اس کو کوئی چیز ہرگز نہ پہونچ سکے گی، اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو کوئی ہر صبح و شام یہ پڑھ لیا کرے:-

رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبالاسلامِ دِیناً وبمحمدٍ نبیًّا

تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ اس سے راضی ہو جائے۔ اس کو امام ترمذی اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی صبح و شام یہ دعا پڑھ لیا کرے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَصْبَحْتُ اُشْھِدُکَ وَ اُشْھِدُ حَمَلَۃَ عَرْشِکَ وَمَلٰئِکَتَکَ وَجمیعَ خَلْقِکَ اَنّکَ انت اللّٰہُ الّذی لَا اِلٰہَ اِلّا انت وَاَنَّ محمدًا عبدُکَ ورسولُکَ	اے اللہ میں نے صبح کی میں تجھے اور تیرے حاملین عرش، اور فرشتوں اور تیری تمام کائنات کو گواہ بناتا ہوں کہ تو وہ ہے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمدؐ تیرے بندے اور رسول ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے آزاد اور دور کر دیتا ہے۔ اگر دو مرتبہ کہا تو وہ آدھا آزاد ہو جاتا ہے، یہ حدیث حسن ہے۔ اور جس نے صبح ہوتے ہی یہ دعا پڑھی۔

اَللّٰھُمَّ مَا اَصْبَحَ بِی مِنْ نِعمَۃٍ اَوْ بِاَحَدٍ مِّنْ خَلْقِکَ
فَمِنْکَ وَحْدَکَ لَا شَرِیکَ لَکَ، لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

تو گویا اس نے اس دن کا شکریہ ادا کر دیا اور جس نے شام ہوتے ہی یہ دعا پڑھی تو اس نے اس رات کا شکر ادا کر دیا۔ یہ حدیث حسن ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم صبح و شام یہ دعا بھی مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ العَافِیَۃَ فِی الدُّنیا والآخرۃِ
اللّٰھم اِنّی اَسْئَلُکَ العَفْوَ والعافیۃَ فی دینی
ودُنیایَ واَھلی ومَالِی، اللّٰھم اسْتُرْ عَوْرَاتِی

وَاِنْ نَّغْتَالَ ... اللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ
وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ یَمِیْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ
اَعُوْذُ بِعَظَمَتِکَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ

اس حدیث کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے، اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ آپ نے اپنی کسی صاحبزادی سے ارشاد فرمایا کہ صبح کو یہ دعا پڑھ لیا کرو:-

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ
الْعَظِیْمِ مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَاءْ لَمْ یَکُنْ
اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَاَنَّ اللّٰہَ
قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا۔

جس نے اس دعا کو صبح کو پڑھا وہ شام تک محفوظ رہا اور جس نے شام کو پڑھا وہ صبح تک محفوظ رہا۔ آپ نے ایک انصاریؓ سے فرمایا کہ میں تجھے چند ایسے کلمات بتلاتا ہوں اگر تو ان کو پڑھے گا تو تیری پریشانیاں دور ہوں گی اور تیری مراد پوری ہوگی۔ اور تیرا قرض ادا ہوگا۔ آپ نے فرمایا صبح و شام یہ پڑھ لیا کرو

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْھَمِّ	اے اللہ میں آپ سے ھَمّ، حزن، عجز، کسل
وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعَجْزِ	بزدلی، بخل اور قرضہ کی زیادتی
وَالْکَسَلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْجُبْنِ	اور لوگوں کے غلبہ سے پناہ
وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ غَلَبَۃِ الدَّیْنِ	مانگتا ہوں۔
وَقَھْرِ الرِّجَالِ۔	

ان انصاریؓ نے کہا کہ میں نے ان کو پڑھنا شروع کیا تو میری پریشانیاں دور ہو گئیں اور میرا قرض ادا ہو گیا[1]

---

[1] واضح رہے اس قسم کی دعاؤں میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کے پڑھنے کے بعد (باقی صفحہ ۳۳۲ پر)

اور آپ سے صبح کو یہ دعا پڑھنا بھی ثابت ہے:۔

اَصْبَحْنَا علی فِطْرَۃِ الاسلام	ہم نے فطرت اسلام، کلمہ اخلاص
وکلمۃِ الاخلاص وعلی دِینِ نبیّنا	اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین
محمّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم و	پر اور اپنے والد ابراہیم کی ملت پر جو
علی ملّۃِ اَبِینَا ابراھیم حنیفاً	حنیف تھے. مشرکین میں سے نہیں
مسلمًا وما کان من المشرکین۔	تھے صبح کی۔

اور حدیث شریف میں اسی طرح ہے۔ اور لفظ " دین نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم " پر بعض لوگوں کو اشکال ہوا ہے تو اس کا اور اس کے ہم مثل کا حکم یہ ہے کہ جیسا کہ خطبہ اور تشہد صلوٰۃ میں ہے " اشہد ان محمداً رسول اللہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے مکلف تھے کہ وہ اپنی رسالت پر ایمان رکھیں کہ وہ مخلوق خدا کی طرف رسول ہیں اور آپ پر یہ وجوب اُمت کے اس وجوب سے بڑا ہے پس وہ نبی الامت ہیں کہ ان ہی میں سے ہیں، پس وہ اپنی ذات کے لئے بھی رسول ہیں اور اُمت کے لیے بھی رسول ہیں، آپ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا صبح و شام یہ پڑھ لیا کرو:۔

یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ بِكَ اَسْتَغِیْثُ فَاَصْلِحْ لِی شَانِیْ

وَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِی طَرْفَۃَ عَیْنٍ۔

اس کے پڑھنے سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی۔ آپ صبح کے وقت یہ دعا بھی پڑھا کرتے تھے

باقی حاشیہ صفحہ ۳۳۱ ان کی برکتوں سے آدمی میں حرکت اور خیر کا ارادہ پیدا ہوتا ہے جب عمل کا داعیہ پیدا ہو تو عمل کرنا چاہیے اور داعیہ کو دبانا نہیں چاہیے ورنہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پھر دعاؤں کا قصور نہیں اپنا قصور ہوگا۔ دعاؤں کے ساتھ عمل اور حرکت ضروری ہے، جیسا کہ توکل کی بحث میں گذر چکا ہے۔

اللھم انی اسئلک علماً نافعاً وعملاً متقبلاً ورزقاً طیباً۔ — اے اللہ میں آپ سے علم نافع، مقبول عمل، اور حلال روزی مانگتا ہوں۔

آپ نے ارشاد فرمایا، جو کوئی صبح و شام تین مرتبہ یہ کلمات پڑھ لیا کرے:۔

اللھم انی اصبحت منک فی نعمۃٍ وعافیۃٍ
وستر فاتمم علیّ نعمتک وعافیتک وسترک
فی الدنیا والاخرۃ۔

تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ ان چیزوں کو اس پر پورا کر دے آپ نے ارشاد فرمایا جو کوئی صبح و شام سات مرتبہ یہ پڑھ لیا کرے۔ حسبی اللہ لا الٰہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم، تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت کے امور میں کفایت کرے گا۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا، جو کوئی صبح و شام ان کلمات کو پڑھ لیا کرے تو اس کو کوئی مصیبت آکر نہیں گھیرے گی، وہ کلمات یہ ہیں:۔

اللھم انت ربی لا الٰہ الا انت علیک توکلت
وانت ربّ العرش العظیم ماشاء اللہ کان
وما شاء لم یکن لا حول ولا قوۃ الا باللہ
العظیم اعلم ان اللہ علی کل شیئ قدیر وان
اللہ قد احاط بکل شیئٍ علماً۔
اللھم انی اعوذ بک من شر نفسی وشر کل دابۃ
انت اٰخذ بناصیتھا ان ربی علی صراطٍ مستقیمٍ۔

سیّد الاستغفار

جب حضرت ابو درداءؓ کو خبر دی گئی کہ آپ کا گھر جل گیا ہے تو فرمایا نہیں۔ اللہ تعالیٰ ۔۔۔ ان کلمات کے طفیل میں ایسا ہرگز نہیں کرے گا جن کو میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

اور فرمایا سید الاستغفار یہ ہے:۔

اَللّٰھُمَّ انت ربی لا الٰہ الا انت خلقتنی و انا
عبدک و انا علی عھدک و وعدک ما استطعت
اعوذبک من شر ما صنعت ابوء لک بنعمتک
علی و ابوء بذنبی فاغفر لی انہ لا یغفر الذنوب
الا انت۔

جس آدمی نے اس کو یقین کے ساتھ پڑھا، اگر اس دن وہ مرگیا تو جنت میں داخل ہوگا اور اگر شام کو اسی یقین کے ساتھ پڑھا اور اس رات میں مرگیا تو جنت میں داخل ہوگا۔ اور جس آدمی نے صبح و شام سبحان اللہ وبحمدہٖ سو مرتبہ پڑھا، قیامت کے دن اس سے زیادہ افضل عمل والا اجر اُس کے کوئی نہ ہوگا مگر وہی جس نے ان کلمات کو کچھ زیادہ پڑھا اور فرمایا جس نے صبح کو دس مرتبہ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ، لہٗ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیئٍ قدیر پڑھا، اس کے لئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور یہ دس غلام آزاد کرنے کے برابر ہے۔ اور وہ آدمی تمام دن شیطان مردود سے محفوظ رہے گا، اور جس نے شام کو پڑھا تو اس کے لئے صبح تک ایسے ہی ہے اور جس نے صبح کو ان کلمات کو سو مرتبہ پڑھا تو یہ دس غلاموں کے آزاد کرنے کے برابر ہے اور اس سے کوئی آدمی اجر میں نہ بڑھ سکے گا، مگر وہی جس نے ان کو کچھ زیادہ پڑھا، اور مسند وغیرہ میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت کو یہ کلمات سکھائے اور فرمایا کہ تمہارے گھر والے ہر صبح ان کے پڑھنے کا معمول بنالیں:۔

لبیک اللّٰھم لبیک وسعدیک والخیر
فی یدیک و منک والیک اللّٰھم ما قلت
من قولٍ او حلفت من حلفٍ او نذرت

من نذر فمشيئتك بين يدي ذلك كله ما
شئت كان وما لم تشاء لم يكن ولا حول ولا قوة
الا بك انك على كل شيئ قدير۔ اللهم ما صليت
من صلوٰة فعلى من صليت وما لعنت من
لعنة فعلى من لعنت، انت ولِيّ في الدنيا
والاخرة توفني مسلمًا والحقني بالصالحين
اللهم فاطر السموات والارض عالم الغيب
والشهادة ذو الجلال والاكرام فاني اعهد
اليك في هٰذه الحيٰوة الدنيا واشهد لك و
كفى بك شهيدًا اني اشهد ان لا اله الا انت
وحدك لا شريك لك، لك الملك ولك الحمد
وانت على كل شيئ قدير۔ واشهد ان محمدًا
عبدك ورسولك واشهد ان وعدك حق
ولقاءك حق والساعة حق اٰتية لا ريب فيها
وانك تبعث من في القبور وانك لا تكلني الى
نفسي ان تكلني الى ضعف وعورة وذنب
وخطيئة واني لا اثق الا برحمتك فاغفرلي
ذنوبي كلها انه لا يغفر الذنوب الا انت
وتب عليّ انك انت التواب الرحيم۔

لباس وغیرہ کی دعائیں

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی جدید
کپڑا پہنتے تو یہ دعا پڑھتے :۔

اللّٰھُمَّ لَکَ الحمد انت کسوتنیہ — اے اللہ تیری ہی حمد ہے اور تو نے ہی اسے
اَسْئَلُکَ خیرہٗ وخیر ما صنع لہ — مجھے پہنایا ہے میں تجھ سے اس کی بھلائی اور جس
واعوذبک من شرہٖ وشر ما صنع لہ۔ — لئے یہ بنایا ہے اُس کی بھلائی مانگتا ہوں اور اس
کے شر اور جس لئے یہ بنا ہے اُسکے شر سے آپکی پناہ چاہتا ہوں

یہ حدیث صحیح ہے، اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا جس نے کپڑا پہننے کے بعد یہ پڑھا

الحمد للہ الذی کسانی ھذا ورزقنیہ من
غیر حول منی ولا قوۃ۔

تو اللہ تعالیٰ اس کے سب گذشتہ گناہ معاف کر دیتا ہے۔ جامع ترمذی میں ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ نے فرمایا جس نے جدید کپڑا پہننے کے بعد یہ پڑھا،

الحمد للہ الذی کسانی ما اداری بہ عورتی
وَاَتجمّلُ بہٖ فی حیاتی۔

اور کپڑا پرانا ہونے کے بعد اس کو صدقہ کر دیا تو وہ آدمی اللہ کی امان میں رہتا ہے اور حالت حیات میں اور بعد مرنے کے وہ فی سبیل اللہ ہی میں شمار ہوتا ہے آپ نے ام خالد کو فرمایا کہ جب کوئی جدید کپڑا پہنو تو اس کو خوب پرانا کر کے اتارو حتی کہ وہ پھٹنے لگے، یہ الفاظ آپ نے دو مرتبہ ارشاد فرمائے اور سنن ابن ماجہ میں یہ ہے کہ آپ نے حضرت عمرؓ کو ایک کپڑا پہنے دیکھا تو دریافت فرمایا یہ جدید ہے یا دھلا ہوا ہے عرض کیا جدید ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔

البس جدیدًا عش حمیدًا — نیا کپڑا پہنو! نیک زندگی گذارو،
ومت شھیدًا — اور شہادت کی موت مرو!

گھر میں داخل ہونا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ اچانک گھر میں داخل ہونے کی نہیں تھی، بلکہ آپ اپنے گھروالوں کو اپنے داخلہ کی اطلاع دیتے ہوئے تشریف لے جاتے تھے اور اُن کو سلام کرتے اور پھر کوئی سوال کر لیتے، کبھی آپ دریافت فرماتے کچھ کھانے کے لئے ہے؟ اور کبھی خاموش بھی رہتے، اور گھر میں جو میسر ہوتا پیش کر دیا جاتا، اور گھر کو لوٹتے وقت آپ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:۔

الحمد للہ الذی کفانی و آوانی والحمد للہ الذی اطعمنی وسقانی والحمد للہ الذی منّ علیّ اَسْئَلُكَ اَنْ تُجِیْرَنِیْ مِنَ النَّار ۔	حمد اُس خدا کی جس نے میری کفایت کی اور مجھے پناہ دی، اور حمد اُس خدا کی جس نے مجھے کھلایا اور سیراب کیا، اور حمد اُس خدا کی جس نے مجھ پر احسان فرمایا۔ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے دوزخ سے پناہ میں رکھ

آپ نے حضرت انسؓ سے فرمایا جب تم گھر میں جاؤ تو سلام کرو، اس سے تم پر اور تمہاری اہل پر برکت نازل ہوگی، یہ حدیث حسن صحیح ہے اور سنن میں مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا، جب کوئی گھر میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھے:۔

اللھم اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ خیرَ المولجِ وخیرَ المخرج
بسم اللہ ولجنا وعلی اللہ رَبَّنَا توکّلنا،

اس کے بعد گھر والوں پر سلام بھیجے۔ اور ایک حدیث میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کا ضامن ہوتا ہے، ایک غازی فی سبیل اللہ اگر اُس کو موت آگئی تو جنت میں داخل ہوگا یا اجر اور مال غنیمت کے ساتھ واپس ہوگا۔ دوسرے مسجد کو جانے والا آدمی، اگر اسکو موت آگئی تو جنت میں داخل ہوگا یا اجر و ثواب کے ساتھ واپس ہوگا اور تیسرے وہ آدمی جو گھر میں سلام کرتا ہوا داخل ہوتا ہے، یہ حدیث صحیح ہے اور ایک حدیث

میں یہ ہے کہ جب آدمی گھر میں داخل ہوتے وقت اور کھانا کھاتے وقت خدا کا ذکر کرتا ہے تو شیطان ان کے لئے بد دعا کرتا ہے کہ ان کا رات کا آرام کرنا اور شام کا کھانا اچھا نہ ہو" اور اگر کوئی خدا کو یاد نہیں کرتا تو شیطان ان سے بہت خوش ہوتا ہے۔

بیت الخلاء میں داخل ہونا صحیحین میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء میں جب داخل ہوتے تو یہ دعاء کیا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ

امام احمد نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے ہر اس آدمی کو جو بیت الخلاء میں داخل ہو اس کے پڑھنے کا امر فرمایا، اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب بیت الخلاء میں کوئی پیر رکھے تو اس دعا کو پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الرِّجْسِ النَّجِسِ الْخَبِیْثِ
الْمُخْبِثِ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔

آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بسم اللہ کہہ کر بیت الخلاء میں داخل ہو تو ستر عورت اور شیطان کے درمیان پردہ ہو جاتا ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ پیشاب کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے جواب[1] نہیں دیا، اور فرمایا

---

[1] چند مواضع میں سلام نہ کرنا چاہیئے۔ استنجا[1] کرتے وقت، نماز[2] پڑھنے والوں کو، کھانے کے[3] وقت، پانی[4] پیتے ہوئے۔ قرآن[5] یاد کرنیوالے کو، خطبہ[6] اور اذان کے وقت، نشہ[7] کی حالت میں، جوان[8] عورت کو، فاسق[9] فاجر کو، چھینکنے[10] والے کو، سوتے[11] ہوئے کو، مجنوں[12] کو، غسل[13] کرتے وقت، حالت[14] جماع کے وقت، ستر[15] کھلے ہوئے۔ درس[16] تدریس کے وقت، وعظ[17] اور خطبہ کے وقت، لہو[18] ولعب میں مبتلا لوگوں کو، ایسے[19] ہی ان لوگوں کو (باقی صفحہ ۳۳۹ پر)

اللہ تعالیٰ اس آدمی سے ناراض ہوتا ہے جو رفعِ حاجت کے وقت بات کرتا ہے اور فرمایا جو دو آدمی بیت الخلاء سے بات کرتے ہوئے نکلیں اور اُن کا ستر کھلا ہو تو اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہوتا ہے۔

اور یہ گذر چکا ہے کہ آپ پیشاب و پاخانہ کرتے وقت نہ قبلہ رو ہوتے اور نہ اس سے پشت کرتے۔ آپ نے ابوایوب انصاریؓ، سلمان فارسیؓ، ابوہریرہؓ معقل بن ابی معقل، عبداللہ بن الحرث بن جزع الزبیدی، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عمرؓ والی حدیث میں اس سے منع فرمایا ہے اور یہ تمام احادیث صحیح حسن ہیں، اور ان کے خلاف جو ہیں وہ معلول ہیں چنانچہ عراک کی حدیث ہے

حضرت عائشہ رضؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کچھ لوگ شرم گاہوں کو قبلہ کی طرف کرنے کو بُرا جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا، کیا لوگ ایسا کرتے ہیں؟ اور اُن کو چاہئے کہ مقعد کو قبلہ کی طرف کر لیا کریں ؎

امام احمد نے فرمایا یہ حدیث رخصت کے بارے میں سب سے زیادہ حسن ہے اگرچہ مرسل ہے لیکن اس حدیث میں بخاری وغیرہ نے طعن کیا ہے امام ترمذی نے کتاب العلل میں فرمایا ہے، کہ میں نے امام بخاری سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو

باقی حاشیہ۔ ص ۳۳۸ جو معاصی میں مبتلا ہیں، وہ راہ گیر جو عورتوں کو دیکھنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رد المحتار ص ۲۱۵ ج ۱

حاشیہ صفحہ ھذا:۔ حنفیہ کے نزدیک قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف کو رُخ کرنا یا پشت کرنا مطلقاً ناجائز ہے، خواہ عمارت ہو یا جنگل ہو ان کا استدلال سنن کی حدیث ہے۔ لا تستقبلوا القبلۃ الخ لیکن ابن عمرؓ کی وہ حدیث جس سے امام شافعیؒ نے استدلال کیا ہے اس میں بہت سے (باقی ص ۳۴۰ پر)

فرمایا، اس حدیث میں اضطراب ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت عائشہ کا قول ہے میں کہتا ہوں اس میں ایک علّت اور ہے، اور وہ یہ کہ عراک نے حضرت عائشہؓ سے نہیں سنا، اس وجہ سے یہ منقطع ہے، اس کی سند میں عبدالوہاب نے عن رجل عن عائشہ روایت کیا ہے اور ایک علّت یہ ہے کہ اس میں خالد بن ابی صلت ضعیف ہے۔ اور حضرت جابر رضؓ فرماتے ہیں:۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف کو مُنہ
کر کے پیشاب کرنے سے منع فرمایا تھا، لیکن میں نے آپؐ وصال
سے ایک سال پہلے قبلہ کی طرف کو رُخ کر کے پیشاب فرماتے دیکھا۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔ اور کتاب العلل میں کہا ہے کہ میں نے امام بخاری سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا، یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو ایک سے زیادہ حضرات نے ابن اسحٰق سے روایت کیا ہے، اگرچہ اس اعتبار سے بخاری کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے لیکن فی نفسہٖ صحیح نہیں ہے۔ اور اگر فی نفسہٖ صحیح بھی ہے تو یہ واقعہ اور ابن عمرؓ کی حدیث کا واقعہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے جس میں ہے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف پشت کر کے قضاء حاجت کرتے دیکھا،" اس کے اندر چھ احتمال ہو سکتے ہیں

۱۔ اس سے ممانعت منسوخ ہو گئی ۲ ۔ یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص ہے۔ ۳۔ یہ تخصیص صرف عمارت والے بیت الخلاء میں ہے۔ ۴، کسی عذر کی وجہ سے ایسا کیا ہوگا ۵۔ یا اس چیز کا بیان ہے کہ ممانعت حرمت کے لئے نہیں ہے ۶۔ یا نہی منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ ان چھ وجوہات میں سے کسی

ص ۳۳۹ کا باقی حاشیہ احتمالات ہیں۔ اس وجہ سے وہ قابل استدلال نہیں ہے۔ رد المحتار ج ۱ ص ۲۳۲

پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اور حدیث جابرؓ کی وجہ سے صحیح اور مشہور احادیث کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے صرف اس قدر ثابت ہو رہا ہے کہ صحراء میں قضاء حاجت کا حکم بدستور ہے۔ عمارتوں میں وہ حکم نہیں ہے اس میں بھی یہ احتمال ہے کہ کس قدر عمارت ہونا چاہیئے۔ اور اگر مطلق رکھا جائے تو پھر کھلے میدان کا بھی یہی حکم رہے گا[۱]

بیت الخلاء سے باہر آنا جب آپ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو "غفرانک" کہتے اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ یہ پڑھتے :۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّیَ الْاَذٰی وَعَافَانِیْ۔ — حمد اس خدا کی جس نے مجھ سے گندگی دور کی اور مجھے معاف کر دیا۔

اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

اذکارِ وضو آپ نے ایک مرتبہ برتن میں ہاتھ ڈالا، اور صحابہؓ سے فرمایا "بسم اللہ وضو کرو"۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے حضرت جابرؓ سے وضو کے پانی کے لئے فرمایا۔ چنانچہ پانی لایا گیا آپ نے فرمایا "جابر اس کو لو اور بسم اللہ کہہ کر گرانا شروع کرو"۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں میں نے بسم اللہ کہہ کر گرانا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشت ہائے مبارک سے پانی اُبلنا شروع ہوا، اور امام احمد نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

---

[۱] حنفیہ کا مسلک ہم گذشتہ حاشیہ میں درج کر چکے ہیں۔ علامہ کی تحریر سے حنفیہ کے مسلک کی تائید ہو رہی ہے۔

لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ جو اللہ کا نام نہ لے اس کا وضوء نہیں ہے۔ [1]

اس حدیث کی سند میں کمزوری ہے، اور آپ سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ "جس نے پورا پورا وضو کیا، اور اس کے بعد میں "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ" پڑھا تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں کہ وہ جس سے چاہے داخل ہو"۔ اس کو مسلم نے ذکر کیا ہے، اور ترمذی نے بعد تشہد کے اتنا اضافہ اور کیا ہے:۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں اور پاک ہونے والوں میں سے کر۔

امام احمد نے اس پر اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ یہ کلمات آپ تین مرتبہ فرماتے تھے۔ اور تقی بن مخلد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا جس نے وضو سے فارغ ہونے کے بعد یہ پڑھا "سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک" تو فرشتہ اس پر مہر لگا کر عرش عظیم کے نیچے داخل کر دیتا ہے، اور نسائی نے کتاب الکبیر میں اس کو ابو سعید خدریؓ کا کلام قرار دیا ہے اور ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے "باب ما یقول بعد فراغہ من الوضوء" اور اس کے بعد مذکورہ ادعیہ میں سے بعض کو ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد صحیح سند سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث روایت کی ہے کہ:۔

---

[1] اس حدیث سے امام شافعی وغیرہ نے استدلال کیا ہے کہ تسمیہ وضوء میں ضروری ہے حنفیہ کے نزدیک ضروری نہیں صرف مسنون ہے۔ اور اس حدیث میں "لا نفی کا" کمال وضو کی نفی کر رہا ہے جیسا کہ لاسیف الا ذوالفقار یا لا صلوٰۃ" یہاں بھی کمال کی نفی ہے جنس کی نفی نہیں ہے۔

میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں
وضو کا پانی پیش کیا۔ آپ نے وضو کیا، میں نے آپ کو
یہ کہتے ہوئے سنا "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ
فِیْ دَارِیْ وَبَارِکْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ" [1] میں نے عرض کیا
حضور! میں نے آپ کو ایسا ایسا پڑھتے سنا ہے۔ آپ نے
فرمایا، میں نے کچھ ترک تو نہیں کیا۔

اور ابن سنی نے بھی اس پر ایک باب قائم کیا ہے۔

اذان جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ اذان کے لئے ترجیع اور غیر ترجیع [2] دونوں طریقے مسنون ہیں اور اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ اور دو دو مرتبہ، دونوں طرح مشروع ہیں لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اقامت کے کلمات دو دو مرتبہ ہوں۔ ایسے ہی ابتدائے اذان میں چار مرتبہ "اللہ اکبر" کے کلمات ثابت ہیں۔ آپ سے دو پر اقتصار کرنا ثابت نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ حدیث ہے کہ آپ نے حضرت بلالؓ کو امر فرمایا، "اذان کے کلمات دو مرتبہ اور اقامت کے کلمات ایک مرتبہ کہے جائیں"۔ یہ چار والی روایت کو منافی نہیں ہے بلکہ صحیح سند سے صراحت کے ساتھ چار مرتبہ کے الفاظ موجود ہیں، لیکن اقامت کے الفاظ مفرد ہونا، تو اس کے بارے میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں "کلمہ اقامت" کا استثنار موجود ہے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اذان دو دو مرتبہ اور اقامت کے کلمات صرف ایک ایک مرتبہ نہیں تھے۔ بخاری شریف میں حضرت انسؓ کی روایت

---

[1] اے اللہ میرے گناہ معاف فرما، اور میرے گھر میں وسعت اور رزق میں برکت دے [2] ترجیع اذان میں شہادتین کو دو مرتبہ آہستہ اور دو مرتبہ بلند آواز سے کہنا اس کے بارے میں تفصیل پہلے حصہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

موجود ہے کہ :-

آپ نے حضرت بلال رضؓ کو امر فرمایا کہ اذان کے کلمات
دُو دُو مرتبہ اور اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ کہو، بجز
قد قامت الصلوٰۃ کے"

اور حضرت عبداللہ بن زید کی روایت میں بھی اسی طرح ہے۔ اور حضرت ابو محذورہ رضؓ کی حدیث میں بھی یہی ہے لہ

اور یہ تمام طریقے جائز ہیں، کوئی طریقہ مکروہ نہیں ہے۔ اگرچہ افضل ہونے میں اختلاف ہے امام احمدؒ نے تو حضرت بلالؓ کی اذان اور اقامت کو اختیار کیا ہے۔ اور امام شافعیؒ نے حضرت ابو محذورہ رضؓ والی اذان اور حضرت بلالؓ والی اقامت کو لیا ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ نے اذان حضرت بلالؓ کی اور اقامت حضرت ابو محذورہ والی اختیار کی ہے اور امام مالک نے اہل مدینہ کا عمل اختیار کیا ہے۔

اذکار بعد اذان

آپ نے اُمت کے لئے پانچ طریقے جائز رکھے ہیں۔
(۱) سننے والا ایسے ہی کہے جیسا کہ مؤذن کہتا ہے۔ علاوہ حیّ علی الصلوٰۃ اور حیّ علی الفلاح کے" اس کے بجائے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہے۔ اور دونوں کو جمع کرنا ثابت نہیں ہے، اور حکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے
(۲) یہ کہ بعد اذان کے یہ کہے۔ رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِالاِسلامِ دِینًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا"، جس نے یہ کلمات کہے اس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

لہ۔ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اذان اور اقامت دونوں میں کلمات دو دو مرتبہ کہے جائیں، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں مسجد نبوی کی اذان اور اقامت اسی طرح تھی۔

(۳) یہ کہ موذن کے فارغ ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف بھیجا جائے اور کامل ترین درود شریف وہی ہے جو آپ نے اُمت کو سکھایا ہے۔ اس سے زیادہ افضل درود شریف بنانے والوں کے درود نہیں ہو سکتے۔

(۴) یہ کہ درود شریف کے بعد یہ کلمات بھی کہے جائیں۔ اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلوٰۃ القائمۃ آت محمدن الوسیلۃ والفضیلۃ وابعثہ مقاما محمودن الذی وعدتہ انک لا تخلف المیعاد۔

اسی طرح سے مروی ہے کہ مقاما محموداً بلا الف لام کے ہے (یعنی المحمود نہیں ہے)

(۵) ۔یہ بھی روایت ہے کہ اس کے بعد اپنے لئے دعا مانگے، اس وقت کی دعا قبول ہوتی ہے اور سنن میں مذکور ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا" جس طرح موذن کہے تم بھی کہو اور جب اذان ختم ہو جائے تو دعا مانگو، وہ دعا قبول ہوگی امام احمد نے ذکر کیا ہے کہ جس آدمی نے مؤذن کی اذان کے وقت یہ کہا:۔

اللھم رب ھذہ الدعوۃ	اے اللہ تو اس دعوت کاملہ اور صلوٰۃ
التامۃ والصلاۃ النافعۃ	نافعہ کا رب ہے حضور پر رحمت نازل فرما
صل علی محمد وارض منہ	اور ان سے ایسا راضی ہو کہ اس کے بعد
رضاء لا سخط بعدہ۔	ناراضگی نہ ہو۔

تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سکھایا کہ میں مغرب کی اذان کے وقت یہ پڑھا کروں

اللھم ان ھذا اقبال لیلک	اے اللہ تیری رات کی آمد ہے اور

لہ اس سے مراد وہ درود شریف ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

وادبار نھارک واصوات دعائک فاغفر لی
دن کی رخصت اور تیری ندا کے لئے آوازیں بلند ہو رہی ہیں، میری مغفرت فرما۔

اس کو امام ترمذی نے ذکر کیا ہے اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذان سنتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے:۔

اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ المستجابۃ
والمستجاب لھا دعوۃ الحق وکلمۃ التقوی
توفنی علیھا واحینی علیھا واجعلنی من صالح
اھلھا عملا یوم القیامۃ۔

اس کو امام بیہقی نے موقوفاً ذکر کیا ہے اور آپ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ قد قامت الصلوۃ کے وقت "اقامھا اللہ وادامھا" پڑھا کرتے تھے۔ سنن میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "اذان اور اقامت" کے درمیان کی دعا رد نہیں ہوتی ہے۔ ایک صحابی رض نے دریافت کیا "یا رسول اللہ اس وقت میں کیا دعا مانگوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا، "دنیا اور آخرت کی عافیت مانگو" یہ حدیث صحیح ہے، اور سنن میں ایک روایت یہ ہے:۔

دو گھڑیاں ایسی ہیں جن میں آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور مانگنے والے کی دعا رد نہیں ہوتی۔ ایک اذان کے وقت، اور دوسرے جب اللہ کے راستہ میں کوئی جماعت کھڑی ہو[1]

اور نماز میں اذکار اور دعائیں۔ اسی طرح جنازہ کی دعا، عیدین اور کسوف کے اذکار گذر چکے ہیں۔

عشرہ ذی الحجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس عشرہ میں بہت دعا مانگا کرتے تھے اور لوگوں کو کثرت سے تہلیل، تکبیر، تحمید کی ہدایت فرمایا کرتے

[1] اس سے مراد نماز کی جماعت اور جہاد کی جماعت بھی ہو سکتی ہے۔

تھے۔ آپ سے مروی ہے کہ آپ یوم عرفہ کی فجر سے لیکر آخر یوم تشریق کی عصر تک تکبیر کہا کرتے تھے یعنی (اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد"

اس حدیث کے اسناد اگرچہ صحیح نہیں ہیں، لیکن عمل اسی پر ہے، الفاظ تکبیر کے اسی طرح منقول ہیں اور تین مرتبہ تکبیر کے الفاظ، اس کو حضرت جابر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور یہ بھی حسن ہے۔ اور امام شافعیؒ نے فرمایا، اگر زیادہ کیا جائے تو یوں کہنا چاہیے۔ اللہ اکبر کبیراً والحمدُ للہِ کثیراً وسبحان اللہِ بُکرۃً وَّاَصیلاً لا الٰہ الا اللہ ولا نعبد الا ایاہ مخلصینَ له الدین ولو کرہَ الکافرون، لا الٰہ الا اللہ وحدہ وَصَدَقَ وعدہٗ وَنَصَرَ عبدَہٗ و ھزمَ الاحزابَ وحدَہٗ لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر، تو بہتر ہے۔

رویت ھلال

مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاند دیکھ کر یہ دعا پڑھا کرتے تھے:۔

اللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ علینا بِالْاَمْنِ وَالْاِیمانِ والسلامۃِ والْاسلامِ ربی و ربُّکَ اللہُ۔	اے اللہ ہم پر اس کو امن اور ایمان سلامتی اور اسلام کے ساتھ نمودار کر میرا رب اور تیرا رب اللہ ہے

امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاند دیکھتے تو یہ فرماتے:۔

ھلالُ خیرٍ ورُشدٍ، ھلالُ خیرٍ ورُشدٍ

اور اس کے بعد فرماتے:۔

لہ لیکن امام بیہقی نے اس حدیث کو مشہور اور صحیح قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس حدیث میں کوئی کمزوری نہیں ہے
البنایہ صفحہ ۱۰۳ ج ۱

الحمد للہ الذی اذھب | اس خدا کی حمد جو فلاں مہینے گیا
بشھر کذا وجاء بشھر کذا | اور فلاں مہینے آیا۔

ابوداؤد نے کہا ہے اس کی سند میں کمزوری ہے اور اس باب میں کوئی حدیث مستند اور صحیح مروی نہیں ہے۔

کھانے کی دعائیں جب آپ کھانے پر ہاتھ رکھتے (یعنی شروع کرتے تو بسم اللہ کہتے اور بسم اللہ کہہ کر ہی کھانے کا امر فرماتے۔ آپ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے جب کوئی کھانا کھائے تو اللہ کا نام لے، اور اگر بھول جائے تو کہئے "بسم اللہ فی اولہ واخرہ" یہ حدیث صحیح ہے:۔

اور کھانا کھانے کے وقت بسم اللہ کہنا واجب ہے[1]۔ امام احمد اور آپ کے شاگردوں نے وجوب کی ایک وجہ تو یہ بیان کی ہے جو گذر چکی ہے۔ اور اس بارے میں امر کے صیغہ والی حدیثیں صحیح ہیں اور ان کا معارض موجود نہیں ہے۔ اور نہ کوئی اجماع ہے کہ جس کی مخالفت لازم آئے اور جو بسم اللہ نہیں کہتا، شیطان اس کے کھانے میں شریک ہو جاتا ہے"۔

اس جگہ چند مسائل ہیں، وہ یہ کہ، اگر کھانے والے ایک جماعت ہوں اور کسی ایک نے بسم اللہ کہہ دیا تو کیا شیطان کی شرکت ختم ہو جائے گی یا نہیں؟ یا سب کو بسم اللہ کہنا چاہیئے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے، ایک آدمی کا بسم اللہ کہنا سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا، اور یہ ایسے ہی ہے جیسے سلام اور چھینک کا

---

[1] امام غزالی نے آداب طعام میں فرمایا ہے کہ ادب یہ ہے کہ پہلے لقمہ پر بسم اللہ، اور دوسرے پر بسم اللہ الرحمٰن اور تیسرے پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا جائے۔ اس پر اجماع ہے کہ بسم اللہ کہنا سنت کفایہ ہے اور مستحب یہ ہے کہ ہر ایک کو کہنا چاہیے الخ احیاء ص ۲۸۲ ج ۲

جواب ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک کے کہنے سے شرکت شیطان ختم نہ ہوگی بلکہ سب کو کہنا چاہیئے۔ حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے۔

> ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے میں شریک تھے۔ ایک بچی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈال دیا، آپ نے اس کو روک دیا۔ پھر ایک اعرابی آیا اور اس نے کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا، جس کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کھانے کو اپنے لئے حلال کر لیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس لڑکی کے ساتھ آیا تاکہ کھانے کو اپنے لئے حلال کر لے، میں نے اس کا ہاتھ روک دیا، پھر وہ اعرابی کے ساتھ آیا تو میں نے اس کا بھی ہاتھ روک دیا خدا کی قسم شیطان کا ہاتھ ان دونوں کے ہاتھوں کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی کا بسم اللہ کہنا کافی نہیں ہے لیکن اس حدیث کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ اس وقت حضورؐ نے کھانا شروع نہیں کیا تھا ان کے بعد بسم اللہ کہہ کر شروع کیا تھا، اور امام ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے:-

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھ صحابہ کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی آیا اور دو لقمہ میں سب کھانا کھا لیا تب آپ نے ارشاد فرمایا، اگر یہ بسم اللہ پڑھ لیتا تو یہ کھانا تم سب کو کافی ہو جاتا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ آپ نے اور آپ کے چھ صحابہ نے بسم اللہ کہہ کر ہی کھانا شروع کیا ہوگا۔ اور اس اعرابی نے بلا بسم اللہ کے شروع کر دیا تو شیطان شریک ہو گیا

اسی وجہ سے اس نے سب کھانا دو لقمہ میں کھالیا، اسی وجہ سے وہ کھانا کافی نہیں ہوا، اور رہا سلام اور چھینک کے جواب پر قیاس کرنے کا معاملہ، اس میں کلام ہے، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "اگر تم میں سے کوئی چھینکے اور "الحمد للہ" کہے، تو ہر ایک سننے والے کو اس کا جواب دینا چاہیے"، اس سے چھینکنے اور کھانے میں فرق ظاہر ہو گیا۔

حضرت جابرؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کیا ہے

من نسی ان یسمی علی طعامہ	جو آدمی بسم اللہ کھانے پر بھول گیا اسکو فارغ
فلیقراء قل ھو اللہ احد اذا فرغ	ہونے کے بعد قل ھو اللہ احد پڑھنا چاہیے۔

اس حدیث کا ثابت ہونا محل نظر ہے۔ اور جب کھانا آپ کے سامنے سے اٹھا لیا جاتا تو آپ یہ دعا پڑھتے۔

الحمدُ لِلّٰہ حمد اً کثیراً طیباً مّبارکاً فیہ
غیر مُکفیٍ ولا مُودعٍ ولا مستغنیٍ عنہ ربنا
عزّ وجل۔

اس کو بخاری نے ذکر کیا ہے اور بعض دفعہ آپ یہ بھی پڑھا کرتے تھے۔ الحمدُ للّٰہِ الذی اَطعَمَنا وَسَقَانا وَجَعَلَنا مِنَ المُسلِمِین۔ اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا، کہ جس نے کھانے کے بعد یہ پڑھا

الحمد لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطعَمَنِیْ ھٰذا مِنْ غَیرِ
حَوْلٍ مِنّیْ وَلَا قُوَّۃٍ۔

تو اللہ تعالیٰ اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ جب آپ کے سامنے کھانا پیش کیا جاتا تو آپ "بسم اللہ" کہتے، اور جب کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ دعا پڑھتے۔

اللہم اطعمت وسقیت واغنیت، وھدیت
واحییت فلک الحمد علی ما اعطیت

اس کے اسناد ہیں اور سنن میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ فارغ ہونے کے بعد یہ دعا پڑھتے

الحمد للہ الذی منّ علینا وھدانا والذی
اشبعنا وارْوانا وکل الاحسان اتانا۔

یہ حدیث حسن ہے اور سنن میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو دعا پڑھے۔

اللّٰھم بارک لنا فیہ واطعمنا خیراً منہ۔

اور اگر کوئی کسی کو دودھ پلائے تو یہ دعا پڑھے " اللّٰھم بارک لنا فیہ و زدنا منہ یہ حدیث حسن ہے اور روایت کیا گیا ہے کہ آپ تین سانس لیکر پانی پیتے اور سانس کے بعد الحمد للہ کہتے اور آخر میں خدا کا شکر ادا کرتے۔

اور جب حضور صلعم اپنے دولتکدہ میں تشریف لاتے تو بعض دفعہ فرماتے "کیا کھانا ہے؟ جب آپ کو بھوک ہوتی تناول فرماتے اور اگر اچھا نہ معلوم ہوتا تو چھوڑ دیتے، اور چپ رہتے، اور بعض دفعہ فرمادیتے مجھے خواہش نہیں ہے، اور کبھی کبھی آپ کھانے کی تعریف بھی فرمادیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے سالن طلب فرمایا، تو عرض کیا گیا "سرکہ" کے علاوہ کچھ نہیں ہے تو آپ نے فرمایا "سرکہ اچھا سالن ہے" اس سے سرکہ کی، گوشت، شہد، دودھ، پر فوقیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ موجودہ سالن کی مدح تھی" یا آپ نے پیش کرنے والے کی خوشنودی کے لئے ایسا فرمایا تھا۔ اور جب روزہ کی حالت میں آپ کی خدمت میں کھانا پیش کیا جاتا تو فرمادیتے "انی صائم" میں روزہ سے ہوں، اور پیش کرنے والے

کو دُعائیں دیتے، اور اگر روزہ سے نہ ہوتے تو تناول فرماتے"۔ اور جب کہیں آپ مدعو ہوتے اور آپ کے ساتھ کوئی ہوتا تو بلانے والوں کو بتلا دیتے تھے کہ یہ صاحب ہمارے ساتھ ہیں۔ اگر چاہو تو اجازت دیدو! اور اگر چاہو تو یہ واپس ہو جائیں" اور آپ کھانا کھاتے وقت بولتے بھی رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے ربیب[1] سے جو آپ کے ساتھ کھانے میں شریک تھے فرمایا "بسم اللہ کر کے اپنی طرف سے کھاؤ" بعض دفعہ آپ اپنے مہمانوں کو اصرار کر کے کھلاتے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت دودھ والے قصہ کی ہے، کہ آپ نے بار بار مجھ سے فرمایا، اشرب، اشرب۔ اور پی، اور پی" میں نے عرض کیا "قسم اس ذات کی جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔

اور جب آپ کسی کے یہاں کھانا تناول فرماتے تو ان کے لئے دعا کرتے تھے، چنانچہ آپ نے حضرت عبداللہ بن بسر کو دعائیں دیں۔

اللھم بارک لھم فیما رزقتھم	اے اللہ ان کے رزق میں برکت دے۔ ان کے
واغفر لھم وارحمھم	گناہ معاف کر اور ان پر رحم فرما

اس کو مسلم نے ذکر کیا ہے، اور آپ نے حضرت سعد بن عبادہؓ کے گھر والوں کو دعا دی

تمہارے یہاں روزے داروں نے افطار کیا اور
تمہارا کھانا نیک لوگوں نے کھایا اور فرشتوں نے تمہارے اوپر رحمت نازل کی۔

اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ" ابن تیہانؓ نے آپ کی اور آپ کے صحابہ کی دعوت کی، جب آپ اور آپ کے صحابہ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا، اپنے بھائی کے لئے دعا کرو، عرض کیا، کیا دعا کریں، فرمایا جب کوئی

---

[1] مراد ان سے آپ کی زوجہ محترمہ کے صاحبزادے یعنی عمر بن ابی سلمہ ہیں

کسی کے یہاں جائے اور اس کا کھانا کھائے اور اس کا پانی پیئے تو اس کے لئے دعا کرے۔

ایک رات آپ دولت کدہ پر تشریف لائے اور کھانا طلب فرمایا۔ عرض کیا گیا کچھ نہیں ہے تب آپ نے یہ دعا کی

اَللّٰھُمَّ اَطْعِمْ مَنْ اَطْعَمَنِیْ — اے اللہ جو مجھے کھلائے تو اسے کھلا

وَاسْقِ مَنْ سَقَانِیْ — اور جو مجھے پلائے تو اسے پلا۔

ایک دفعہ عمرو بن حمق نے آپ کو دودھ پلایا، آپ نے اس کے لئے دعا کی "اے اللہ اس کو اس کی جوانی کا فائدہ دے"۔ چنانچہ اسّی سال کی عمر ہونے پر بھی ان کے کوئی سفید بال نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اور آپ ان لوگوں کے لئے دعا کیا کرتے تھے جو مساکین کو مہمان بناتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک دفعہ اعلان فرمایا" اس شخص کو کون مہمان بنائے"، تو ایک انصاری اور ان کی اہلیہ نے اپنا اور اپنے بچوں کا کھانا ان کو کھلایا تو آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کو تمہارا یہ عمل بہت پسند آیا"

آپ کھانا کھلانے سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے۔ بوڑھا ہو، بچہ ہو، جوان ہو، آزاد ہو غلام ہو، کوئی بھی ہو اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ساتھ کوڑھی کو بھی کھانا کھلایا آپ داہنے ہاتھ سے کھانے کا امر فرماتے اور بائیں ہاتھ سے کھانے کو منع فرماتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا پیتا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ بائیں ہاتھ سے کھانا حرام ہے۔ کیونکہ بائیں ہاتھ سے کھانے والا یا تو شیطان ہے یا اس کے مشابہ ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک آدمی کو فرمایا "داہنے ہاتھ سے کھاؤ" اس نے کہا میں داہنے سے کھا نہیں سکتا۔ آپ نے

فرمایا اچھا ایسا ہی ہوگا" اس کے بعد سے اس کا ہاتھ کبھی بھی منہ تک نہیں جا سکتا تھا" اگر یہ جائز ہوا ہوتا تو آپ اس کے لئے بددعا نہ کرتے۔ اور اگر اس کو عدم امتثال پر محمول کیا جائے تب تو اور بھی زیادہ خرابی کی بات ہے

ایک مرتبہ چند آدمیوں نے شکایت کی کہ ان کا پیٹ نہیں بھرتا، آپ نے فرمایا "سب ایک ساتھ کھایا کرو، اور اللہ کا نام لیکر کھایا کرو تو تمہارے لئے برکت ہوگی" آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہوتا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور خدا کی حمد کرتا ہے اور پانی پیتا ہے تو خدا کی حمد کرتا ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا :-

> جب تم کھانا شروع کرو تو خدا کا ذکر کرو اور دعا کرو، اور
> کھانے پر (یعنی دستر خوان پر) مت سوؤ، ورنہ تمہارے
> دل سخت ہو جائیں گے۔

زیادہ مناسب یہی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ تجربہ اس کی شہادت دیتا ہے

۳۷واں باب

سلام۔ استیذان۔ چھینک

فضیلتِ سلام صحیحین میں حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

افضل الاسلام وخیرہ اطعام الطعام وان تقرأ السلام علی من عرفت وعلی من لم تعرف

بہترین اسلام کھانا کھلانا اور جانتے کو اور بلا جانتے کو سلام کرنا ہے۔

صحیحین میں یہ حدیث بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرمایا، فرشتوں کی جماعت کے پاس جاؤ! اور ان کو سلام کرو! جو وہ جواب میں کہیں وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے ان کو السلام علیکم کیا تو انھوں نے جواب میں "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا، اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "سلام پھیلاؤ، اور فرمایا جب تم آپس میں سلام کا رواج ڈالو گے تو تم میں محبت پیدا ہو گی اور جنت میں اس وقت تک داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لاؤ گے اور اس وقت تک ایماندار نہ بنو گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو گے" اور بخاری نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمار نے فرمایا:۔

ثلاث من جمعھن فقد

تین چیزیں جس میں ہوں گی، اس

جمع الایمان۔ الانصاف من نفسك و بذل السلام للعالم۔ والانفاق من الاقتار۔

نے پورے ایمان کو جمع کرلیا، اپنے نفس کے ساتھ انصاف عالم کے لئے سلام کو خرچ کرنا اور تنگی میں خرچ کرنا

ان کلمات میں تمام خیر کے اصول اور فروع موجود ہیں۔ انصاف میں حقوق اللہ اور حقوق الناس کی پوری پوری ادائیگی داخل ہے۔ اور لوگوں سے ایسا مطالبہ نہ کرے جو اس کے لائق نہ ہو۔ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالے۔ اور لوگوں سے ایسا معاملہ کرے جیسا اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ اور ان چیزوں کو معاف کردے جن کی معافی اپنے بارے میں اچھی جانتا ہے اور لوگوں کو ایسا حلم کرے جیسا اپنے کو کرسکتا ہے، یہ ہے اپنے نفس کے ساتھ انصاف کرنا۔

غرضکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا ارشاد (نفس کے ساتھ انصاف، بذل سلام اور انفاق) ایک جامع کلام ہے جس میں بہت سی خیر کے اصول اور فروع ہیں اور بذلِ سلام سے مراد یہ ہے کہ اگر عالم کو سلام کا رواج ڈالے گا تو اس میں اس کی تواضع ہے، اس سے کبر ختم ہوگا، اس لئے کہ جب وہ ہر چھوٹے بڑے، شریف، رذیل، جانتا، غیر جانتا کو سلام کریگا تو اس میں اس کی تواضع آئے گی، بخلاف متکبر کے وہ اپنے کبر کی وجہ سے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا، چہ جائیکہ سلام میں ابتدا کرنا۔

اور تنگی میں خرچ کرنا یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب آدمی کا اللہ پر بھروسہ ہو، اور یقین حاصل ہو۔ دنیا کے معاملات میں زہد ہو اور نفس میں سخاوت کا جذبہ موجود ہو اور اللہ کے وعدہ پر جو اس نے مغفرت کے بارے میں کیا ہو یقین ہو، اور اس وعدے کی تکذیب کرتا ہو جو فقر کا وعدہ کرتا ہے (یعنی شیطان) اور بری باتوں پر اکساتا ہے

عورتوں کو سلام کرنا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ثابت ہے کہ آپ ایک مرتبہ عورتوں کی جماعت کے پاس سے ہوکر گذرے تو

آپ نے اشارے سے سلام کیا۔ ابو داؤد نے حضرت اسماء بنت یزید کی روایت ذکر کی ہے کہ ایک دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے ہو کر گزرے تو آپ نے ہم کو سلام کیا۔ یہی ترمذی کی حدیث بھی روایت کرتی ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ایک ہی قصہ ہے بخاری میں ۔۔۔ ۔۔۔ روایت ہے کہ ایک دن حضرات صحابہ جمعہ کی نماز کے بعد راستہ میں بوڑھیوں کے پاس سے ہو کر گذرتے ہوئے ان کو سلام کرتے ہوئے جاتے تھے، اور بوڑھیوں نے ان کو جو کا کھانا پیش کیا اسکو کھاتے تھے۔

یہ حدیث بوڑھیوں، اور محرم عورتوں کو سلام کرنے نہ کہ غیروں کو سلام کرنے کے بارے میں زیادہ واضح ہے۔

ترویج سلام

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح بخاری میں مروی ہے کہ بچوں کو چاہیئے کہ بڑوں کو سلام کریں اور گذرنے والا بیٹھنے والے کو، اور سوار پیدل کو، تھوڑی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے اور جامع ترمذی میں ہے "چلنے والا کھڑے ہوئے کو سلام کرے اور مسند بزار میں ہے، سوار پیدل کو، پیدل بیٹھے ہوئے کو اور دو پیدل، ان میں جو چاہے پہل کرے وہی افضل ہے۔ اور سنن ابو داؤد میں ہے:۔

جو سلام پہلے کرے وہی افضل ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم کے پاس پہونچنے پر بھی سلام کرتے اور واپسی پر بھی سلام کرتے، اور آپ سے ثابت ہے:۔

اذا قعد احدکم فلیسلم	جب تم میں سے کوئی بیٹھے تو سلام کرے
واذا قام فلیسلم ولیست الاولی احق من الاخر۔	اور جب کھڑا ہو تو سلام کرے اور پہلا دوسرے سے زیادہ حقدار نہیں ہے۔

ابو داؤد نے روایت کیا ہے" جب تم میں سے کوئی کسی سے ملاقات کرے

اور اگر کوئی پیڑ بیچ میں آجائے اور پھر ملاقات ہو تو پھر بھی سلام کرے، اور حضرت انس رضؓ نے فرمایا ہے " جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ، جب چلتے اور آپس میں ملاقات کرتے اور اتفاق سے درمیان میں کوئی پیڑ آجاتا جس کی وجہ سے دائیں بائیں ہو جاتے، تو پھر بھی سلام کرتے۔

سلام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ یہ تھی کہ جب کوئی مسجد میں داخل ہوتا تو پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھتا، پھر آتا اور لوگوں کو سلام کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ تحیۃ المسجد سلام سے پہلے ادا ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ نماز اللہ کا حق ہے اور سلام بندوں کا حق ہے۔ اور اس جیسے حقوق میں اللہ تعالیٰ کا حق مقدم ہوتا ہے، بخلاف حقوق مالیہ کے کہ ان میں بندوں کا حق مقدم ہوتا ہے اور وجہ فرق یہ ہے کہ آدمی کو مال کی حاجت ہوتی ہے (بخلاف اللہ تعالیٰ کے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرات صحابہؓ کی یہی عادت تھی کہ پہلے وہ نماز پڑھتے اور اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر سلام کرتے۔ جیسا کہ رفاعہ بن رافع کی حدیث میں ہے:-

> ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک بدوی آیا، اور اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور لوٹ کر حضورؐ کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا، اور فرمایا، نماز پڑھ تو نے نماز نہیں پڑھی ہے[1]

---

[1] علامہ نے اس جگہ یہ ظاہر کیا ہے کہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد پہلے تحیۃ المسجد اور پھر سلام ہونا چاہئے، اور اس کی تائید میں حدیث اعرابی پیش کی۔ اور پھر ایک قیاس بھی پیش کر دیا ہے کہ نماز اللہ کا حق ہے اور سلام بندوں کا حق ہے الخ تو یہ قیاس درست نہیں ہے، کیونکہ (باقی ۳۵۹ پر)

اس سے ثابت ہوا کہ حضورؐ کو نماز جلدی جلدی پڑھنا بُرا معلوم ہوا، اور تاخیرِ سلام بُری نہیں معلوم ہوئی، اسی وجہ سے مسجد میں داخل ہونے والے کے لئے مسنون یہ ہے کہ جب مسجد میں چند لوگ بیٹھے ہوں تو اس پر ترتیب وار تین آداب ہیں (۱) یہ کہ داخل ہوتے وقت "بسم اللہ والصلوٰۃ علیٰ رسول اللہ" کہے (۲) تحیۃ المسجد ادا کرے (۳) جو موجود ہوں، ان کو سلام کرے۔

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گھر میں داخل ہوتے تو اس طرح سلام کرتے کہ جاگنے والا سُن لے اور سونے والا بیدار نہ ہو، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے:۔

باقی حاشیہ صـ۳۵۸ :۔ حقوق مالیہ میں بندوں کے حق کو مضرت کی وجہ سے ترجیح ہے۔ تاخیرِ سلام میں بھی مضرت ہے کہ مسلمان کے قلب میں بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے اور تاخیر نماز کی وجہ سے کوئی ایسی مضرت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سلام کرنا مطلقاً آداب دخول میں سے ہے خواہ مسجد ہو یا غیر مسجد قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے۔ اِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا" یہاں بیوتاً سے مراد غیر مسکونہ گھر ہیں۔ بخاری نے الادب المفرد میں ابن عمر کی روایت ذکر کی ہے کہ "جب کوئی غیر مسکون گھر یا مسجد میں داخل ہو تو کہے السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین اھ یہ اس صورت میں ہے کہ جب کوئی مسجد میں نہ ہو لیکن اگر ہو تو بطریق اولیٰ جائز ہے۔ اگرچہ مسجد میں ذکر وغیرہ میں مشغول لوگوں کے لئے جواب دینا واجب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مؤطا وغیرہ میں صحیح حدیث ہے کہ تین آدمی مسجد میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک واپس ہو گیا اور دو سلام کر کے بیٹھ گئے" اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ انھوں نے پہلے تحیۃ المسجد ادا کی اور پھر حاضر خدمت ہوئے۔ حدیث اعرابی سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہے کہ وہ تحیۃ المسجد تھی، بلکہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ فرض نماز تھی، غالباً اس میں تاخیر ہو رہی ہو گی وغیرہ ذلک مختصراً از اوجز صـ۳۷ ج ۲۔ حاشیہ صفحہ ھذا :۔ لے گذشتہ حاشیہ میں اگرچہ تفصیل (باقی صـ۳۶۰ پر)

السلام قبل الکلام۔ سلام کلام سے پہلے

دوسرے الفاظ میں اس طرح ہے "کسی کو کھانے کے لئے نہ کہو تاوقتیکہ وہ سلام نہ کرے[1]۔ اس کے اور ماقبل والی روایت کے اسناد اگرچہ ضعیف ہیں، لیکن عمل اسی پر ہونا چاہیئے"۔ ابن عمرؓ والی حسن اسناد سے مروی ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم السلام قبل السؤال فمن بدأکم بالسوال قبل السلام فلا تجیبو — آپ نے ارشاد فرمایا، سلام سوال سے پہلے، اور جس نے سلام سے پہلے سوال کیا، اس کو پورا نہ کرو۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ بلاسلام کے جو داخل ہونے کی اجازت مانگے اس کو اجازت نہ دو اور ترمذی نے صفوان بن امیہ کی حدیث روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں، میں نے جناب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ دودھ اور سوکھی کھجوریں بھیجیں، اس وقت آپ اوپر کی جانب تھے۔ میں نے نہ آپ کو سلام کیا اور نہ حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا۔ جائیے! پہلے "السلام علیکم" کہئے۔ یہ حدیث حسن غریب ہے، اور آپ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کسی کے یہاں جاتے تو دروازے کے بالکل سامنے نہ کھڑے ہوتے بلکہ بائیں جانب یا دائیں جانب اور دو دو "السلام علیکم السلام علیکم" فرماتے۔

آپ کے سامنے جو ہوتا آپ اس کو سلام کرتے اور غائبین میں سے جو آپ کو

باقی حاشیہ۔ صفحہ ۳۵۹ گذر چکی ہے تاہم حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مسجد میں آدمی ذکر وغیرہ میں مشغول ہوں تو سلام کرنا جائز نہیں اور اگر کرلیا تو جواب دینا واجب نہیں اوجز ج ۱ صفحہ ۳۷۳۔

حاشیہ صفحہ ھذا [1] کھانے کے وقت سلام کرنا جائز نہیں ہے مولانا تھانویؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ وقت بھی حیاء کا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لقمہ منہ میں ہو اور سلام کے جواب میں مبتلا ہو کر وہ لقمہ گلے میں (باقی صفحہ ۳۶۱ پر)

سلام بھیجتا، اس کا سلام بھی لیتے اور غائب کا سلام بھی پہونچاتے جیساکہ حضرت خدیجہ رضؓ کو آپ نے اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچایا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا، حضرت خدیجہ کھانا لیکر آرہی ہیں آپ ان کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہونچا دیجئے اور جنت کی خوشخبری سنا دیجئے۔ ایسے ہی آپ نے حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا تھا "جبرئیل تمہیں سلام کہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ نے جواب دیا" وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ برکاتہٗ" اور حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا جو چیز آپ دیکھتے ہیں، ہم نہیں دیکھتے۔

آپ کے سلام کی انتہا لفظ " برکاتہ " تک تھی، چنانچہ نسائی نے روایت کیا ہے " ایک آدمی نے آپ کو " السلام علیک " کیا، ور فرمایا " دس " اس کے بعد دوسرا آیا اور اس نے " السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا، آپنے فرمایا " بیس " پھر تیسرا آیا، اور اس نے " السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ " کہا، آپ نے فرمایا " تیس ۲ " اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے " پھر چوتھا آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ۔" آپ نے فرمایا " چالیس "

یہ حدیث ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس میں تین علتیں ہیں۔ پہلی علت تو یہ ہے کہ اس کو ابی مرحوم بن عبدالرحیم بن میمون نے روایت کیا ہے، اور وہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں سہل بن معاذ ہیں، اور وہ بھی ایسے ہی ہیں تیسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ایک راوی " سعید بن ابی مریم ہیں۔ انھوں نے جزم کے ساتھ نہیں کہا بلکہ یہ کہا ہے " اظن انی سمعت " میرا خیال ہے کہ

باقی حاشیہ صفحہ ۳۶۰ اٹک جائے۔ اور کھاتے وقت سلام کرنا " بالفاظ دیگر شرکت طعام کیلئے اجازت طلب کرنا ہے

حاشیہ صفحہ ھذا ۱ غالباً یہ قصہ غار حرا کا ہے ۲ مراد نیکیاں ہیں۔

میں نے نافع بن یزید سے سنا ہے، اور دوسری حدیث جو حضرت انس سے مروی ہے وہ سب سے زیادہ ضعیف ہے:۔

ایک آدمی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا وہ "السلام علیک یا رسول اللہ" آپ نے فرمایا "وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ، ورضوانہ"، اس نے کہا یا رسول اللہ آپ نے مجھے ایسا سلام کیا ہے کہ اپنے صحابہ میں سے کسی کو نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا، تجھے ایسا سلام کرنے سے کس نے روکا، اگر کرتا تو اس سے زیادہ آدمیوں کا ثواب لیکر لوٹتا۔

اور یہ صحابیؓ حضراتِ صحابہؓ کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔

آپ تین مرتبہ سلام کیا کرتے تھے: صحیح بخاری میں حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی کلام کرتے تو ایک کلمہ کا تین مرتبہ اعادہ کرتے تاکہ سمجھ میں آجائے اور جب کسی قوم کے پاس جاتے تو تین مرتبہ سلام کرتے، شاید یہ طریقہ آپ کا اس جگہ ہو جہاں بہت سے آدمی ہوں، اور ایک مرتبہ سلام سب کو نہ پہنچ سکتا ہو۔ یا یہ عادت شریفہ دوسرے اور تیسرے آدمی کو سنانے کی ہو جبکہ پہلے سلام کے بارے میں یہ خیال ہو کہ دوسروں نے نہیں سنا ہوگا۔ ایسے ہی آپ نے اس وقت کیا تھا جب آپ سعد بن عبادہؓ کے یہاں تشریف لے گئے تھے، تو آپ نے تین مرتبہ سلام کیا تھا اور اس کے بعد لوٹنے لگے تھے[1]۔ اگر یہ عادت شریفہ ہمیشہ کی ہوتی تو

---

[1] واقعہ یہ تھا کہ حضرت سعد بن عبادہ اندر تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین (باقی ص ۳۶۳ پر)

آپ کے صحابہ بھی ایسا ہی کرتے۔ اور اگر غور کیا جائے تو معاملہ ایسے نہیں ہے بلکہ تکرار سلام عوارض کی وجہ سے عارضی طور پر تھا۔ واللہ اعلم

آپ ہمیشہ سلام میں ابتداء فرماتے تھے۔ اور جب جواب دیتے تو ویسا ہی یا اس سے افضل جواب دیتے اور فوراً بلا تاخیر کے جواب دیتے مگر عذر کی وجہ سے تاخیر بھی فرمادیتے، مثلاً قضاء حاجت، حالت صلوٰۃ کی وجہ سے، اور آپ کے سلام کا جواب، سلام کرنے والا سُن لیتا تھا، آپ ہاتھ سے یا سر سے سلام نہیں کرتے تھے مگر نماز میں اگر کوئی سلام کرتا تو اشارہ فرمادیتے[1] یہ چند احادیث سے ثابت ہے۔ اور اس کے خلاف مروی نہیں ہے، اور اگر ثابت ہے تو غیر صحیح اور باطل ہے جیسا کہ حدیث ابو غطفان میں ہے۔

من اشار فی صلوتہ اشارۃ	جس نے نماز میں بامعنی اشارہ کیا اُس کو
تفھم عنہ فلیعد صلاتہ	اپنی نماز لوٹانا چاہیے۔

ابو داؤد نے کہا ہے ابو غطفان رجل مجہول ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باقی حاشیہ ص۳۶۲ مرتبہ سلام کیا، وہ اندر آہستہ جواب دیتے رہے۔ جب حضور واپس ہونے لگے تو وہ گھبرا کر باہر آئے اور عرض کیا وہ آپ ہماری سلامتی کی دعائیں دے رہے تھے، اسی کی زیادتی کی حرص میں میں نے زور سے جواب نہیں دیا تھا۔ (ابو داؤد باب الاستیذان)

حاشیہ صفحہ ھذا: [1] نماز میں سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا عمداً ہو یا بھول کر ہو مفسد صلوٰۃ ہے۔ ابتدائے اسلام میں جائز تھا بعد میں منسوخ ہوگیا۔ لیکن اشارہ سے سلام کا جواب دینا مکروہ ہے مثلاً انگلی اٹھا دینا یا ہاتھ اٹھا دینا۔ البتہ ایسی صورت میں بعد فراغ کے سلام کا جواب دینا مسنون ہے اور متعدد احادیث سے یہی ثابت ہے کہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر سلام کا جواب دیا۔ لہذا علامہ کا یہ دعویٰ کہ اسکے خلاف ثابت نہیں غلط ہے۔ متواۃ ج۲ ص۶ بذل ص۹۵ ج۲

حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ نے کے اشارہ والی حدیث کو روایت کیا ہے۔

طریقہ سلام

ابتدائً آپ "السلام علیکم" فرماتے، آپ کو ابتداءً "وعلیک السلام" کہنا ناپسند تھا، حضرت ابوجری ھجیمی کہتے ہیں "میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، اور میں نے "وعلیک السلام یا رسول اللہ" کہا، آپ نے ارشاد فرمایا "وعلیک السلام" موتی کو سلام کیا جاتا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے

اس حدیث پر بعض لوگوں نے اشکال وارد کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے مردوں کے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "السلام علیکم" کہنا ثابت ہے ان لوگوں کو خیال ہوا "وعلیک السلام" جس کو تحیۃ الموتی قرار دیا ہے یہ ابتداءً ہے واقعۃً نہیں ہے، حالانکہ ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے، کیونکہ یہ واقعۃً ہے۔ ابتداءً نہیں ہے۔ شعراء عرب کا طریقہ یہی ہے کسی شاعر نے کہا ہے

علیک سلام اللہ قیس بن عاصم ورحمتہ ما شاء ان یرحما
فما کان ھلکہ ھلک واحدٍ ولکنہ بنیان قومٍ تہدما

قیس بن عاصم تجھ پر اللہ کا سلام ہو اور اس کی رحمت جتنی وہ رحمت چاہے
قیس بن عاصم کی موت فرد واحد کی موت نہیں ہے لیکن قوم کی بنیاد منہدم ہوگئی ہے

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مردوں کا سلام پسند نہیں تھا۔ اسی کراہت کی وجہ سے جب آپ کسی مسلمان کو جواب دیتے تو واو کو "لفظ" علیک سے مقدم کرتے۔

اس جگہ ایک مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ اگر کسی نے واو کو مقدم کیا تو کیا یہ جواب سلام صحیح ہوگا؟ ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ جواب نہیں ہے۔ اور اس طرح کہنے سے فرضیت جواب ساقط نہیں ہوگی، کیونکہ یہ جواب طریقہ مسنونہ کے خلاف ہے

کیونکہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ جواب ہے یا ابتدائً سلام ہے، کیونکہ صورۃً
تو دونوں لفظ ٹھیک ہیں۔ اور اس لئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
ہے کہ :- جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو تم جواب میں صرف " وعلیکم " کہدو۔ اس سے
اس طرف اشارہ ہے کہ جوابی سلام میں واؤ ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ واؤ کی وجہ
سے، اول جملہ کی تقریر اور ثانی جملہ کا اثبات ہوتا ہے۔ لہٰذا جب آپ نے اہل کتاب کے
جواب میں " وعلیکم " فرمایا، کیونکہ وہ " السام علیکم " کہتے تھے، تو مسلمانوں کو
جواب دینے میں تو واو کا ہونا ضروری ہوا، دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ بلا واؤ کے
بھی سلام کا جواب صحیح ہے اور امام شافعیؒ نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ انھوں نے
" کتاب الکبیر " میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے :-

هَلْ اَتَاكَ حَدِیْثُ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ الْمُكْرَمِیْنَ اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ ای سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ۔

کیا آپ کو ابراہیمؑ کے بزرگ مہمانوں کا واقعہ معلوم ہے جب وہ ابراہیم کے پاس آئے تو انھوں نے کہا سلام، ابراہیم نے جواب دیا سلام یعنی سلامٌ علیکم۔

یہاں واو حذف ہے اور یہ اس وجہ سے کہ ابتدائً حذف ہے۔ اس کے علاوہ صحیحین
کی ایک حدیث جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے :-

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ
ذراع کا تھا، بہرحال پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد
فرمایا۔ جاؤ! فرشتوں کی جماعت کو سلام کرو، جو وہ سلام کا
جواب دیں وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہے۔ چنانچہ
حضرت آدم علیہ السلام نے جا کر کہا " السلام علیکم " انھوں
نے جواب دیا " السلام علیکم ورحمۃ اللہ "۔

پس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ یہی سلام حضرت آدم اور حضرت آدم کی اولاد کا ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ مسلمان کو سلام کرنے کا امر ہے اور جواب میں اس جیسا ہی یا اس سے اچھا لفظ کہنا چاہیئے۔ اگر پہلا جیسا ہی کہدیا تو برابری رہی۔

اب رہی اہل کتاب کے سلام والی حدیث" اس میں اختلاف ہے یہ تین طرح پر مروی ہے۔ ایک طرح تو" واؤ" کے ساتھ، اس کو ابو داؤد، امام مالک نے روایت کیا ہے اور ثوری نے عبداللہ بن دینار سے روایت کیا "فعلیکم" اور سفیان ثوری کی روایت صحیحین میں بھی ہے۔ اور امام نسائی نے عبداللہ بن دینار کی حدیث ابن عیینہ کی سند سے بلا واؤ کے ہی بیان کی ہے اور مسلم اور نسائی کی روایت میں ہے "علیک" خطابی نے کہا ہے عام محدثین "وعلیکم" واؤ کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور سفیان بن عیینہ نے جو "علیکم" واؤ کے حذف کے ساتھ روایت کیا ہے وہی بہتر ہے، اور یہ اس وجہ سے کہ واؤ کے حذف ہونے سے بعینہٖ یہ اہل کتاب کا قول ہوا جو ان پر لوٹ گیا، اور واؤ کے ساتھ اشتراک لازم آتا ہے اور اس میں داخل ہونا لازم آتا ہے جو اہل کتاب نے کہا ہے اس لئے کہ واؤ حرف عطف ہے جو دو چیزوں کو جمع کے لئے آتا ہے اھ۔

جن حضرات نے واؤ کو روایت کیا ہے، ان کا معاملہ بھی مشکل نہیں ہے، اس لئے کہ "سام" کے معنی موت کے ہیں گویا، سلام کرنیوالا اور جس نے سلام کا جواب دیا ہے وہ اس میں مشترک ہیں، گویا واؤ کے ذریعہ، عدم اختصاص کا بیان ہے اور مشارکت کو ثابت کیا ہے اور واؤ کے حذف کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ سلام کرنے والا ہی اس کا زیادہ حقدار ہے۔ لہذا واؤ کا لانا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ امام مالکؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے:-

بعض حضرت "السام" کی تفسیر "سامت" سے کی ہے اس کے معنی ملالت اور سامتہ الدین کے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق واو کا حذف ہونا ضروری ہے لیکن یہ مشہور روایت کے خلاف ہوگا، اور لفظ مذکور کی تفسیر حدیث شریف میں موجود ہے

ان الحبۃ السوداء شفاء من کل داء الا السام	کالا دانہ (کلونجی) موت کے علاوہ سب بیماریوں کے لئے شفا ہے

اس میں اختلاف نہیں ہے کہ یہاں سام سے مراد موت ہے۔ بعض جاہلوں نے کہا ہے کہ اہل کتاب کو جواب میں "السَّام" کہہ دینا چاہیئے۔

اہل کتاب کو سلام

آپ نے ارشاد فرمایا ہے، اہل کتاب کو سلام کرنے کی ابتدار نہ کرو، اور اگر راستہ میں ملاقات ہوجائے تو راستہ کاٹ لو۔ کہا گیا ہے یہ ایک مخصوص واقعہ سے تعلق رکھتا ہے، جب مسلمان بنی قریظہ کے پاس گئے تھے" لیکن کیا یہی عام حالات میں حکم ہے؟ امام مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ذکر کی ہے:۔

لا تبدؤا الیھود ولا النصاری بالسلام۔	ابتدائے یہود، نصاری کو سلام نہ کرو۔

لیکن اسلاف میں اختلاف ہے۔ اکثر حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ ابتدار نہ کرنی چاہیئے بعض نے کہا ہے کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس کو ابن عباسؓ، ابی امامہؓ نے روایت کیا ہے اور یہی امام شافعی صاحبؒ کا مسلک ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ صرف "السلام علیک" بدون رحمۃ اللہ کے کہنا چاہیئے اور لفظ مفرد بولنا چاہیئے۔

ایک دوسری جماعت نے کہا ہے کبھی مصلحت کی وجہ سے یا خوف کی وجہ سے یا رشتہ داری کی وجہ سے ابتدار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسکو

ابراہیم نخعی اور علقمہ نے روایت کیا ہے۔ اور امام اوزاعی نے فرمایا اگر ابتدار نہ کرو تو یہ بھی صالحین کا طریقہ ہے۔ ... ... اور اگر ابتدار کرو تو یہ بھی صالحین کا طریقہ ہے جواب سلام کے بارے میں بھی اختلاف ہے جمہور کہتے ہیں جواب ضرور دینا چاہئے، اور ایک جماعت نے کہا ہے جواب دینا ضروری ہے، لیکن بہتر بات پہلی ہی ہے[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی مجلس سے گذرے جو مسلمانوں اور کافروں پر مشتمل تھی اور اس میں یہودی بھی تھے تو آپ نے سلام کیا[2]۔ اور ہرقل کو جو مکتوب گرامی لکھا تھا، اس میں تحریر فرمایا تھا، السَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔ یعنی جو ہدایت کی اتباع کرے اُس پر سلام[3]

---

[1] حدیث شریف میں مذکور ہے کہ یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں مسلمانوں کو ابتدار نہ کرنی چاہیے اس میں مشرکین بھی داخل ہیں۔ اور اگر وہ کریں تو "وعلیکم" ، ھداک اللہ وغیرہ قسم کے الفاظ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ صورت مسلمانوں کے غلبہ کی صورت میں ہے، اور اگر معاملہ برعکس ہو اور مضرت کا اندیشہ ہو تو ابتدا کرنے میں بھی مضائقہ نہیں لیکن اس صورت میں بھی اسلامی سلام کی اجازت نہیں بلکہ اشارے سے یا مناسب الفاظ میں استعمال کر لینا چاہیے، مثلاً آداب عرض وغیرہ علامہ بحیرمی نے کہا ہے۔ بل یحرم بکل کلام اشعر بتعظمہ الاٰیۃ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ۔ یعنی ایسا کلام بولنا جس سے اہل کفر کی عظمت ہوتی ہو اس آیۃ مبارکہ کے تحت حرام ہے اھ اوجز صفحہ ۳۷۵ ج ۶

[2] ایسی صورت میں کہ مشترک مجمع ہو سلام کرنے وقت نیت مسلمانوں کے لئے ہونا چاہیے۔

[3] اور یہ ظاہر ہے کہ ہدایت پر مسلمان ہی ہوتے ہیں اس لئے اس سلامتی کے وہی مستحق ہیں۔

آپ سے مروی ہے کہ جب کوئی جماعت گذرے تو ان میں سے ایک کا سلام کرلینا کافی ہے اور ایسے ہی مجلس میں سے ایک کا جواب دیدینا کافی ہے۔ اسی حدیث کی وجہ سے علماء نے کہا ہے کہ "سلام فرضِ کفایہ ہے، اس میں ایک آدمی کا سلام جماعت کی طرف سے کافی ہوجاتا ہے" لیکن کیا اچھا ہوتا کہ یہ حدیث ہوتی۔ اس کو ابوداؤد نے سعید بن خالد خزاعی سے روایت کیا ہے۔ ابو زرعہ نے کہا ہے راوی ضعیف ہے اور حاتم نے کہا ہے "راوی ضعیف الحدیث ہے" اور بخاری نے کہا اس میں نظر ہے اور دار قطنی نے کہا قوی نہیں ہے [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی جب کوئی کسی غیر کا سلام پہونچاتا تو آپ اس کو بھی اور پہونچانیوالے کو بھی "سلام کا جواب دیتے۔ سنن میں ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا میرے والد نے آپ کو سلام کہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ علیک وعلی ابیک السلام"

اور آپ کی عادت شریفہ تھی، اگر کسی سے کسی مکروہ چیز کا ارتکاب ہوجاتا تو نہ سلام کرتے اور نہ سلام کا جواب دیتے، جیسا کہ کعب بن مالک اور ان کے دونوں ساتھیوں کا واقعہ ہے کہ کعب نے آپ کو سلام کیا، فرماتے ہیں "معلوم نہیں حضور صلعم کے ہونٹ متحرک ہوئے یا نہیں" [2]۔ ایسے ہی عمار بن یاسر نے سلام کیا تو آپ نے جواب نہیں دیا، اور فرمایا "جا اس رنگ کو دھو کر آ۔ (ان کی اہلیہ نے ان کے کپڑے زعفران سے رنگ دیئے تھے) ایسے ہی حضرت زینب رضؓ سے دو مہینہ تک ترک سلام و کلام رکھا واقعہ یہ ہوا تھا کہ آپ نے حضرت زینب سے فرمایا تھا؛۔

---

[1] ملا علی قاری نے فرمایا جماعت میں سے ایک آدمی کا سلام کرنا سنت کفایہ اور مستحب ہے ایسے ہی جواب ہے کہ ایک کا جواب دیدینا کافی ہے، فرض کفایہ کا دعویٰ غلط ہے بذل ج ۶ ص ۳۲۵ [2] سورہ توبہ میں یہ واقعہ موجود ہے یہ صحابی رضؓ غزوہ تبوک میں شرکت سے رہ گئے تھے اس سے یہ ثابت ہوا کہ معصیت میں مبتلا لوگوں کو سلام نہ کرنا چاہئے۔

صفیہؓ کو وضو کا پانی دیدو! اور اُس کے اونٹ کی رسی کھولدو

تو حضرت زینبؓ نے کہا "کیا میں اس یہودیہ کو دوں۔

اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

استیذان آپ نے ارشاد فرمایا "استیذان تین مرتبہ ہے (یعنی گھر میں) داخل ہونے کے لئے اجازت طلب کرنا) اگر اجازت مل جائے تو بہتر ورنہ واپس ہو جانا چاہیئے" آپ نے ارشاد فرمایا "طلب اجازت آنکھ کی وجہ سے ہے۔ آپ نے یہ بھی ارادہ ظاہر فرمایا "جو کوئی میرے حجرے کے اندر، جھروکے سے دیکھے، جی چاہتا ہے کہ میں اُس کی آنکھیں پھوڑ دوں"، اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے" جو آدمی کسی کے گھر میں بلا اجازت دیکھے، کنکر مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دو، اگر اس سے آنکھ پھوٹ جائے تو کوئی گناہ نہیں ہے اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔

من اطلع علی قوم فی بیتھم بغیر اذنھم فقد حل لھم ان یفقؤا عینہ۔ جس نے کسی کے گھر میں بغیر ان کی اجازت کے جھانکا، اُن کے لئے حلال ہے کہ وہ اسکی آنکھ پھوڑ دیں۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ ان پر کوئی دیت نہیں، کوئی قصاص نہیں۔ اور آپ سے عملاً بھی اور تعلیماً بھی ثابت ہے کہ اجازت طلب کرنے سے پہلے سلام کیا جائے، چنانچہ ایک آدمی نے آپ سے حاضر ہونے کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا جاؤ! اس کو اجازت طلب کرنے کا طریقہ بتلاؤ، اور فرمایا، یوں کہو:۔

"السلام علیکم۔ "کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں؟"

چنانچہ اس نے جب اس طرح کہا تب آپ نے اُس کو اجازت دی، اور جب حضرت عمرؓ نے آپ سے اجازت طلب کی (یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ نے اپنی ازواج سے ایلاء کر کے یکسوئی اختیار کر لی تھی)، تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا "السلام علیک یا رسول اللہ" کیا عمر داخل ہو سکتا ہے؟ اور ابھی کلدہ بن حنبلؓ کا واقعہ گذر چکا ہے

کہ آپ نے ان کو نکال دیا تھا۔

اس سے ثابت ہوا کہ جن لوگوں نے کہا ہے کہ پہلے اجازت طلب کرنا چاہیے، اور پھر سلام کرنا چاہیے۔ ان کا قول غلط ہے۔ اور ان حضرات کا قول بھی غلط ہے کہ جنھوں نے کہا ہے اگر گھر والوں پر پہلے نظر پڑ جائے تو پہلے سلام اور پھر اجازت طلب کرنا چاہیے اور اگر نظر نہ پڑے تو پہلے اجازت اور پھر سلام کرنا چاہیے، یہ دونوں قول سنت کے مخالف ہیں۔

آپ کی عادت شریفہ تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کی تھی، اگر اجازت نہ ملتی تو واپس ہو جاتے۔ اس میں ان لوگوں کے قول کی تردید ہے جنھوں نے کہا ہے "اگر یہ خیال ہو کہ نہیں سنا ہے تو تین سے زیادہ مرتبہ بھی کہہ سکتے ہیں، اور یہ بھی کہا ہے کہ پھر کسی دوسرے لفظ سے اجازت مانگنا چاہیے۔ یہ دونوں قول بھی سنت کے خلاف ہیں۔

طریقۂ استیذان

آپ نے ارشاد فرمایا، اگر اجازت طلب کرنے والے کو کہا جائے "کون؟" تو بتلانا چاہیے فلاں بن فلاں ہوں (یعنی اپنا مشہور نام لے دینا چاہیے تاکہ پورا تعارف ہو جائے) اور یہ نہ کہے "میں ہوں" جیسا کہ جبرئیل علیہ السلام نے فرشتوں سے آسمان کا دروازہ کھلوایا تو کہا "میں جبرئیل ہوں" اور اسی طرح ہر آسمان سے گذرے۔ ایسے ہی صحیحین میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باغ میں تشریف رکھتے تو حضرت ابوبکر رض حاضر ہوئے، تو فرمایا کون؟ عرض کیا۔ ابوبکر ہوں پھر عمر رض کے بارے میں ایسے ہی اور عثمان رض کے بارے میں ایسا ہی ہوا۔[1]

اور صحیحین میں حضرت جابر رض کی روایت ہے۔ فرمایا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرمایا، کون؟ میں نے عرض کیا "میں ہوں" آپ نے فرمایا "میں میں ہوں" یعنی یہ برا معلوم ہوا، اور حضرت ام ہانی رض

---

[1] ابو داؤد باب الاستیذان

نے اجازت طلب کی تو فرمایا۔ کون، تو عرض کیا "ام ہانی" تو یہ برا نہیں معلوم ہوا، ایسے ہی جب حضرت ابو ذر سے فرمایا، تو انھوں نے کہا میں ابو ذر ہوں"۔ ایسے ہی ابو قتادہ کے ساتھ پیش آیا۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اذا دعی احدکم الی الطعام	تم میں سے جب کسی کی کھانے کی
ثم جاء مع الرسول فان ذلک	دعوت کی جائے پھر وہ قاصد کے ساتھ آئے
اذن لہ۔	تو یہی اس کے لئے اذن ہے۔

لیکن اس حدیث میں کلام ہے۔ ابو علی نے کہا ہے کہ قتادہ نے ابو رافع سے نہیں سنا ہے۔ صحیح بخاری میں اس کی سند یوں ہے۔ سعید عن ابی قتادہ عن ابی رافع عن ابی ھریرہ۔ اسی انقطاع کی وجہ سے بخاری نے اس حدیث کو تعلیقاً ذکر کیا ہے، اور اس باب میں دوسری حدیث ذکر کی ہے۔ جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دعوت خود مستقلاً اذن ہے۔ وہ حدیث مجاہد نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور صلعم نے ارشاد فرمایا۔

میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے ایک پیالہ میں دودھ رکھا پایا، آپ نے فرمایا "جاؤ! اہل صفہ کو بلا لاؤ، چنانچہ وہ آئے اور انھوں نے اجازت طلب کی۔ آپ نے ان کو اجازت دی، اور میں نے ان کو حاضر کیا اور وہ حاضر ہو گئے۔

علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے "یہ دونوں حدیثیں دو حالتوں کو بتلاتی ہیں۔ اگر داعی فوراً ہی واپس لوٹ آئے تو اجازت کی ضرورت نہیں، اور اگر تاخیر سے آمد ہو تو اجازت کی ضرورت ہے۔

علما کی دوسری جماعت نے کہا، اگر داعی کے پاس وہ آدمی موجود ہو جس کو مدعو کے آنے سے پہلے ہی اجازت دی جا چکی ہو تو اجازت کی ضرورت نہیں ہے اگر نہ موجود ہو تو اجازت کی ضرورت ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی ایسی جگہ تشریف لے جاتے کہ اس جگہ آپ کو تنہا رہنا پسند ہے تو آپ دروازہ پر کسی کو کھڑا کر دیتے تھے تو اس صورت میں کوئی بلا اجازت داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ استیذان جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے غلاموں کو اور نابالغ لڑکوں کو تین اوقات میں دیا ہے یعنی فجر سے پہلے دوپہر کے وقت اور نیند کے وقت، حضرت ابن عباس اس کا امر فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے لوگوں نے اس پر عمل کرنا ترک کر دیا ہے علماء کی ایک جماعت نے فرمایا ہے وہ منسوخ ہے۔ اُس کو دلیل میں پیش نہیں کیا جا سکتا، دوسری جماعت نے کہا منسوخ نہیں ہے بلکہ اب بھی مستحب ہے ہاں واجب اور ضروری نہیں ہے تیسری جماعت نے کہا ہے، اس امر کی مامور صرف عورتیں ہیں۔ مردوں کو تمام اوقات میں اجازت طلب کرنا ہوگی" اور اس قول کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے، اگرچہ اس کا اطلاق عورتوں کے لئے تغلیباً جائز قرار دیا جا سکتا ہے

علماء کی ایک اور جماعت نے اس کا بالکل عکس کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے مامور صرف مرد ہی ہیں عورتیں نہیں ہیں۔ انھوں نے "الذین" جو مذکر کے لئے مستعمل ہوتا ہے، کی طرف نظر کرتے ہوئے یہ کہا ہے لیکن سیاق آیت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

ایک جماعت نے یہ کہا ہے، اس وقت طلب اجازت، ضرورتاً تھا پھر ختم ہو گیا کیونکہ جب ضرورت ہی نہ رہی تو امر بھی نہ رہا۔ ابو داؤد نے سنن میں روایت کیا ہے

چند عراقیوں نے حضرت ابن عباسؓ سے عرض کیا، "آیت مبارکہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ

مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ" (ترجمہ:- ایمان والو! تمہارے لونڈی غلاموں کو تم سے اجازت طلب کرنا چاہیے) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ رحیم و کریم اپنے بندوں کے پردہ کو پسند کرتا ہے۔ اس زمانہ میں دروازوں پر پردہ نہیں ہوتا تھا، بعض دفعہ کوئی خادم یا لڑکی یا لڑکا اس حالت میں بھی داخل ہو جاتے تھے کہ آدمی اپنی اہلیہ کے پاس ہوتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پوشیدہ اوقات میں طلب اجازت کا امر فرمایا، لیکن جب لوگوں کے گھروں پر مالداری کی وجہ سے پردہ آگیا تو یہ امر باقی نہ رہا۔

بعض حضرات نے حضرت ابن عباسؓ سے اس روایت کے ثبوت کا انکار کیا ہے اور اس روایت میں عکرمہؓ پر طعن کیا ہے، حالانکہ اس روایت کو بخاری و مسلم نے بطور استدلال پیش کیا ہے لہذا اس انکار کو زیادتی محض قرار دیا جائے گا۔

ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت محکمہ ہے، اس کا کوئی معارض نہیں ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے، اگرچہ اکثر لوگوں نے عمل کرنا ترک کر دیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اگر دروازہ پر کیواڑ وغیرہ ہوئے یا کوئی آہٹ کی چیز ہو تو طلب اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر نہ ہو تو پھر اجازت لینا چاہئے۔ یہ حکم علت کے ساتھ وابستہ ہے، اسی کی طرف آیت مبارکہ میں اشارہ ہے۔

چھینک کے آداب

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب فاذا عطس احدکم — اللہ تعالیٰ چھینک آنے کو پسند کرتا ہے اور جمائی کو ناپسند، جب تم میں سے کسی کو چھینک

وحمد اللہ کان حقا علی کل مسلم	آئے اور اس نے خدا کی حمد کی تو ہر مسلمان پر
سمعہ ان یقول لہ یرحمك اللہ	جس نے اُس کو سُنا ہے اس کے لئے یرحمك
واما التثاؤب فانما ھو من الشیطان	اللہ کہے لیکن جمائی وہ شیطان کی طرف سے
فاذا تثاءب احدکم فلیردہ ما	ہے، جب کسی کو تم میں سے جمائی آئے تو اس
استطاع فان احدکم اذا تثاءب	کو روکنا چاہیئے۔ اس لئے کہ جب تم میں سے
ضحك منہ الشیطان [1]	کسی کو جمائی آتی ہے تو شیطان ہنستا ہے۔

اور صحیح بخاری میں یہ حدیث بھی ہے "جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو "الحمد للہ" کہے اور اس کے لئے جوابًا سننے والا "یرحمك اللہ" کہے اور پھر جواب الجواب میں

یھدیکم اللہ و یصلح بالکم — اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے حال درست فرمائے

مسلم میں یہ روایت بھی ہے "جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے اور اس نے خدا کی حمد کی تو تم اُس کا جواب دو اور اگر حمد نہ کرے تو جواب نہ دو یعنی یرحمك اللہ نہ کہو! اور صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت یہ ہے

مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں۔ جب ملاقات ہو سلام کرے
جب مدعو کیا جائے تو منظور کر لینا چاہیئے اور جب چھینک آئے
اور وہ حمد کرے تو اس کا جواب دیا جائے۔ جب بیمار ہو تو
عیادت کی جائے اور جب مر جائے تو اس کے جنازہ میں
شرکت کی جائے۔

اور ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب چھینک آئے تو "الحمد للہ

---

[1] وجہ غالبًا اُس کی یہ ہے کہ چھینک سے سستی دور ہو جاتی ہے اور نیند کا غلبہ دور ہو جاتا ہے اور جمائی سے سستی آتی ہے اور نیند کا غلبہ ہونے لگتا ہے :

علیٰ کل حال" کہنا چاہئے اور اُس کا سننے والا "یرحمک اللہ" کہے اور پھر چھینکنے والا "یھدیکم اللہ ویصلح بالکم" کہے۔

ترمذی نے روایت کیا ہے، ایک آدمی نے حضرت ابن عمرؓ کے پاس چھینکا، اور کہا۔ الحمد للہ والسلام علیٰ رسول اللہ" حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا، ہم کو "الحمد للہ علیٰ کل حال" کہنا سکھلایا تھا، اور امام مالک نے بروایت نافع حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

تم میں سے جب کسی کو چھینک آئے اور اس کے لئے یہ کہا جائے "یرحمک اللہ" تو اس کے جواب میں یرحمنا اللہ وایاکم ویغفر لنا ولکم کہنا چاہیئے[1]

ظاہر حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ چھینک کا جواب فرض عین[2] ہے۔ اور کسی ایک کا کہنا کافی نہیں ہے۔ علماء کے اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے، اسی کو ابن ابی زید، ابن عربی نے اختیار کیا ہے اور اس کا رد نہیں ہے، اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

ایک آدمی کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینک آئی، تو اس نے کہا "السلام علیکم" حضور نے ارشاد فرمایا، وعلیک السلام وعلیٰ امک، اور پھر ارشاد فرمایا، جب کسی کو چھینک آئے تو خدا کی حمد کرے اور اس کے جو پاس ہو "یرحمک اللہ" کہے۔ اور اس کے جواب میں وہ یغفر اللہ لنا ولکم کہے

---

[1] ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہمارے اوپر اور تمہارے اوپر رحم فرمائے، اور ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے

[2] فرض کفایہ نہیں ہے۔ ملا علی قاری کا قول گذشتہ حاشیہ میں آچکا ہے۔

اس حدیث میں "وعلی امك" یعنی تیری ماں پر بھی سلامتی ہو" اس میں ایک لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ یہاں "السلام علیکم" بے محل ہے۔ جیسا کہ جواب میں "وعلی امك" بے محل ہے۔ اس سے زیادہ ایک لطیف نکتہ اور ہے وہ یہ کہ اس جگہ ماں کو یاد کرنا یا اس کی طرف نسبت کرنا، اس طرف اشارہ ہے وہ محض ام محض، یعنی صرف جننے کی حد تک ماں ہے۔ اس نے تربیت کچھ بھی نہیں کی۔ یہ ایک قول ہے، لیکن اس لفظ کے بارے میں دوسری بحث یعنی "النبی الامی" وہ جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ پڑھ سکتا ہو، اور وہ امی جس کے پیچھے نماز درست نہیں ہوتی وہ ہے جو سورۂ فاتحہ بھی نہ جانتا ہو، اگرچہ علوم کثیرہ کا عالم ہو۔

اس جگہ "اُم" کا ذکر کر کے زمانہ جاہلیت کے ایک بیہودہ فخر کی بھی تردید ہے، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں فخریہ باپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اس جگہ باپ کی جگہ ماں کا ذکر کر دینے سے نہایت عمدہ طور پر اس طریقہ کی تردید ہو گئی۔ واللہ اعلم۔

بہر حال چھینکنے والے کو چھینک کی وجہ سے بڑی نعمت اور منفعت حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ گیس جو دماغ میں محصور تھا اگر خارج نہ ہوتا تو دس قسم کے امراض پیدا ہو جاتے اسی وجہ سے یہاں خدا کی حمد کو مشروع قرار دیا ہے کہ اعضائے انسانی اس (چھینک) زلزلے کے آنے کے باوجود اپنی اصلیت اور ہیئت پر باقی ہے۔ یہ زلزلہ بدن کے لئے ایسے ہی ہے جیسے زمین کا زلزلہ

(تشمیت) دو طرح سے مروی ہے، بالسین اور بالشین معنی ایک ہی ہیں۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور کہا ہے ہر داعی الی الخیر مشمت اور مسمت ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "سین" سے اچھی علامت مراد ہے، اس لئے کہ چھینک کی وجہ سے اعضاء میں ایک عجیب سی حرکت پیدا ہو جاتی ہے، اس وقت اس کے لئے دعا کرنا "اللہ تعالیٰ تیرے اوپر رحم کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اس چیز اور کیفیت کو دور کر دیا جس کو دیکھ کر دشمنوں کو

ہنسی آتی، اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دعا اللہ تعالیٰ کی طاعت میں قائم اور ثابت رہنے کے لئے ہے اس لفظ کو "شموات" جس کے معنی "قوائم" کے ہیں، سے ماخوذ مان لیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "شیطان نے آدمی کو خدا کی حمد سے روکنا چاہا تھا لیکن اس کے باوجود حمد کی گئی تو اس کی ثابت قدمی کے لئے دعا ہے، اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

یہ کہ نفس چھینک آنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کیونکہ اس میں خدا کی حمد مسلمان کے لئے دعائے رحمت اور دعائے مغفرت موجود ہے اور اُس سے شیطان کو غصہ آتا ہے اور وہ رنجیدہ ہوتا ہے۔ گویا یہ دعا اس کے حق میں غنیمت ہوئی اور یہ معنی بہت لطیف ہیں۔ اگر چھینکنے والا ان پر آگاہ ہو جائے اور چھینکنے میں بدن اور قلب دونوں کی منفعت ہے فللّٰہ الحمد وھو اھلہٗ۔

ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ذکر کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چھینک آتی تو آپ منہ میں ہاتھ یا کپڑا رکھ لیتے تھے۔ اور دبی ہوئی آواز نکلتے تھے۔" ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ بھاری چھینک اور بھاری جمائی دونوں ہی شیطان کی طرف سے ہیں۔ اور آپ سے روایت کیا گیا ہے کہ چھینک اور جمائی دونوں ہی میں آواز بلند کرنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ آپ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ ایک آدمی کو آپ کے پاس چھینک آئی تو آپ نے اس کے لئے فرمایا "یرحمك اللّٰہ" دوسری مرتبہ آئی تو فرمایا "زکام ہو گیا ہے"۔ ترمذی نے بروایت سلمہ، ذکر کیا ہے کہ ایک آدمی کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھینک آئی تو آپ نے "یرحمك اللّٰہ" فرمایا، اور دوسری و تیسری مرتبہ آئی تو آپ نے فرمایا "زکام ہو گیا ہے"

ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "اپنے بھائی کو تین مرتبہ چھینکنے کا جواب دو، اگر زیادہ بار چھینکے تو وہ زکام ہے" اس حدیث کے بارے میں ابوداؤد نے کہا میں اس حدیث کے بارے میں صرف اسی قدر جانتا ہوں کہ ابوسعید نے اس کو مرفوع

بیان کیا ہے۔ اور کہا اس حدیث کو ابو نعیم عن موسیٰ بن قیس عن محمد بن عجلان عن سعید عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی روایت کیا ہے، اور موسیٰ بن قیس کوفی ہیں۔ ان کے بارے میں یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ وہ ثقہ ہیں۔ ابو حاتم نے کہا ہے "لا باس بہ" اور ابوداؤد نے عن عبید اللہ بن رفاعہ زرقی سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چھینک کا جواب تین مرتبہ ہے" اس کے بعد رک جاؤ"۔ لیکن اس حدیث میں دو علت ہیں ایک تو یہ کہ یہ مرسل ہے، دوسری یہ ہے کہ عبید کو صحبت حاصل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اسکی سند میں یزید بن عبدالرحمن دالانی ہے، اس کے بارے میں کلام ہے، البتہ اس باب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث اور ہے وہ یہ کہ اگر کسی کو چھینک آئے تو اس کا ہمنشیں جواب دے" اگر تین مرتبہ سے زیادہ آئے تو اسے زکام ہو گیا ہے۔ یہ وہی حدیث ہے جس کو ابوداؤد نے کہا ہے (ابو نعیم نے کہا ہے) اور یہ حدیث حسن ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ زکام والا تو اور بھی زیادہ دعا کا مستحق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے لئے مریضوں کی طرح سے دعا کی جائے لیکن چھینکنے کی سنت یہی ہے جو مذکور ہوئی، اور یہ ایک نعمت ہے (مرض نہیں) اور اس کی حد تین ہی ہو سکتی ہے زیادہ کی صورت میں اس کو مرض قرار دیا جائے گا، اور عافیت کے لئے دعا کی جائیگی، حدیث میں "مزکوم" کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہے اور علاج کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں حکمت اور ہدایت ہے۔

علماء کا اختلاف ہے کہ اگر حاضرین میں سے بعض نے سنا اور بعض نے نہیں سنا تو اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ ظاہری قول یہی ہے کہ "حمد" کو سنا ہو یا نہ سنا ہو جواب دینا چاہیے۔ اس لئے کہ سننا مقصود نہیں بلکہ نفس حمد مقصود ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ گونگا ہو اور اس کے ہونٹ حرکت کریں، تو اس سے یہی مراد ہوگا، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا ہے کہ جب حمد کرے تب جواب دو" یہی قول صواب ہے

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر کوئی، حمد کرنا بھول جائے تو سننے والے کو کہہ دینا چاہئے یہی ابراہیم نخعی سے مروی ہے اور یہ ایک قسم کی نصیحت اور امر بالمعروف ہے لیکن ظاہر سنت سے ابن عربی کے قول کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا حمد کے دعا منقول نہیں ہے اور یہ ایک قسم کی محرومی ہے۔

ف۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں یہودی دعا کے لالچ میں آکر چھینکا کرتے تھے تو آپ ان کے لئے فرمایا کرتے تھے یھدیکم اللہ ویصلح بالکم، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے اور تمہاری حالت درست کرے۔

دعائے استخارہ

آپ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کسی کو کوئی مہم درپیش ہو تو فرض نماز کے علاوہ دو رکعت پڑھے اور اس کے بعد یہ پڑھے۔

اللھم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسئلک من فضلک العظیم فانک تقدر ولا اقدر و تعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب اللھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر خیرلی فی دینی و معاشی وعاجل امری وآجلہ فاقدرہ لی ویسرہ لی وبارک لی فیہ وان کنت تعلم شرالی فی دینی و ومعاشی وعاجل امری آجلہ فاصرفہ عنّی واصرفنی عنہ واقدر	اے اللہ میں آپ سے خیر چاہتا ہوں آپ کے علم سے اور قدرت چاہتا ہوں آپ کی قدرت سے اور آپ سے آپ کا فضل عظیم مانگتا ہوں تو قادر ہے میں قادر نہیں تو جانتا ہے میں جانتا نہیں اور تو غیبوں کو خوب جانتا ہے۔ اے اللہ اگر تو اس امر میں میرے لئے خیر جانتا ہے میرے دین میں اور معاش میں، موجودہ اور آئندہ معاملات میں تو اس کو میرے لئے مقدر فرما اور میرے لئے آسانی فرما اور برکت دے اور اگر تو اس میں کوئی شر میرے میرے دین اور معاش کے بارے میں جانتا ہے موجودہ معاملہ میں اور آئندہ معاملہ میں

لی الخیر حیث کان   تو اس کو مجھ سے ہٹا دے اور میرے لئے جہاں

کہیں بھی ہو خیر مقدر فرما

ارشاد فرمایا، اور اپنی حاجت کا نام لے، اس کو بخاری نے روایت کیا ہے، آپ نے اپنی اُمت کو یہ دعا تعلیم فرما کر طریقۂ جاہلیت سے ہٹایا ہے، وہ جو پرندے اڑا کر اور تیروں کے ذریعہ فال لیا کرتے تھے اس قرعہ اندازی سے مشرکین غیب پر آگاہی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس طریقہ کا نام "استقسام" تھا۔ یہ باب استفعال سے ہے اس کی جگہ آپ نے عبودیت کا طریقہ تعلیم فرمایا، اس لئے کہ تمام خیر اور اچھائیاں اسی کے قبضہ میں ہیں، اس کے علاوہ برائیوں کو کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ وہ جب کسی بندے کے لئے رحمت کے دروازے کھولے تو کوئی بند نہیں کر سکتا، اور جب بند کر دے تو کھول نہیں سکتا۔ یہ دعا خوش بخت اور نیک لوگوں کا طریقہ ہے۔ اہل شرک کے لئے کوئی طالع نہیں، ان کی تو ذلت اور رسوائی ہے۔

اس دعا میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور صفات کا اقرار ہے اس کے کمال علم اور قدرت اور اس کی ربوبیت کا اقرار ہے، اپنے معاملہ کو اس کے سپرد کرنا، اس سے مدد مانگنا اور اس پر توکل کرنا، اپنے عجز کا اعتراف کرنا وغیرہ سب کچھ اس میں موجود ہے مسند امام احمد میں سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

ابن آدم کی سعادت استخارہ کرنے اور رضا بالقضا میں

ہے اور اس کی بدبختی اس کے ترک اور اظہار ناپسندیدگی میں ہے۔

مقام غور ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک بختی اور بدبختی کو کس طرح تقدیر الٰہی اور توکل پر مشتمل کر دیا ہے، اور نسائی نے مشہور دعا میں "اسئلك الرضأ بعد القضاء" کا اضافہ اور روایت کیا ہے اور یہ رضا بالقضا سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ کبھی کسی معاملہ میں عزم ہوتا ہے تو قضاء الٰہی کی وجہ سے وہ ختم ہو جاتا ہے اور

قضاء الٰہی کے بعد بھی عزم اگر باقی رہتا ہے تو یہ ایک حال اور مقام ہے غرضکہ استخارہ میں توکل علی اللہ کی تعلیم ہے۔ اور تفویض امر اللہ کی طرف ہے اور یہ لوازم رضا میں سے ہے۔ اور جس نے اسلام کا ذائقہ نہیں چکھا، اُس کو یہ کیفیت حاصل نہیں ہوتی ہے، اگرچہ زبردستی مقدر پر راضی ہے۔ اور امام بیہقی وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی سفر کے لئے کھڑے ہوتے تو یہ دعا ضرور پڑھا کرتے تھے

اللھم بك انتشرت والیك توجهت وبك اعتصمت وعلیك توكلت، اللھم انت ثقتی وانت رجائی اللھم اكفنی ما اھمنی ومالا اھتم وما انت اعلم به منی عز جارك وجل ثنائك ولا الٰه غیرك اللھم زودنی التقوٰی واغفرلی ذنبی ووجھنی للخیر اینما توجھت

سواری پر سوار ہونا جب آپ سوار ہوتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے اور اس کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے۔

سبحان الذی سخرلنا ھذا وماکنالہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون

وہ ذات پاک ہے جس نے ہمارے لئے اس کو مسخر کیا اور ہم اس کو تابع نہیں کر سکتے تھے اور ہمیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے

اللھم انی اسئلك فی سفری ھذا البر والتقوٰی ومن العمل ما ترضی اللھم ھون علینا السفر واطولنا البعد۔ اللھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ ۔۔۔۔۔۔

اے اللہ میں اپنے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ مانگتا ہوں، اور وہ عمل مانگتا ہوں جو تجھے پسند ہو۔ اے اللہ ہم پر یہ سفر آسان کر اور ہمارے لئے دوری کو لپیٹ دے تو ہی سفر میں ساتھی ہے اور ہمارے گھر والوں کا

فی الاهل، اللھم اصحبنا فی سفرنا — نگراں ہے۔ اے اللہ ہمارے سفر میں ساتھ رہ اور
واخلفنا — ہمارے گھر والوں کا نگراں رہ۔

اور جب آپ سفر سے لوٹتے تو یہ فرماتے۔ — ہم لوٹنے والے، توبہ کرنیوالے اگر اللہ نے چاہا
آئبون تائبون انشاء اللہ عابدون — عبادت کرنے والے اور اپنے رب کی حمد
لربنا حامدون — کرنیوالے ہیں۔

اور امام احمد نے روایت کیا ہے کہ آپ یہ دعا پڑھتے تھے "انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی السفر والخلیفۃ فی الاھل اللّٰھم انی اعوذبک من الھم فی السفر والکآبۃ فی المنقلب اللّٰھم اقبض لنا الارض وھون علینا السفر

اور آپ جب سفر سے لوٹتے (تو وہی دعا پڑھتے جو گذر چکی ہے) اور جب شہر میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے۔

توبا توبا لربنا اوبا لا یغادر علینا حوبا

اور امام مسلم نے سفر شروع کرنے کی دعا میں (کآبۃ المنقلب کے بعد) اس قدر اضافہ اور روایت کیا ہے:۔

ومن الحور بعد الکور ومن دعوۃ المظلوم
ومن سوء المنظر فی الاھل والمال

جب آپ سواری پر قدم رکھتے تو بسم اللہ کہتے اور جب اس پر سیدھے ہو جاتے تو " الحمد للہ ۳ مرتبہ، اللہ اکبر ۳ مرتبہ، پھر سبحان الذی سخر لنا ھٰذا پڑھتے۔ پھر سبحان اللہ ۳ اور پھر

لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من
الظالمین۔ سبحانک انی ظلمت نفسی فاغفرلی
انہ لا یغفر الذنوب الا انت۔ پڑھتے۔

ایک آدمی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، "میں سفر کا ارادہ کر رہا ہوں آپ کوئی نصیحت فرما دیجئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ نصیب فرمائے، اس نے کہا اور زیادہ فرمائیے۔ آپ نے فرمایا" اللہ تیرے گناہ معاف کرے، اس نے کہا اور کچھ؟ آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تیرے لئے خیر کو آسان کرے تو جہاں کہیں بھی ہو،

ایک آدمی نے آکر عرض کیا میں سفر پر جا رہا ہوں، آپ نے ارشاد فرمایا تقویٰ اختیار کرو، اور جب کسی بلندی پر چڑھو تو تکبیر کہو۔ جب وہ جانے لگا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس کے لئے سفر آسان فرما۔

آپ اور آپ کے صحابہ جب کسی ٹیلہ پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب اترتے تو سبحان اللہ کہتے اور نماز کی وضع بھی ایسے ہی ہے۔ حضرت انس رضؓ نے روایت کیا ہے، جب آپ کسی بلندی پر چڑھتے تو کہتے:۔

اللّٰھم لك الشرف علیٰ کل شرف — اے اللہ تجھے ہر بزرگی پر بزرگی حاصل ہے

ولك الحمد علیٰ کل حال — اور تیری ہر حال میں حمد ہے

آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ فرشتے اس قافلہ کے ساتھ نہیں ہوتے جس میں جرس (گھنٹہ) یا کتا ہو۔ آپ مسافر کے لئے رات میں تنہا سفر کو پسند نہیں فرماتے تھے آپ نے ارشاد فرمایا" اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تنہا سفر کرنے میں کیا خرابی ہے تو کوئی تنہا سفر نہ کرے۔ آپ نے ارشاد نے فرمایا ہے:۔

ان الواحد شیطان و الاثنان شیطانان والثلاثۃ رکب — ایک، ایک شیطان اور دو، دو شیطان اور تین جماعت ہیں۔

اور جب کوئی منزل پر اترے تو یہ دعا پڑھے

اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّاتِ — اللہ کے کامل ترین کلمات کے ذریعہ

مِن شَرِّ مَا خَلَقَ — تمام مخلوق کی برائیوں سے میں پناہ چاہتا ہوں

اس کے پڑھنے سے رخصت ہونے تک کوئی چیز ضرر نہ پہونچائے گی۔ اسی طرح امام مسلم نے روایت کیا ہے اور امام احمد نے روایت کیا ہے کہ جب آپ کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے یا سفر کرتے اور رات ہو جاتی تو یہ دعا پڑھتے۔

یا ارض ربی و ربک اللہ اعوذ باللہ من شرک و شر ما فیک وشر ما خلق فیک وشر ما دب علیک اعوذ باللہ من شر کل اسد واسود وحیۃ و عقرب ومن شر ساکن البلد ومن شر والد وما ولد

اے زمین، میرا اور تیرا رب اللہ ہے میں تیرے شر، اور جو تجھ میں ہے اس کے شر اور جو تجھ پر چلتا ہے اُس کے شر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور خدا کی پناہ چاہتا ہوں ہر شیر سے اور ہر کالے سانپ اور دوسرے سانپوں سے، بچھو سے، اور شہر میں رہنے والوں کے شر، اور ہر جننے والے اور جنے ہوئے کے شر سے

آپ نے ارشاد فرمایا، جب تم سبزہ زار سے گذرو تو اونٹ کو اُس کا حق دو (یعنی اسکو چراؤ) اور جب بنجر زمین سے گذرو تو تیزی سے گذر جاؤ، اور جب کہیں شب باشی اختیار کرو تو راستہ سے ہٹ کر کرو، کیونکہ راستہ رات کو جانوروں کے چلنے کی جگہ ہے، اور درندوں کی گذرگاہ ہے۔ اور جب آپ کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس کو دیکھتے ہی فرماتے

اللھم انا نسألک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا ونعوذ بک من شرھا ومن شر ما فیھا

اے اللہ ہم آپ سے اس بستی کی اور اس کے ساکنوں کی بھلائی مانگتے ہیں اور اس کے شر اور اس کے ساکنوں کے شر سے پناہ مانگتے ہیں

اور جب حالت سفر میں صبح ہوتی تو تین مرتبہ بلند آواز سے یہ دعا پڑھتے۔

سمع سامع بحمد اللہ ونعمتہ وحسن بلائہ علینا ربنا صاحبنا

سننے والے نے سُنا، اللہ کی حمد اور اس کی نعمت کو، اور اچھا کیا اُس کی بلا یا کو ہم پر، اے ہمارے

وافضل علینا عائذاً باللہ من النار — رب ہمارے ساتھ رہ اور فضل فرما ہم پر ہم اللہ کی دوزخ سے پناہ لیتے ہیں۔

اور سفر میں قرآن پاک لیجانے سے منع فرماتے جبکہ دشمنوں کی طرف سفر کیا جائے تاکہ دشمن اس کو حاصل کر کے بے حرمتی نہ کریں، اور عورت کو بلا محرم کے سفر کرنے سے منع فرماتے خواہ سفر ایک برید ہی کا کیوں نہ ہو[1]۔ اور مسافر کو حکم فرماتے کہ جب وہ ... ...

بلندی پر چڑھے، تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہے اور فرماتے لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیئ قدیر آئبون الخ صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔ اور جب آدمی بہت دنوں کے بعد سفر سے واپس ہو تو آپ نے فرمایا ہے کہ وہ رات کو گھر نہ پہنچے۔ چنانچہ صحیحین میں مروی ہے کہ آپ صبح کے وقت یا شام کے وقت تشریف لے جاتے اور سب سے پہلے بچوں سے ملاقات کرتے۔ عبداللہ بن جعفر فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے تو مجھے گود میں سامنے بٹھالیا۔ پھر بعد میں حضرت فاطمہ رض کے صاحبزادوں حسن رض وحسین رض آگئے، تو ان کو اپنے پیچھے بٹھایا، اس طرح ہم مدینہ منورہ میں ایک سواری پر تین سوار ہو کر داخل ہوئے۔

اور آپ سفر سے آنے والے سے معانقہ فرماتے اور آپ کے اہل میں سے اگر کوئی ہوتا تو اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے، حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں جب زید بن حارثہ مدینہ منورہ

---

[1] حنفیہ کے نزدیک سفر شرعی (تین دن تین رات) بلا محرم کے جائز نہیں ہے۔ مسلم وغیرہ میں صحیح احادیث موجود ہیں، یہاں علامہ نے اسی اصول کے تحت بات کہی ہے جو وہ بیان کر چکے ہیں یعنی ان کے نزدیک قصر صلوۃ کے لئے تحدید مسافت نہیں ہے۔

میں داخل ہوئے تو حضورؐ میرے یہاں تھے۔ زید بن حارثہ آئے اور انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، آپ فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔ آپ کا کپڑا گھسٹ رہا تھا، خدا کی قسم آج سے پہلے یا بعد میں، میں نے آپ کو عریاں نہیں دیکھا، آپ نے ان سے معانقہ کیا اور بوسہ لیا۔ شعبی کہتے ہیں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے آتے تو معانقہ کرتے[1]۔ اور جب آپ سفر سے آتے تو پہلے مسجد میں داخل ہوتے اور دو رکعت ادا فرماتے۔

اذکارِ نکاح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے لوگوں کو خطبۂ حاجت سکھلایا (اس جگہ پورا خطبہ نکاح روایت کیا ہے بوجہ شہرت اس کو نقل نہیں کیا گیا) شعبہ نے کہا۔ میں نے ابواسحٰق سے دریافت کیا، کیا یہ خطبۂ نکاح ہے یا ہر حاجت کے لئے یہی خطبہ ہے، فرمایا ہر حاجت کے لئے یہی خطبہ ہے؟ اور فرمایا جب تمھیں عورت میسر ہو یا خادم یا کوئی جانور تو اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا پڑھو۔

اللّٰھم انی اسئلك خیرھا وخیر ما جبلت علیه واعوذبك من شرھا ومن شر ما جبلت — اے اللہ میں آپ سے اس کی بھلائی اور اس میں جو بھلائی ودیعت فرمائی ہے مانگتا ہوں اور اس کے شر اور اس میں جو شر ودیعت فرمایا ہے اس سے پناہ مانگتا ہوں

اور نکاح ہونے کے بعد آپ یہ دعا پڑھا کرتے۔

بارك الله لك وبارك علیك وجمع بینكما فی خیر — اللہ تعالیٰ تیرے لئے برکت دے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے اور تم دونوں کو خیر میں جمع فرمائے

---

[1] واضح ہے عیدین کے موقعہ پر جو معانقہ کیا جاتا ہے وہ بدعت ہے، معانقہ سفر سے لوٹنے کے بعد ہے۔ واللہ اعلم

اور آپ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنی اہل کے پاس آئے تو یہ دعا پڑھے

بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطان — اللہ کے نام کے ساتھ اے اللہ ہمیں

وجنب شیطان ما رذقتنا — شیطان سے بچا اور جو تو نے ہمارے لئے مقرر فرمایا ہے اُس کو شیطان سے بچا

آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جو بچہ مقدر فرمایا ہوگا، شیطان اس کو کبھی نقصان نہ پہونچا سکے گا۔

حضرت انس رض روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جب بندہ پر اللہ تعالیٰ مال یا اولاد کی نعمت عطا فرمائے اور وہ کہے :۔

ما شاء اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ تو وہ چیز موت کے علاوہ سب چیزوں سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ — اور جب تو اپنے باغ میں داخل

قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَا قُوَّةَ — ہوا تھا تو کیوں نہیں کہا تھا ما شاء اللہ

اِلَّا بِاللّٰهِ۔ — ولا قوۃ الا باللہ ؎

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی آدمی کسی کو بُرے حال میں دیکھے تو یہ پڑھے۔

الحمد للہ الذی عافانی — حمد اس ذات کی جس نے اس سے

مما ابتلاک بہ وفضلنی علی کثیر — محفوظ رکھا، جس میں تو مبتلا ہے اور مجھے

ممن خلق تفضیلا — بہت سی مخلوق میں فضیلت دی۔

؎ سورہ کہف میں دو بھائیوں کا واقعہ ہے ایک غریب تھا مگر شکر گذار اور ایک مالدار تھا مگر کفرانِ نعمت کرتا تھا اسکی وجہ سے اُس کے باغات تباہ ہو گئے تھے، تب اس کے بھائی نے اسکو یہ نصیحت کی تھی۔

تو اس کو یہ مصیبت کبھی نہ پہونچے گی۔

فال لینا اور خواب دیکھنا

آپ کے پاس "الطیرة" [۱] کا ذکر ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا، اس سے اچھی فال مراد ہے لیکن اس سے تقدیر الٰہی ٹل نہیں سکتی اور اگر کوئی بدفالی پیش آجائے تو یہ پڑھنا چاہیئے:

اللھم لا یاتی الحسنات الا	الٰہی تو ہی اچھائی لاتا ہے اور تو ہی
انت ولا یدفع السیئات الا انت	برائی دور کرتا ہے اور تیرے سوا کسی کو
لاحول ولا قوة الا بک۔	قوت حاصل نہیں۔

حضرت کعب فرماتے ہیں:۔

اللھم لا طیر الا طیرک ولا	الٰہی سوء حالی بھی تیری عطا ہے
خیر الا خیرک ولا رب غیرک	اور خیر بھی تیری عطا ہے اور تیرے سوا کوئی
ولاحول ولا قوة الا بک	رب نہیں اور تیرے سوا کسی کو قوۃ نہیں۔

اور فرمایا کہ یہ بہترین توکل اور اس کی اصل ہے اور بندے کے لئے جنت میں خزانہ ہے جو بندہ بھی یہ پڑھے گا اُس کو کوئی چیز نقصان نہیں پہونچا سکتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، رویائے صالحہ خدا کی طرف سے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے، جب کوئی برا خواب دیکھے تو بائیں جانب کو تھتکار دے اور تعوذ پڑھے، تو اس کو کوئی چیز نقصان نہیں پہونچا سکتی، اور اگر کوئی اچھا خواب دیکھے تو اس کو چھپائے، اور اپنے خاص آدمی کے علاوہ کسی سے نہ کہے (غیر آدمی حسد میں مبتلا ہو جائے گا، اور نقصان پہونچانے کے درپے ہوگا)

---

[۱] ۔ زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب سفر پر جاتے یا کسی کام کا آغاز کرتے تو پرند کو اڑاتے اگر وہ اڑ کر داہنی طرف جاتا تو سفر شروع کر دیتے اور بائیں طرف جاتا تو نہیں جاتے۔

اور آپ نے امر فرمایا ہے، خواب کے بارے میں ..... پانچ چیزوں کا امر فرمایا ہے
(۱) بائیں طرف تھتکارنا (۲) تعوذ پڑھنا (۳) کسی سے نہ کہنا (۴) کروٹ بدل دینا
(۵) نماز پڑھنا، اگر خواب دیکھنے والے نے ایسا کیا تو اس کو خواب کی کوئی مضرت نہ ہوگی
بلکہ اس کا شر دور ہو جائیگا۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ خواب بھی ایک قسم کی پیش گوئی ہے
جب تک تعبیر نہ لی جائے واقع نہیں ہوتی اور اس کو کسی دوست یا صاحب رائے سے
ہی ذکر کرنا چاہیے۔ اور حضرت عمر کے سامنے جب کوئی خواب بیان کرتا تو یہ فرماتے:۔

اللھم ان کان خیراً فلنا — اے اللہ اگر یہ اچھی ہے تو ہمارے لئے
وان کان شراً فلعدونا — اور بری ہے تو ہمارے دشمن کے لئے۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا جس کو خواب سنایا جائے تو اس کی اچھی ہی تعبیر دے، اور
آپ دیکھنے والے سے فرماتے، کیا تو نے یہی خواب دیکھا ہے (تاکہ اگر بھول ہو تو غور
کرلے) پھر اس کی تعبیر دیتے، اور عبدالرزاق نے بروایت ابن سیرین حضرت ابوبکر صدیق
کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جب وہ تعبیر فرماتے تو یہ کہتے "اگر یہ بات سچ بیان کی ہے تو
اس کی تعبیر یہ ہے"

وساوس کا علاج

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "انسان کے قلب میں ایک وسوسہ فرشتہ کی طرف سے ہوتا ہے اور
ایک وسوسہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ فرشتہ کا وسوسہ خدا کی طرف سے ایک
قسم کا وعدہ اور حق کی تصدیق اور نیکی کے ثواب کی امید کے لئے ہوتا ہے۔ اور
شیطان کا وسوسہ، برائی اور شرارت اور حق کی تکذیب کے لئے ہوتا ہے اور خیر سے
مایوس کرتا ہے۔ جب خیر کا وسوسہ دل میں آئے تو خدا کا شکر کرو، اور اللہ سے اس
کا فضل مانگو، اور جب شیطان کا وسوسہ پیدا ہو تو تعوذ اور استغفار کرو۔
حضرت عثمانؓ بن عاص فرماتے ہیں، ایک دفعہ شیطان میری نماز میں آکر

حائل ہوگیا، آپ نے ارشاد فرمایا، یہ شیطان ہے، اُس کا نام "خنزب" ہے، جب ... ایسا محسوس کرو، تو تعوذ کرو اور بائیں طرف ۳ مرتبہ تھوکو،

بعض صحابہؓ ... نے آپ سے شکایت کی کہ ہم بعض دفعہ نفس میں ایسا وسوسہ پاتے ہیں جو پسندیدہ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا "اللہ اکبر" اس نے شیطان کے پھندے کو وسوسہ سے مبدل کردیا، اور وسوسہ سے چھٹکارہ دیا۔ اور جب یہ وسوسہ پیدا ہو کہ "اس خدا نے پوری مخلوق کو پیدا کیا ہے، لیکن خدا کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ آیت پڑھا کرو:۔

هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شيئ عليم

وہی پہلے ہے اور وہی بعد میں وہی ظاہر ہے وہی پوشیدہ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے

اور حضرت ابن عباسؓ نے ابی زمیل سے فرمایا تھا، جب انھوں نے کہا تھا "میں اپنے جی میں ایک بات پاتا ہوں، دریافت کیا، کیا؟ عرض کیا، میں بتلا نہیں سکتا، فرمایا، کیا کوئی شک کی قسم ہے۔ عرض کیا ہاں، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ اور فرمایا یہ آیت پڑھ لیا کرو، بہرحال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت مبارکہ کے ذریعہ وساوس کا بطلان کردیا، اور یہ تعلیم فرمادیا کہ مخلوقات کا سلسلہ ابتدا سے آخر تک اول کی طرف لوٹتا ہے۔ اس کے بعد کوئی شے نہیں ہے۔ اور اگر اس سے پہلے کوئی چیز ہوتی تو لازماً مؤثر ضرور ہوتی، اور وہی رب اور خالق ہوتی۔ لہذا آخر میں سلسلہ رب اور خالق پر ختم ہوتا جو ہر چیز سے غنی ہے اور تمام اشیاء اُس کی محتاج ہیں۔ وہ قائم بنفسہ ہے اور اشیاء اپنے قیام میں اس کی محتاج ہیں اور وہ موجود بہ نفسہ اور تمام اشیاء کا وجود اس کی وجہ سے ہے، وہ ایسا قدیم ہے جس کا اول نہیں ہے، اور ہر چیز کی بقا اسی سے ہے، وہ اول ہے اس سے پہلے کوئی نہیں،

وہ ایسا ظاہر ہے کہ جس کے اوپر نہیں وہ ایسا باطن ہے جس کے سوا کوئی نہیں اور وہ ایسا آخر ہے جس کے بعد کوئی نہیں ہے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ہمیشہ یہ وسوسہ پیدا ہوتا رہے گا کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے لیکن خدا کو کس نے پیدا کیا ہے، اس وقت استعاذہ کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔	اگر شیطان کی طرف سے آپ کے دل میں کوئی چوکا لگے تو اللہ کی پناہ چاہو وہی سننے والا جاننے والا ہے۔

اور جبکہ شیطان کی دو قسمیں، ایک وہ جو دکھلائی دیتا ہے یعنی شیطان الانس اور دوسرے وہ جو دکھلائی نہیں دیتا، یعنی شیطان الجن، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہدایت کی کہ شیطان الانس سے اعراض اور درگذر کر کے بچو اور شیطان الجن سے استعاذہ کے ذریعہ بچو۔ اور ان دونوں قسم کے شیاطین کا ذکر سورہ اعراف، سورہ مومنین، سورہ فصلت میں ہے اور قرأت اور ذکر کے وقت استعاذہ کرنا، شیطان الجن کو دفع کرنے میں بہت مفید ہے اور عفو اور اعراض شیطان الانس کی شرارتوں سے بچنے میں بہت کارآمد ہے، کسی شاعر نے کہا ہے:۔

فما ھو الا الاستعاذۃ ضارعا اوالدفع بالحسنی ھما خیر مطلوب
وذالک دواء الداء من شرما یری وذالک دواء الداء من شر محجوب

غصہ کے وقت

آپ نے ارشاد فرمایا ہے، وضو کرکے، اور بیٹھ کر غصہ کی تیزی کو بجھاؤ، اگر کھڑے ہو اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ کر، اور استعاذہ پڑھو!

غصہ اور شہوت انسان کے قلب میں آگ کی دو چنگاریاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اتامرون الناس بالبر و — لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور

تنسون انفسکم — اپنے نفس کو بھلا دیتے ہو۔

اس آیۃ کو شدت شہوت پر عمل کیا جا سکتا ہے، اس چنگاری کو استعاذہ اور صبر و صلوٰۃ سے ختم کیا جا سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے امر فرمایا ہے کہ شیطان جب چونکا لگائے تو استعاذہ کرو، یاد رہے تمام گناہ شہوت اور غضب ہی سے پیدا ہوتے ہیں، مثلاً قوت غضب کی انتہا قتل ہے اور شدت شہوت کی انتہا زنا ہے، اور ان دونوں کو سورۂ انعام، سورۂ اسریٰ، سورۂ فرقان میں جوڑی دار قرار دیا ہے جس کا منشایہ ہے، ان دونوں کو نماز اور استعاذہ کے ذریعہ دفع کرنا چاہیئے۔

اچھی چیز کو دیکھ کر

جب آپ محبوب چیز کو دیکھتے تو فرماتے:۔

الحمد للہ الذی بنعمتہ — اس ذات کی حمد جس کی نعمت سے

تتم الصالحات — اچھائیاں مکمل ہوتی ہیں۔

اور جب بری چیز کو دیکھتے الحمد للہ علیٰ کل حال فرماتے۔

جب آپ کی مطلوبہ چیز کوئی آپ کے پاس رکھ دیتا تو آپ اس کو دعا دیا کرتے تھے، مثلاً حضرت ابن عباسؓ نے وضو کا پانی پیش کیا تو ان کو دعا دی۔ "اللہ اس کو فقہ فی الدین نصیب فرما" ایسے ہی ابو قتادہؓ کو ایک سفر میں آپ نے دعا دی "اللہ اس کی حفاظت فرما، اس نے تیرے نبی کی حفاظت کی ہے۔ اور آپ نے

ارشاد فرمایا "احسان کرنیوالے کو دعا دینی چاہیے جزاک اللہ" اس سے۔۔۔ اس کی کسی درجہ کی ثنا ہوگئی"۔ ایک مرتبہ آپ نے عبد اللہ بن ربیعہ سے قرض لیا اور پھر اُس کو ادا کر دیا، تو فرمایا "اللہ تعالیٰ تیرے اہل اور مال میں برکت دے۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا، قرضہ کی جزا حمد اور اس کی ادائیگی ہے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا، تو آپ اس کو قبول کر لیتے اور اس سے زیادہ بدلہ مرحمت فرماتے، اور اگر کبھی واپس کرتے تو عذر فرما دیتے تھے، جیسا کہ صعب بن جثامہ نے آپ کی خدمت میں شکار کا گوشت پیش کیا تو فرمایا "میں واپس نہ کرتا مگر میں محرم ہوں"۔

متفرقات

آپ نے اُمت کو امر فرمایا ہے کہ جب گدھے کی آواز سنو، تو اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہو اور جب مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو، اور آپ نے آگ لگتے وقت تکبیر پڑھنے کو فرمایا ہے تکبیر سے آگ بجھ جائیگی، آپ نے کسی مجلس کے لئے بھی یہ پسند نہیں فرمایا کہ وہ مجلس ذکر اللہ سے خالی ہو، آپ نے ارشاد فرمایا جو مجلس بھی بلا ذکر اللہ کے برخاست ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے گدھے کی لاش، اور جو بیٹھے اور ذکر اللہ نہ کرے وہ حسرت" ہے اور جو لیٹے اور ذکر نہ کرے وہ "حسرت" ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے جو آدمی راستہ چلا اور ذکر نہ کیا وہ حسرت" ہے، اور آدمی کسی فضول مجلس میں بیٹھ گیا اور اُٹھتے وقت اس نے یہ پڑھا۔

سبحانک اللھم وبحمدک اشھد

ان لا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک

تو اس سے اس مجلس کی فضولیات معاف ہو جاتی ہیں۔ ابوداؤد اور حاکم نے بیان کیا ہے کہ آپ ایک مجلس سے اُٹھے اور کچھ پڑھا تو ایک آدمی نے دریافت کیا تو

آپ نے ارشاد فرمایا یہ اس کا کفارہ ہے"

حضرت خالد بن ولیدؓ نے رات کو پڑھ کر سونے کی دعا کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا "جب تم بستر پر پہونچو تو یہ دعا پڑھا کرو۔

اللّٰھم رب السمٰوات السبع وما اظلمت
ورب الارضین السبع وما اقلت ورب الشیاطین
وما اضلت کن لی جاراً من شر خلقک کلھم
جمیعاً من ان یفرط احد منھم علی عز جارک
وجل ثناءک ولا الٰہ الا انت

اور آپ اپنے صحابہؓ کو دفع خوف کے لئے یہ دعا تعلیم فرمایا کرتے تھے۔

اعوذ بکلمات اللّٰہ التامة من شر غضبہ
ومن شر عبادہ ومن شر ھمزات الشیاطین

ایک صحابیؓ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا رات کو ڈر معلوم ہوتا ہے تو آپ نے یہی کلمات پڑھنے کو فرمائے۔

نوٹ :۔ اس جگہ علامہ نے الفاظ مکروہ واسماء مذمومہ الی فصل کا پھر اعادہ کیا ہے ہم نے ترک کر دیا ہے اس کے بعد تحریر فرمایا ہے)

اور ہواؤں کو برا نہ کہو بلکہ اسکی اچھائی کی دعا اور اُسکی برائی سے پناہ مانگو، اور منجملہ ان کے بخار کو بُرا کہنا ہے اس کو برا نہ کہو اسکی وجہ سے خطائیں معاف ہوتی ہیں اور مرغ کو بھی بُرا کہنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ وہ نماز کے لئے بیدار کرتا ہے اور قبائلی اور مذہبی تعصب سے بھی منع فرمایا ہے، ایسے ہی مشائخ وغیرہ کی وجہ سے فضیلت بگھارنے کو منع فرمایا ہے غرضکہ یہ سب کے سب جاہلیت کے دعوے ہیں۔

ان ہی بری باتوں میں سے مسلمان کو گالی دینا تین آدمیوں کی موجودگی میں دو کا علیحدہ

مشورہ کرنا، عورت کا اپنے شوہر سے کسی عورت کی خوبصورتی کو بیان کرنا اور اس طرح دعا کرنا، "خدایا اگر تو چاہے تو معاف کردے اور اگر تو چاہے تو رحم فرما"، زیادہ قسمیں کھانا، اور ان ہی بری باتوں میں سے یہ بھی ہے "آسمان میں جو رنگدار شے دکھائی دیتی ہے اسکو "قوس قزح" کہنا بھی ہے "لوجہ اللہ" سوال کرنا، مدینہ منورہ کو یثرب کہنا، اپنی عورت کو مارنے کیلئے کسی سے کوئی چیز مانگنا، ہاں اگر سخت ضرورت ہو تو جائز ہے، اور یوں کہنا "میں نے پورے رمضان کے روزے رکھے اور پوری رات نماز پڑھی۔ اور یہ بھی مکروہ ہے کہ "ایسے کھلے الفاظ میں اشیاء کا نام لینا جنکو کنایۃً ذکر کرنا مناسب ہے۔ اور "اطال اللہ بقاءک" یا "ادام اللہ ایامک" کا کہنا، یا تو ہزار سال زندہ رہے، اور روزہ دار کا یہ کہنا قسم اس ذات کی جس نے میرے منہ پہ مہر لگا دی ہے، کیونکہ مہر تو کافر کے منہ پر لگائی جاتی ہے، اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو تاوان یا ڈنڈ کہنا، اور یہ کہنا میں نے اس دنیا میں بہت مال خرچ کیا ہے، اور مسائل اجتہاد میں مفتی کا یہ کہنا کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے یا یہ حلال کیا ہے۔ یہ کلمہ اسی کے بارے میں کہنا چاہیے جسمیں نص صریح موجود ہے، اور ادلہ قرآن اور سنت کو ظواہر اور مجازات کہنا، کیونکہ اس طرح سے انکی عظمت قلوب سے نکل جاتی ہے خصوصاً متکلمین اور فلاسفہ کا یہ کہنا، انکی عقلیں ماری گئی ہیں، ان دونوں سے دین اور دنیا میں بہت فساد پھیلا ہے

ان ہی بری باتوں میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی اپنی عورت کے جماع کی بات کسی سے کہے جیسا کہ بازاری لوگ کیا کرتے ہیں۔ بادشاہ کو خلیفۃ اللہ، نائب اللہ کہنا، کیونکہ خلیفہ اور نائب تو غائب کا ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ غائب کا اسکے اہل میں خلیفہ ہوتا ہے اور مومن کا وکیل ہوتا ہے اور یاد رہے "انا، لی، عندی" ان الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے، ان الفاظ میں ابلیس، فرعون، قارون مبتلا ہوئے ہیں، انھوں نے ہی کہا تھا "انا خیر منہ" میں اس سے بہتر ہوں "ولی ملک مصر" اور میرا ملک مصر ہے فرعون نے کہا تھا، "انما اوتیتہ علی علم عندی" قارون نے کہا تھا، ان الفاظ کا بہترین استعمال یہ ہے کہ یوں کہے۔ "انا العبد" میں بندہ ہوں، ایسے ہی "اغفرلی جدی وھزلی و خطیئتی وعمدی وکل ذلک عندی" ان تینوں الفاظ کے استعمال کا یہ طریقہ بندوں کیلئے زیادہ مناسب ہے۔